*اسکن ہیلتھ الائنس لندن سے تصدیق شدہ

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

ناولٹ

افسانے

افسانے

دوشیزہ میگزین

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

پرل پبلی کیشنز کی جانب سے تمام اہلِ وطن کو

14 august

Happy Independence

یوم آزادی

کی مبارک باد

ایک ہجوم

جب حکمرانوں کی آنکھوں کا پانی مرجائے تب بھارت جیسے دشمن ملک کا دریاؤں میں چھوڑا پانی ملک کے طول عرض میں تباہی مچا دیتا ہے۔ ہر سال مون سون کے موسم میں بارشوں کے بعد صرف یہی خبریں سُننے کو مل رہی ہوتی ہیں کہ اونچے درجے کا سیلاب، پانی شہری آبادی میں داخل، ڈھور ڈنگر سمیت انسان بھی بہہ گئے، جو بچے وہ بجلی کے ننگے تاروں کا شکار ہوگئے۔ متاثرہ علاقوں میں فوج پہنچ گئی۔ پانی میں ڈوبے مکانات، بالٹیوں، دیگچیوں اور لوٹوں سے پانی گھروں سے باہر پھینکتے اَدھ ننگے لوگ، سر پر چادر جمائے، دھوپ کی تمازت سے جھلسے چہرے، گیلی لکڑیوں کو پھونکتے پھونکتے اَدھ مرے اعصاب......

اتنے عرصے سے یہ سب کچھ دہرایا جا رہا ہے...... میں کبھی کبھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہوں کہ جب حکمران عوام کے لیے کچھ کرتے ہی نہیں تو عوام بے چارے انہیں حکومت کے تختِ طاؤس پر کیوں بٹھاتے ہیں اور بار بار بٹھاتے ہیں...... کشمیریوں پر ظلم و جبر کرنے والے بھارت کا ہم عوام کیوں نہیں بائیکاٹ کرتے، اُن کی فلمیں، اُن کی مصنوعات کو کیوں نہیں دھتکارتے۔ جھوٹ، چور بازاری، مہنگائی جیسے گناہوں سے کیوں دور نہیں رہتے......

ایک دوسرے کا حق کیوں غصب کرتے ہیں، کیوں غیرت کے نام پر انسانی جان کو قتل کرتے ہیں، کیوں...... کیوں آخر کیوں؟

اس 'کیوں' کا جواب مجھے کبھی نہیں ملتا۔ میں اب تھکنے لگی ہوں، اس سوال کے جواب کی جستجو میں۔ کبھی تو کوئی مجھے بتائے ہم لوگ ایسے کیوں ہیں...... کہیں ایسا تو نہیں کہ حکمرانوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کا پانی بھی مرچکا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم بحیثیت قوم آنکھیں تو رکھتے ہیں مگر بینائی نہیں...... اور کیا ہم قوم ہیں بھی یا صرف ایک ہجوم......

منزہ سہام

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرایئے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت

رابطوں کی دلفریب محفل

مدیرا علیٰ

میرے عزیز پڑھنے اور لکھنے والوں مجھے یقین ہے کہ سب اپنے پیاروں کی ہمراہی میں بہت خوش اور مطمئن ہوں گے اور یہی میری دعا بھی ہے۔ محفل میں آپ کی بروقت شرکت سے بڑی گھما گھمی اور زندگی رہتی ہے جن رائٹرز کو پرچہ ملنے میں دشواری تھی۔ اُن کی شکایت کا سدباب کیا گیا ہے آپ لوگ بھی پرچہ موصول ہونے پر اطلاع ضرور دیا کریں...... ڈاک کے نظام کو تو رونے کا کوئی فائدہ نہیں مگر ادارہ اور آپ مل کر اس فرسودہ نظام کو شکست دے سکتے ہیں وہ اس طرح کہ آپ کی شکایتیں موصول ہونے پر میں آپ کو مطلع کرتی ہوں اور آپ لوگ بھی مجھے آگاہ کر دیا کریں۔ خاص طور سے اعزازیہ موصول ہونے کی اطلاع بروقت دے دیا کریں۔ اس طرح آپ اور میں دونوں کوفت سے بچ جائیں گے۔ اب کچھ بات ہو جائے بھیگے بھیگے موسم کی تو ہر طرف جل تھل ہے اس بار کراچی پر بھی اللہ کا کچھ کرم ہے پھوار پڑتی رہتی ہے موسم ایسا حسین ہو تو محبوب کا یاد آنا لازمی ہے یہ بات میں اُن لکھاریوں کے لیے کہہ رہی ہوں جو دوشیزہ کو اپنی پہلی محبت کہتے ہیں مگر کوئی موسم انہیں محبوب کی یاد نہیں دلاتا...... ارے جاگ جاؤ اور لوٹ آؤ جانے کی باتیں جانے دو...... اب راحیل شریف صاحب یہ نہ پڑھ لیں بھئی میں نے تو دل سے اپنے پیارے پیارے بچھڑے ہوئے رائٹرز کو پکارا ہے۔ اسی پکار کے ساتھ بڑھتے ہیں پہلے خط کی طرف مظفر گڑھ سے پہنچی ہے یہ شاندار سواری کراچی اور سوار ہیں وردانہ نوشین خان، لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ، زندگی میں وقت کمیاب ہوتا جا رہا ہے۔ متعدد کتب اور رسائل توجہ کے منتظر رکھے رہتے ہیں۔ مگر دوشیزہ سے جو بچپن کا ساتھ ہے وہ ساتھ ٹوٹ نہیں سکتا۔ جب دوشیزہ میں لکھنے کا آغاز کیا تھا تو تب میں ہر گز خود کو بچی نہ سمجھتی تھی مگر اب پلٹ کر دیکھوں تو 20/19 سال کی لڑکی بچی ہی ہوتی ہے۔ آج بھی یہ سوچ کر ہنسی آتی ہے کہ میری پہلی تحریر (افسانہ) کا عنوان 'یاد رفتہ' تھا۔ حالانکہ تب پتا ہی کیا تھا کہ رفتہ کیا ہوتا ہے؟ یاد کیا ہوتی ہے؟ دوشیزہ میں چھپے اپنے کئی ناولٹ اور افسانے میں نے ری رائٹ کر کے ادبی جرائد میں بھیجے، شائع ہوئے اور بے حد پسند کیے گئے۔ بلڈ کینسر میرا دوشیزہ میں چھپا افسانہ تھا جسے 2010ء کے سال کے بہترین ادبی افسانوں میں منتخب کر کے کتاب میں شامل کیا گیا۔ مینا تاج کے انتقال کی خبر اور مینا تاج کی زندگی سے بھرپور مسکراتی تصویر...... دیکھ کر سوچا منزہ سے ایک وعدہ لے لوں

......منزہ! میرے انتقال کی خبر کے ساتھ بھی میری اچھی سی چُن کر تصویر لگانا اور اچھا سا شعر بھی...... مینا تاج کا موجودہ افسانہ 'ایک کپ چائے' بہت خوب تھا۔ سیپ (رسالہ) میں بھی مینا تاج کا افسانہ لگا تھا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔ 'آنگن میں بارات' مومنہ بتول بہت ہری بھری لگتی ہیں ایسی شادیاں جن میں محبتوں کو ثروت سجادے، ہردن کی جداتزئین' گہما گہمی' شاندار ملبوسات انواع اقسام کے کھانے' کیک' آئس کریم فش ہرڈش...... مگر بہت پیاری مومنہ جی! یہ تو ڈائجسٹ ہیں ناں یہ ہماری لوئر مڈل عوام کی اکثریت پڑھتی ہے یہ اُن کے لیے گوشہ عافیت ہوتے ہیں۔ لڑکیاں اور مائیں پڑھتی ہیں۔ ماؤں کے بی پی ہائی اور بیٹیوں کے بی پی لو نہ کیا کریں۔ خواہش تو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتی۔ رفعت سراج 'دام دل' اچھا لکھ رہی ہیں۔ ناول کی اردو صاف اور بلاضرورت انگریزی سے مبرا ہے۔ کہانی بھی دلچسپی کا پہلو رکھتی ہے۔ نسیم آمنہ ہم عصر رائٹر ہیں۔ توبہ اُن کا طویل ناول ہے نور شیر ایک جیتا جاگتا معاشرتی کردار ہے۔ نیلماں جیسی طرح دار عورتیں جو ہر رشتے میں مرد کو چت کر دینا جانتی ہیں آس پاس مل جاتی ہیں، البتہ ناول کا انجام اگر یہ ہوتا کہ شاہ در اور گل پری نے سازش کر کے شاہ در نے نیلماں کو دام الفت میں گرفتار کر کے رنگے ہاتھوں پکڑوایا تو یہ مزید دلچسپ انجام ہوتا، بہرحال مجموعی طور پر اچھا ناول تھا۔ 'اندھی' فرح اسلم قریشی کا موضوع تازہ اور مختلف تھا۔ اندھا پن صرف بصارت کا ہی نہیں بصیرت کا بھی ہوتا ہے۔ کوثر ناز کا افسانہ 'مینجر' ہلکا پھلکا افسانہ ہے۔ اُم مریم کا طویل ترین ناول اختتام پذیر ہوا۔ ام مریم کو شادی اور ناول کی دلی مبارکباد ہو۔ اوراق پلٹتے پلٹتے ہم عصر رائٹر نگہت اعظمی کے افسانہ 'مالک' پر نگاہ رُکی۔ رمضان کے پکوان اور عید کے ساتھ بیرون ملک سے آنے والے کزن کی سادہ دل لڑکی کے ساتھ نسبت اور خاندان میں کھلبلی...... روایتی دلچسپی کا حامل افسانہ ہے ان دنوں پنجاب میں موسم گرما عروج پر ہے۔ جو کوئی شمالی علاقہ جات کی سیر کو جاتا ہے وہ واپس آ کر زیادہ روتا ہے۔ سچ ہے جنت دیکھ کر چھوڑنا مشکل تر ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ گرم اور طویل روزے رکھنے کی توفیق دی رمضان کو مجھ گنہگار پر آسان کیا۔ مدتوں سے ایک ناول بھی لکھتی کبھی چھوڑ دیتی ہوں...... دعا کریں وہ مکمل ہو، اور دیکھیے کہاں شائع ہو۔

☜: اچھی دردانہ! سچ کہا میں تو جب بچوں کو دیکھتی ہوں تب احساس ہوتا ہے کہ اب لڑکی نہیں رہی کافی بڑی ہوگئی ہوں وقت قیامت کی رفتار سے آگے نکل گیا۔ چلیں ایک طرح اچھا ہی ہے تھم جاتے تو سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں جو وعدہ مجھ سے لے رہی ہیں وہ میں دانیال' زین سے لے چکی ہوں اپنے لیے، یہ میں نے طے کر لیا تھا دوشیزہ میں دوشیزگی برقرار رہے گی آپ کی رائے یقیناً لکھنے والوں کے لیے بہت قیمتی اور اہم ہے اور یہ کیا کہ ناول کہاں چھپے گا بھئی جب ہم راہ میں آنکھیں فراش کیے بیٹھے ہیں تو ہمارے پاس ہی چھپے گا۔ جلدی جلدی محفل میں شریک ہوتی رہا کریں۔

✉: اور یہ ہیں ہرنی جیسی آنکھوں والی ہماری زمر، لاہور سے تشریف لائی ہیں اور لکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ادارے کے تمام وابستگین و اراکین کی خیریت و عافیت کی طلب گار ہوں۔ اللہ تعالیٰ عالمِ اسلام میں امن و امان قائم رکھے، آمین۔ منزہ جی! مجھے بے حد افسوس ہے کہ رمضان سے پہلے میرے لکھے گئے دو خط آپ تک نہیں پہنچے۔ وجہ و سبب بننے والوں کو اللہ ہدایت دے۔ رمضان میں مصروفیات کے باعث نہ لکھ سکی۔ اس پر دلی معذرت، جولائی کا شمارہ 14 تاریخ کو موصول ہو گیا تھا۔ آپ کی محبتوں کا شکریہ! گمشدہ خطوط میں بہت سی باتیں بہت سے اظہارِ خیال

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

جولائی 2016 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

'توبہ' نسیم آمنہ

'اندھی' فرح اسلم قریشی

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ | اگست 2016

عنوان: ____________________

قلم کار: ____________________

نام: ____________________

پتا: ____________________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

تھے جو ساتھی لکھاریوں اور قارئین دوشیزہ سے بانٹتے تھے۔ اُن کے دکھوں پر میں بھی ملول ہوئی تھی۔ بچھڑنے والوں کا رنج مجھے بھی ہے۔ ہائے افسوس بروقت اظہار نہیں پہنچ پایا۔ ہم سبھی میں دوشیزہ کے توسط سے جو مان کا رشتہ ہے وہ کبھی ملال بھی تو دیتا ہے کہ اگر ہم بروقت اپنے دکھ پر کسی کو شریک نہ پائیں یا اپنی خوشیوں پر کسی کی مسکراہٹیں محسوس نہ کریں۔ میں امید کرتی ہوں میرے سبھی ساتھی لکھاری' میرے قارئین ساتھی میرے عدم اظہار پر کوئی گمان یا ملال نہیں رکھیں گے۔ بے شک میں موقع پر اظہار نہ کرپاتی مگر اللہ گواہ ہے سبھی کے دکھوں پر دل رنجیدہ اور آنکھ نم ضرور ہوئی ہے۔ بہت پیاری لکھاری فنکار مینا تاج کے لیے تو دل میں اب تک بے یقینی ہے۔ مجھے پہلے رضوانہ کوثر (آپی) نے یہ خبر بذریعہ ایس ایم ایس دی تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔ رمضان میں امجد صابری صاحب کی شہادت نے دنوں تک دل وذہن کو افسردہ رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے تو انہیں اعلیٰ رتبے اور مقام سے نواز ہی دیا۔ کاش قتل وخون گری کا بازار گرم کرنے والے سمجھ سکیں۔ اُن کی دمنی مقتول سے نہیں خود سے بڑھتی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ امجد صابری کے بچوں اور گھر والوں کو صبر واستقلال سے نوازے آمین۔ منزہ جی باتیں تو بہت سی ہے۔ میری فنکار بہنیں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ خصوصاً عقیلہ حق اور خولہ عرفان کے خطوط بھرپور تبصرے کے ساتھ محظوظ کرتے ہیں۔ اللہ انہیں بدنظر سے بچائے، آمین۔ صفیہ سلطانہ کہاں گم ہیں۔ اُن کے خطوط کا تو انتظار رہا کرتا تھا۔ یقیناً پوتے کی آمد کی خوشیاں منارہی ہیں۔ پوتے کی آمد مبارک ہو صفیہ سلطانہ مغل ہتسیم نیازی کو بھی جگارہی ہوں۔ جھنجوڑ رہی ہوں مگر وہ بھی اپنی مصروفیات کی بغل میں لپٹی ہوئی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کان لپیٹے ہوئے ہے۔ ذرا آپ بھی کوشش کیجیے نا...... ذرا سامان...... تھوڑی سی ستائش بڑا حوصلہ بڑھاتی ہے، ہم لکھنے والوں کا، رضوانہ آپی تو اپنی ناسازی طبع کے زیراثر اب مستقل تبصرے نہیں لکھ پاتیں۔ ورنہ کچھ عرصہ پہلے تک ہر شمارہ اُن کی آراء معتبر سے مزین ہم لکھنے والوں کی دلی تسکین بن جاتا تھا۔ بہرحال میں سبھی لکھنے والوں سے کہوں گی کہ لوٹ آئیں بھی کہ ہماری پہچان دوشیزہ سے ہے۔ پچھلے شمارے میں غزالہ رشید کو نیلوفر عباسی کے اعزاز میں دی گئی تقریب کی تصویری احوال میں دیکھا تو یقین کریں بے حد خوشی ہوئی۔ کاش کہ وہ دوشیزہ کے لیے لکھیں بھی، غزالہ جی آپ سے مدت ہوئی کوئی رابطہ ہی نہیں ہوا۔ آپ کی محبت یاد آتی ہے۔ منزہ جی! شمارے پر مکمل تبصرہ نہیں کرپاؤں گی۔ جتنا پڑھا ہے اُسے ہی کافی سمجھیے گا۔ اداریہ، ہمیشہ کی طرح احساس کو چھو کر اثر چھوڑ گیا۔ کاش یہ اثر یا اثر افرادِ مملکت کے ذہن ودل پر بھی ثبت ہوسکتا۔ محفل ہمیشہ کی طرح لاجواب تھی کچھ ساتھیوں کی کمی تھی۔ نئے ساتھی لکھنے والوں کو خوش آمدید اور پڑھنے والوں کو بھی...... سکینہ فرخ کو ایوارڈ مبارک ہو۔ مایا علی اور زاہد خان سے باتیں اچھی لگیں۔ اسماء اعوان لائف بوائے کے حوالے سے اچھی تحریریں دے رہی ہیں۔ ناولوں کے بارے میں میری رائے شروع سے مثبت رہی ہے۔ رفعت سراج کا اندازِ تحریر ہمیشہ سے لاجواب رہا ہے اور بے مثال تو ام مریم نے بھی لکھا۔ گو ناول کی طوالت نے کبھی کہیں اکتاہٹ پر اکسایا بھی لیکن موضوع اتنا دلکش اور پیارا تھا کہ چھوڑ دینے پر دل راضی بھی نہ ہوا۔ ام مریم آپ کو بہت مبارک ہو۔ دعا ہے آپ آئندہ زندگی کی تمام راحتوں اور خوشیوں سے لطف اندوز ہوں۔ اللہ آپ کو تمام مصائب وپریشانیوں سے محفوظ رکھے آمین۔ مکمل ناول ابھی پڑھ نہیں پائی۔ تبصرہ محفوظ ہے۔ اس ماہ افسانوں میں بہترین مینا تاج اور سائرہ غلام نبی کے افسانے رہے۔ زندگی سے جڑی حقیقتوں کو سچائی سے اُجاگر کرتا اندازِ بیاں متاثر کن تھا۔ فرح اسلم کی تعریف نہ کرنا بخل ہوگا۔ فرح کا قلم تو دن افزوں روشن

سانحۂ ارتحال

ہماری دیرینہ ساتھی رضوانہ پرنس کے چھوٹے بھائی سلیم رضوی قضائے الٰہی سے گزشتہ ماہ وفات پا گئے۔ قارئین سے مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے دعا کی درخواست ہے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور اہل خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

متاباں حروف اگلنے میں مہارت پکڑتا جا رہا ہے۔ رمضان کے حوالے سے بھی دانیہ آفرین، ہما راؤ اور کوثر ناز نے اچھی اور بہتر تحریریں دیں۔ (آئیڈیل ماہنامہ) کے بعد اب سعید سیٹھی کو دوشیزہ میں پڑھا، اچھا لگا۔ نگہت اعظمٰی کی تحریر تو ہوتی ہی مستند ہے۔ تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح اچھے ہیں۔ بس شعروسخن کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ میں نے بھی کافی زیادہ منظومات پچھلے برس بھجوائی تھیں۔ لیکن ایک بھی نہیں لگی۔ کیوں، انشاء اللہ ناول کی اقساط کے ساتھ کچھ نظمیں غزلیں بھجواؤں گی۔ امید ہے شاملِ اشاعت رہیں گی۔ منزہ جی خط کی طوالت کے باعث بہت سی باتیں رہ گئی ہیں۔ انشاء اللہ بشرطِ زندگی باتیں ہوتی رہیں گی۔ محبتیں اور رابطے قائم رہیں گے۔ آنٹی رخسانہ کو میرا اسلام دیجیے گا۔ کاشی بھائی کیسے ہیں انہیں اور تمام اسٹاف کو میرا اسلام دیجیے گا۔ انکل سہام کی یادیں دل سے جڑی ہیں۔ دوشیزہ سے تعلق اور وابستگی انہی کی بدولت قائم و دائم ہے۔ اُن کی محبت اب بھی ہاتھ پکڑ کر لکھنے کو مہمیز کرتی ہے۔ اُن کے جلائے دیے مزید فروزاں رہیں۔ یہی میری دعا ہے۔ اللہ انہیں ہمیشہ اپنے حصارِ رحمت میں رکھے آمین۔

✉: عزیز از جان زمر! ڈاک کے نظام کو تو بس اب اللہ ہی پوچھا گا شائد اس بات کا تذکرہ میں نے پہلے کیا تھا کہ سنبل کا 2013ء کا لکھا ہوا خط مجھے 2015ء میں ملا اور شکایت کرنے پر جواب ملا کہ آپ ذمہ داری تو دیکھیں دیر ضرور ہوئی مگر خط کھونے نہیں دیا۔ ایسی باتیں مجھے اکثر لاجواب کر دیتی ہیں۔ آپ کی پرزور فرمائش پر دیکھیے غزالہ کو پکڑ کر لے ہی آئی۔ زمر میرا ماننا ہے کہ دوشیزہ میں لکھنے والے سب ایک خاندان کی مانند ہیں مصروفیات کی وجہ سے دور تو ہو سکتے ہیں مگر محبتوں پر یقین نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ کے توسط سے میں ان سب کو آواز دے رہی ہوں جنھوں نے نہ سننے کا عہد کیا ہوا ہے آپ کی محبتوں کا بہت شکریہ دانیال، زین اچھے ہیں امی تک آپ کا سلام پہنچا دیا ہے۔ خوش رہیے۔

✉: کراچی سے شاہی سواری آئی ہے فرح اسلم قریشی کی، لکھتی ہیں۔ اس ماہ کا اُداس کر دینے والا رسالہ میرے سامنے ہے۔ میں بار بار اوراق پلٹ کر ایک صفحے پر جا کر رک جاتی ہوں اور بہت دیر تلک مینا کے زندگی سے بھرپور چہرے اور بولتی آنکھوں کو دیکھتی رہتی ہوں اور خود کو یقین دلاتی ہوں کہ مینا اب ہم میں نہیں رہی۔ دوشیزہ کی پچھلی تقریب میں مینا تاج سفید لباس میں ملبوس اپنی پُرتجسس آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ اتنی کم عمری میں کوئی زندگی سے منہ کیسے موڑ سکتا ہے؟ لیکن حقیقت کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو اُسے ماننا ہی پڑتا ہے گو کہ مینا تاج کے لیے جنت الفردوس کی دعا لکھتے قلم کانپتا ہے پھر بھی جب جب ہاتھ اٹھتے ہیں لب پر یہی دعا ہوتی ہے کہ پروردگار مینا تاج کو اپنے پسندیدہ بندوں میں شمار کرتے ہوئے اس کے درجات بلند کرنا اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمانا اور ساتھ لواحقین کو بھی صبر جمیل عطا فرمانا، آمین۔ کاشی چوہان کے پھوپا اور خالو بھی گزشتہ ماہ خالق حقیقی سے جا ملے اُن کے لیے بھی یہی دعا ہے کہ خالق کائنات اپنی رحمتوں کے طفیل اُن کی مغفرت فرمائے اور اہل خانہ کو یہ دکھ جھیلنے کی سکت و ہمت عطا

فرمائے آمین۔ اقبال زمان کے بہنوئی کو بھی رب تعالیٰ جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین رسالے میں ایک ساتھ اتنے سارے لوگوں کی جدائی پر تعزیت کا اظہار دل کو سخت ملول کر گیا ہے اوپر سے وطن کی خبریں بھی اُداس کر دینے والی ہیں پہلے فاطمہ ثریا بجیا، پھر امجد صابری، آغا ناصر، بابائے خدمت عبدالستار ایدھی اور اب آخری خبر جو ملی وہ بھی قندیل بلوچ' (ہوسکتا ہے بعض لوگوں کو اعتراض ہو کہ میں نے قابل قدر شخصیات کے ساتھ قندیل بلوچ کا نام بھی لکھا ہے) ہاں...... مجھے قندیل بلوچ کی موت کا بہت دکھ ہے اس لیے کہ کسی کو بھی اُس کی جان لینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے اگر اُسے مزید جینے دیا جاتا تو وہ بھی تائب ہو کر اپنے آپ کو اُن لوگوں میں شمار کروالیتی جن پر اللہ نے انعام کا وعدہ فرمایا ہے ہونے کو تو بہت کچھ ہوسکتا تھا مگر بات جب دوسروں کے کردار کی آتی ہے تو سب خدا بن جاتے ہیں۔ دنیا میں جہنم تیار کر دیتے ہیں اور جیتی جاگتی زندگیوں کو خاک کر کے فخر سے سر بلند کر کے کہتے ہیں 'یہ قتل غیرت کے نام پر تھا اس لیے ہمیں کوئی شرمندگی نہیں۔'

بہر حال...... دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے تو اور بھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر میں جانتی ہوں کہ میرے ساتھ تمام اہل دوشیزہ بھی یہی جذبات رکھتے ہوں گے سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت اُن کو ہے جو جذبات سے عاری، بے حس اور سنگدل ہوں۔ رسالے میں اس بار تمام تحریریں متاثر کن تھیں نسیم آمنہ کا ناول تو بہترین تحریر تھی۔ شمیمہ معین نے 'چاند کے پار' اچھا لکھا۔ منعم اصگر نے 'جگنو میری پلکوں پر' میں کہانی سے زیادہ اندازِ بیاں پر زور دیا اور خوبصورت استعاروں اور حتی المقدور مشکل الفاظ سے ناولٹ کو متاثر کن بنانے کی کوشش کی۔ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اُن کے اندر ایک خوبصورت خیالات رکھنے والی مصنفہ چھپی ہے۔ افسانوں میں ایک کپ چائے مینا تاج کے پیارے سے افسانے نے متاثر کرنے کے باوجود دل کو افسردہ ہی رکھا کہ دل و دماغ پر اُن کے نہ ہونے کا خیال حاوی رہا۔ نگہت اعظمی نے 'ماسک' میں ہلکے پھلکے انداز میں گہرے طنز کر ڈالے بڑی پیاری تحریر تھی۔ 'یہ کہانی تو نہیں' سائرہ غلام نبی کے مشاہدے کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک سائرہ کو میں جانتی ہوں وہ آنکھوں سے دل میں اُتر جاتی ہیں اور جہاں تک سماج کو ہلا دینے والی بات ہے وہ تو شاید اب ممکن نہیں رہا، ہمارا معاشرہ بے حسی کی انتہا پر ہے۔ بڑی سے بڑی اور بری سے بری خبر بھی اسے نہیں ہلا پاتی، البتہ آپ کے افسانے نے ہماری سوچوں کو ضرور ہلا دیا کہ ایسے اچھوتا خیال صرف آپ کے قلم سے ہی نکل سکتا ہے۔ سعدیہ سیٹھی کا 'اہتمام رمضان' عالیہ حرا کا 'فیصلہ' کوثر ناز کے 'میسیجز' 'غزالہ جلیل کے 'مڑ کے جو دیکھا' نے بہت زیادہ تو نہیں لیکن متاثر ضرور کیا۔ اس کے علاوہ 'محبت رنگ عید کا' دانیہ آفرین نے عید کے حوالے سے اچھی تحریر لکھی۔ 'وفا حسن محبت کا' ہما راؤ کی اچھی کوشش تھی۔ غرض اس بار تمام تحریریں قابل توجہ اور دلچسپ رہیں اور پچھلے ماہ پڑھی جانے والی تحریر 'وہی دل' جسے ثمینہ فیاض نے لکھا تھا وہ بھی میں نے پڑھ لی ہے اور ثمینہ فیاض کو شاباش کہ اتنی اچھی تحریر پڑھنے کو دی یقیناً آئندہ وہ مزید خوبصورت تحریریں لکھیں گی۔ ام مریم کو ناول مکمل ہو جانے پر مبارکباد اس میں کوئی شک نہیں کہ ام مریم نے بڑی محنت اور نیک نیتی کے ساتھ ناول کو اختتام تک پہنچایا۔ 'دام دل' پر تبصرہ کرنے کی میری مجال کیا؟ سچ تو یہ ہے کہ دام دل ہم دل کی آنکھوں سے پڑھتے ہیں۔ مومنہ بتول کو بیٹی کی شادی مبارک ہو۔ فریدہ جاوید کی شاعری بھول گئی بہت اچھی تھی۔ راحت وفا کی نظم مختصر مگر بہترین، شابہ نسیم کی بے خبر بھی بہتر کوشش تھی۔ زندگی کی ناؤ خولہ عرفان نے حسب سابق خوب لکھی بڑی پیاری

نظم تھی۔ اس کے علاوہ فرح علی، عماد حسین اور تمثیلہ لطیف و میہر عامر کی نظمیں بھی اچھی لگیں۔ خط طویل تر ہو گیا ہے مگر خوش ہے کہ وقت پر پڑھا اور تبصرہ لکھ لیا۔ اب اجازت۔

ڈیئر فرح! تمہارا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی آتی رہا کرو۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ کسی انسان کی جان لینے کا کسی کو حق نہیں سفا کانہ رویوں کو اب ختم ہونا چاہیے، انسان کو انسانی رویے اپنانے چاہئیں یہی بہتر بھی ہے اور فائدہ مند بھی، جن لوگوں کی تحریر کو آپ نے پسند کیا یقیناً وہ بہت خوش ہوں گے۔ فرح اسی طرح اپنی مصروفیت میں سے میرے لیے ضرور وقت نکالا کریں۔

✉ یہ آمد ہے تحسین انجم کی، لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ! السلام علیکم! امید ہے آپ بخیریت اور صحت مند ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ سے پہلی بار مخاطب ہوں۔ میرے افسانے گاہے بگاہے دوشیزہ میں چھپتے رہتے ہیں۔ میرا نام تحسین انجم انصاری ہے۔ شاید کبھی آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ محفل میں چندایک دفعہ شرکت کی ہے اور آج ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ اس خوبصورت انجمن میں داخل ہو رہی ہوں امید ہے کہ رائٹرز نے مجھے فراموش نہیں کیا ہوگا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں دوشیزہ ایک منفرد ماہنامہ ہے اور اس میں شائع ہونا کسی اعزاز سے کم نہیں...... چند ایک افسانے ارسال کر رہی ہوں۔ جگہ دینا نہ دینا تو آپ کے ادبی ذوق اور میری تحریر کے معیار پر منحصر ہے۔ محفل محفل بہاراں اور پھولوں کی انجمن سے کسی طرح کم نہیں ہے گلہائے رنگ رنگ سے بھری پھولوں کی اس خوبصورت انجمن میں کس کا نام لوں اور کس سے کچھ کہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تو سوچا بس سب کے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ بس یہی کہہ دوں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ' آپ کی کاوشوں کی تعریف نہ کرنا ناانصافی کے زمرے میں آئے گا۔ آپ نے مرزا صاحب کے بعد جس حوصلے اور جاں فشانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ قابل تحسین ہے اور اچھا ہی کیا کہ مصروف رہنا سب سے بڑا مرہم ہے۔ آپ کی محنتوں کا ذکر نہ کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ آپ کی ڈائری پڑھ کے کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ اور کبھی آنکھوں میں آنسو آتے رہتے ہیں۔ عجب دھوپ چھاؤں کا منظر ہے نا؟ دل بہت چاہتا ہے کہ دوشیزہ کے لیے ناول لکھوں۔ لیکن میری اطلاع کے مطابق بہت سے ناول لائن میں لگے ہیں۔ کئی سال تک باری نہیں آسکتی تو صبر کرلیا۔ ریشم ڈائجسٹ میں میرا ناول 'ستم گر تیرے لیے' (2013-14) کو سلسلہ وار شائع ہو چکا ہے۔ اور آج کل فرمائش پر لکھا گیا ناول 'ریشم' جاری ہے۔ اس ماہ اُس کی چھٹی قسط آئے گی۔ میرا خیال ہے بہت بور کیا آپ کو، بہت قیمتی وقت لے لیا۔ ایک بار پھر آپ کی کوششوں کو سراہوں گی۔ اور دعا کروں گی آپ اسی طرح کامیابی سے اپنا کام سرانجام دیتی رہیں اور آپ کے چاہنے والوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ اب اجازت چاہوں گی۔ نیک تمناؤں کے ساتھ خدا حافظ۔

: بہت ہی سوئٹ تحسین! مجھے آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی محفل میں آتی رہا کریں۔ میری محبت کو سراہنے کا بہت شکریہ میری تو خواہش ہے کہ آپ کی طویل تحریر دوشیزہ کا حصہ بنے تو چلیں جناب زبردست سا ناولٹ لکھنے کی تیاری شروع کردیں میں انتظار کروں گی۔

✉: کراچی سے ہی تشریف لائی ہیں شگفتہ شفیق صاحبہ، لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ اسلام علیکم! جولائی کا دوشیزہ بہت اچھا لگا۔ مینا تاج کے اچانک چلے جانے سے دل بہت دن تک بے قرار رہا۔ تم نے مینا تاج کی مسکراتی تصویر دوشیزہ میں دے کر مینا سے ملاقات کی خوشگوار یاد تازہ کرا دی۔ اللہ پاک اُسکی مغفرت

مبارک باد

ہماری ہردلعزیز ساتھی شگفتہ شفیق کی بیٹی کنزل تابش نے لندن میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کرلیا ہے۔ ادارہ اس کامیابی پر شگفتہ شفیق اور اُن کی فیملی کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور کنزل کی کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

فرمائیے۔ اُس کی خوبصورت، مسکراتی تصویر ہمیشہ ذہن میں رہے گی۔ فرح اسلم قریشی آپ کا خط اور دعائیں بہت اچھی لگیں۔ لاہور سے فریدہ فری صاحبہ میری شاعری کی پسندیدگی پر شکریہ قبول کریں۔ محفل ساری کی ساری پیاری تھی۔ انتہائی کڑوی حقیقتوں سے سجا مینا تاج کا افسانہ 'ایک کپ چائے' بہترین رہا۔ اس کے بعد مجھے سائرہ غلام نبی کا افسانہ 'یہ کہانی تو نہیں' اچھا لگا۔ فرح اسلم قریشی نے بھی بہترین افسانہ لکھا۔ غزالہ جلیل راؤ نے 'موڑ کے جو دیکھا' میں آج کل کی کہانی لکھی ہے۔ اُم مریم ناول اور اپنی ہونے والی شادی کی مبارکباد قبول کریں۔ نگہت اعظمی کا سچا افسانہ 'ماسک' اچھا لگا۔ اور باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ ان کے علاوہ تمام سلسلے خوب رہے اور ہم اداریہ کی مکمل تائید کرتے ہیں، بہت خوش رہیں۔ سب احباب کو میرا پُر خلوص سلام۔

✉: پیاری سی شگفتہ! ہمیشہ بولتی، ہنستی، مسکراتی رہیں مینا کے جانے کا تو ہم سب کو بے پناہ دکھ ہے مگر حقیقت بھی یہی ہے۔ افسانے اچھے لگے یقیناً لکھنے والوں کو بھی پڑھ کر اچھا لگے گا محفل میں شرکت کرتی رہا کریں۔

✉: محمد بلال فیاض صاحب تشریف لائے ہیں ملتان سے، لکھتے ہیں۔ ڈیئر منزہ آپی! السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ آج بہت عرصے کے بعد آپ سے ہم کلام ہوا ہوں۔ امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گی۔ بہت عرصے بعد قلم اٹھایا اور ایک افسانہ وجود میں آیا۔ حاضر خدمت ہے۔ امید ہے آپ ہمیں بھولی نہیں ہوں گی۔ بہت عرصہ قلم سے ناتا ٹوٹا رہا۔ بہت عرصے بعد حاضر ہوا ہوں تو بہت سی باتیں کہنے، سننے کو جی چاہ رہا ہے۔ زندگی کے جھمیلے، مسائل، تعلیمی مصروفیات، آہ...... اور بہت کچھ...... خیر...... اس عرصے میں لکھا کچھ نہیں۔ مگر مطالعے سے ناتا نہیں توڑا۔ افسانے کے بارے میں جلد رائے سے نوازیے گا، انتظار رہے گا۔ اتنے عرصے بعد خط لکھنے کا سوچا تو دوشیزہ پر تبصرہ کرنے کا پورا ارادہ تھا مگر جب 17 جولائی تک بھی جولائی کا شمارہ نہیں آیا۔ اور بک اسٹال کے چکر لگا لگا کر تھک گیا تو...... مایوس ہو کر خط لکھ ڈالا...... ہاں البتہ سچی کہانیاں آ گیا...... اور پڑھ بھی لیا۔ آپ کے لیے اور پورے اسٹاف کے لیے ڈھیروں ڈھیر دعائیں۔ اب پوری کوشش کروں گا کہ ناتا نہ ٹوٹے۔

✉: بلال بھائی! خوش آمدید لکھنے والے تو سب ایک فیملی کی طرح ہوتے ہیں زندگی کی مصروفیات میں کچھ وقت کے لیے دور ہو جاتے ہیں۔ مگر پھر ایک ساتھ ہوتے ہیں جیسے زندہ رہنے کے لیے آکسیجن ضروری ہے اسی طرح رائٹر لکھنے سے باز نہیں آ سکتا۔ مجھے امید ہے کہ آپ باقاعدگی سے دوشیزہ کے لیے لکھتے رہیں گے اور شمارے پر اپنی رائے بھی ضرور دیں گے میں جلد آپ کا افسانہ پڑھ کر بتا دوں گی۔

✉: ملتان سے یہ آمد ہے فصیحہ آصف خان کی، لکھتی ہیں۔ رمضان المبارک کے بعد عید کی مصروفیات ختم ہوتے ہی دوشیزہ ملا، سو جھٹ پٹ پڑھنے پر کمر کس لی، جی جولائی کا گرما گرم دوشیزہ دیکھا۔ گرما گرم اس لیے کہ ملتان بلکہ پورا جنوبی پنجاب شدید گرمی اور حبس کے حصار میں مقید ہے۔ سو ایسے میں دوشیزہ کا ملنا کسی

مست پروا کے جھونکے سے کم نہ لگا۔ جانے کیوں میرا دو ماہ سے کوئی خط نہیں لگ رہا۔ جس کا شدید قلق رہا۔ دعا ہے کہ خط آپ تک بروقت پہنچ جائے تاکہ شامل ہوسکے۔ دوشیزہ کے سرورق پر دوشیزہ کی تصویر دیں۔ اشتہارات کو تو ہر صفحہ مل ہی جاتا ہے۔ آپ کا اداریہ صرف صرف سچا لگا۔ مگر حکومتی کانوں پر جوں رینگتی دکھائی نہیں دیتی۔ بہنوں کی آمد دوشیزہ کی محفل میں چار چاند لگاتی ہے جیسے غزالہ رشید، سعدیہ سیٹھی، سبھی بہنوں نے اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔ خولہ عرفان کی گلابی آنکھیں دیکھنے کو جی کر رہا ہے۔ روحیلہ خان اچھا لکھتی ہیں فریدہ فری اللہ آپ سمیت ہم سب کو گرمی کے پاگل پن سے بچائے آمین۔ گو میں مینا تاج سے زیادہ واقف نہیں مگر ان کی وفات پر صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ مایا علی پسند ہیں انہیں ٹائٹل پر بھی لائیں زاہد احمد گزارے لائق ہیں۔ 'آنگن میں بارات' مومنہ بتول کی لاڈلی بیٹی کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال بہت لگا اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ دام دل قسط نمبر 18 اپنی دلفریبی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے رفعت جی کی کیا بات ہے وہ تو بات سے بات نکالنے اور تشبیہات دینے میں کسی طرح بھی کسی سے کم نہیں۔ بانو آپا کو تو بہت جلد کیے کی سزا مل رہی ہے اور یہ ثمر کو بھی ملنی چاہیے پتہ نہیں چمن اُس کی دوسری شادی کو قبول کرتی بھی کہ نہیں؟ ایک کپ چائے، مینا تاج کا شاہکار افسانہ لگا۔ محبت رنگ عید کا اچھا لگا نسیم آمنہ کا توبہ اُف توبہ کیسی چلتر عورت تھی۔ نہ ان پڑھ کو چھوڑا نہ پڑھے لکھے کو سب کو لٹو وا بنا گئی۔ مرد رے مرد تیری کونسی کل سیدھی، ہمارا و، غزالہ راؤ' عالیہ حرا' سائرہ بی، اور نگہت اعظمی کے افسانے زبردست لگے۔ با مقصد اور معنونیت سے بھرپور، باقی تمام سلسلے بھی دوشیزہ میں نگینے کی طرح جڑے لگے۔ مجموعی طور پر جولائی کا عید نمبر کہانیوں کے موضوعات کے اعتبار سے بہت پسند آیا شاعری میں فریدہ جاوید فری کی غزل جی کو بھائی' خولہ عرفان اور فرح علی کی نثری نظمیں دل کو چھو گئیں۔ عید نمبر میں مہندی کے ڈیزائن کی کمی محسوس ہوئی۔ منزہ جی میرا افسانہ 'شکاری' لگا دیجیے اور دوسرا بقر عید نمبر میں دونوں کا انتظار ہے۔ پیشگی شکریہ۔

پیاری فصیحہ! ملتان کے حلوے جیسی میٹھی لگتی ہو شمارہ پسند کرنے کا شکریہ خطوط ڈاک خانے والوں کو اتنے اچھے لگتے ہیں کہ وہ اکثر ہڑپ کر جاتے ہیں مگر شاباش ہے تم لوگوں کی مستقل مزاجی پر ایک دن اُن کا نکما پن ضرور گھٹنے ٹیکے گا۔ جلد افسانے شائع ہوں گے یقین رکھو اور اسی طرح جاندار تبصرے کے ساتھ آتی رہا کرو۔

✉: کراچی سے فرح انیس تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں۔ امید ہے سب خیریت سے ہوں گے دوشیزہ کا شمارہ 18 تاریخ کو موصول ہوا میں مینا تاج کے بارے میں کیا لکھوں میری استاد میری محسن بہت اچھی دوست اُن کے یہ الفاظ کہ فرح میں تم کو بہت آگے دیکھنا چاہتی ہوں بس تم خوش رہا کرو مجھے رُلا دیتے ہیں۔ آپریشن سے دو دن پہلے میری اُن سے بات ہوئی تھی یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ میری اُن سے آخری بات ہوگی یقین نہیں آتا کہ وہ چلی گئیں۔ اللہ اُن کے درجات بلند فرمائے آمین ثم آمین۔ مینا تاج کا افسانہ 'ایک کپ چائے' بہت زبردست تھا ایک کپ چائے کی قیمت کس قدر بھاری پڑے گی رضیہ سلطانہ کے لیے۔ سعدیہ کا اہتمام رمضان بھی اچھا تھا۔ واقعی کھانے پینے سے زیادہ اگر ہم لوگ رمضان جیسے عظمت بھرے مہینے میں نیکیاں کریں، عبادت کریں تو کتنا اچھا ہو۔ کوثر ناز کا افسانہ 'میسج' بہت اچھے موضوع پر قلم اٹھایا لوگوں کے اعتقاد کو نجانے کیا ہو گیا ہے۔ ام مریم کو ناول کے اتنے شاندار اختتام پر مبارک باد دیتی ہوں باقی رسالہ ابھی

مبارک باد

سچی کہانیاں کے سابق ایڈیٹر ناصر رضا ماہِ رمضان میں ماشاء اللہ ایک پیارے سے نواسے کے نانا جان بن گئے ہیں۔ ادارہ ان کو دائمی خوشیوں کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ نومولود کی صحت اور درازی عمر کے لیے بھی دعا گو ہے۔

زیر مطالعہ ہے۔ میری بقر عید کی مزید ار تحریر' میں تیرا ہیرو' ضرور لگائے گا پرچے میں اور باقی تحریروں کا بھی اپنی شدت سے انتظار ہے۔ اگست میں پیپرز ہیں آپ سب سے التماس ہے کہ دعا کریں اللہ دنیا و آخرت کی کامیابی دے آمین۔ ایک نظم بھیج رہی ہوں اپنی، زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

ﮪ: اچھی سی فرح! مینا کا یوں اچانک چلے جانے واقعی کسی سانحے سے کم نہیں اللہ اس کے درجات بلند کرے۔ تمہارا افسانہ میرے پاس موجود ہے۔ انشاء اللہ عید الاضحیٰ کے موقع پر ضرور شائع کروں گی باقی تمہاری پسندیدگی لکھاریوں تک پہنچادی ہے۔

⋈: یہ مہکتا تھرکتا مکتوب ہے خولہ جی کا کراچی سے، لکھتی ہیں۔ ہر ماہ کی طرح دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ حاضرِ محفل ہوں۔ اس ماہ کا دوشیزہ ذرا تاخیر سے ملا اس لیے تاخیر ہو جانے کی معافی، دعا ہے کہ بس بروقت آپ کو میرا تبصرہ موصول ہو جائے، آمین۔ آپ کا اندازِ تخاطب اتنا دلنشین ہوتا ہے منزہ کہ ساری تھکن کا فور اور طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے۔ آپ کی پُر خلوص دعا شامل حال ہے اور میں بفضل تعالیٰ بخیر و عافیت ہوں۔ البتہ میری آنکھوں میں بجلیاں گرانے کی طاقت کہاں منزہ اگر ہوتی تو اپنی آنکھوں سے لوڈ شیڈنگ دور کر کے اہلِ وطن کے کام آجاتی کم از کم رمضان کا مہینہ تو اہلیانِ وطن کا سکون سے گزرتا...... ہاہاہا...... مذاق برطرف آپ کا خلوص و محبت سر آنکھوں پر تبصرہ حاضرِ خدمت ہے۔ اداریے میں منزہ آپ نے مولا بخش صاحب کی لفظوں کے بھالوں سے خوب سکائی کی ہے۔ لیکن امید قوی ہے کہ دیگر وزراء کی طرح ان کے بھی سر کے اوپر، کوسوں فاصلے سے گزری ہوگی مگر آپ کی طرح پُر امید اور دعا گو ہوں کہ اچھے لوگوں کی تقلید میں ہمارے قدموں کو سرگرم سفر رکھے آمین۔ مینا تاج کے عظیم نقصان پر دل جتنا دکھی ہے بیان مشکل ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے، آمین۔ اُن کا افسانہ ایک کپ چائے بلاک و شبہ بہترین افسانہ ہے۔ پڑھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ دوشیزہ ایک عمدہ مصنفہ سے محروم ہو گیا ہے۔ اس ناقابل تلافی نقصان پر اللہ اُن کے اہلِ خانہ اور دوشیزہ کو صبر اور ہمت عطا فرمائے، آمین۔ سائرہ غلام نبی کسی تعارف کی محتاج نہیں بہت عمدہ تحریر کرتی ہے۔ اندازِ بیاں موضوع کی اہمیت اور نزاکت کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ دانیہ آفرین کا محبت رنگ...... میں کہانی میں تھوڑا جھول نظر آیا۔ جیسے فضل کی کباب کا اسٹال لگانے کی بجائے مستقل کوئی چھوٹی موٹی دکان ہوتی تو زوار کی ڈگریوں کا خالہ بنتا لیکن ڈھاڑی پر کام کرنے والے کا بیٹا وہ بھی ڈگریوں کے ساتھ مارا مارا پھرے کہانی کا مزہ خراب کر رہا ہے۔ کردار کا ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہونا کہانی کی خوبصورتی بڑھاتا ہے۔ نسیم آمنہ کا مکمل ناول تو بہ کہانی اگرچہ وہی پرانی دیہاتی ریت روایتوں پر مبنی تھی۔ لیکن کردار، ماحول اور جملوں کے درمیان خوبصورت ربط سے مجبور کر دیا کہ پڑھا جائے۔ اچھی تحریر تھی۔ فرح اسلم قریشی کا افسانہ اندھی امید ہے کافی لوگوں کی عقلوں پر سے پردہ ہٹانے میں معاون ثابت ہوگا خاص

طور پر دورِ حاضر کی نسل جو پُر اعتماد ہونے کی آڑ میں بیوقوف بنتے بھی ہیں اور بناتے بھی ہیں۔ فرح نے عام فہم انداز رکھتے ہوئے افسانوی روایات کو برقرار رکھا ہے اور کرداروں کے جذباتی اور نفسیاتی پہلوؤں کی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ بہت عمدہ فرح، منعم اصغر کا جگنو میری...... بھی خوبصورت ناولٹ تھا۔ کوثر ناز کا میسجز اور عالیہ حرا کا افسانہ فیصلہ طرزِ تحریر کے لحاظ سے اچھا تھا لیکن موضوع کی مناسبت سے کہانی اتنی جاندار نہیں لگی۔ غزالہ جلیل راؤ کا مڑ کے جو دیکھا اور شمیمہ معین کا چاند کے پار کہانی اور کردار نگاری کے اعتبار سے معیاری تھے۔ موضوع البتہ آگے پیچھے کے ہی ہوتے ہیں۔ اصل بات کہانی کے انتخاب اور لفظوں کے چناؤ کی ہوتی ہے۔ اندازِ بیاں بے جان موضوعات میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔ رحمٰن رحیم سدا سائیں میں ام مریم نے بہت جلدی میں اختتام کیا۔ امن اور عبدالہادی کے کردار اچانک کہاں چلے گئے؟ بہر حال اُن کی اچھی کاوش تھی اور اب دعا ہے کہ اللہ اُن کو ازدواجی زندگی کی ساری خوشیاں دیکھنا اور برتنا نصیب فرمائے آمین۔ نگہت اعظمیٰ کا ماسک موجودہ دور کی منافقت پسند زندگی کی عکاسی کرتی خوبصورت اور ہنس مکھ تحریر تھی۔ دوشیزہ گلستان اسماء اعوان کی طرح مہکتا ملا، نئے لہجے نئی آوازیں میں تمثیلہ کی غزل ماشاء اللہ بہت عمدہ تھی۔ کچن کارنر کی ریسپیز بچوں کو لنچ دینے کے اعتبار سے بہت پسند آئیں۔ خلاصہ یہ کہ خوبصورت مدیرہ کو خوبصورت دوشیزہ کی خوبصورتی کے ساتھ ادارت کے فرائض کی انجام دہی پر بہت بہت بہت...... مبارکباد قبول ہو۔ البتہ ابھی ہم درسگاہِ ادب کے طفلِ مکتب ہیں۔ پتا نہیں ہم کب اتنے بڑے ہوں گے کہ ہمارے افسانے بھی ارسال کیے جانے کے دو تین ماہ میں شائع ہو جائیں۔ مائنڈ نہیں کیجیے گا منزہ دراصل ذو معنی جملے کہنے میں ہم انور مقصود صاحب سے بہت زیادہ متاثر ہیں اس لیے اپنا مذاق بھی فراخدلی سے خود اڑا لیتے ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری تحریروں نے ابھی شیر خوارگی کی عمر سے نکل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سیکھا ہے۔ دوڑانے کا کام آپ کے سپرد ہے۔ ابتداء کی طرح اختتام بھی ہمیشہ جیسا منزہ، کاشی، دوشیزہ اور اراکین دوشیزہ کی روزافزوں ترقی و کامیابی کی خواہش مند اور اپنے مزید کسی افسانے کی، اشاعت کی منتظر۔

ﷺ: کیوٹ خولہ! اتنے جاندار تبصرے کے جواب میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ میری کوشش ہوتی ہے کہ لکھنے والے انتظار کے کرب سے محفوظ رہیں لہٰذا پوری کوشش ہے کہ سب کے افسانے جلدی جلدی لگاؤں اور یہ پکا والا وعدہ ہے۔

✉: تمثیلہ تشریف لائی ہیں کراچی سے، لکھتی ہیں۔ ایک طویل عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں۔ وجہ بہت سی مجبوریاں ہیں جو پیروں میں بیڑیوں کی طرح پڑی جکڑے ہوئے ہیں مجھے...... خیر...... یہ سب چلتا رہتا ہے۔ آپ سے شکایت کی تھی جس کا ازالہ ہو گیا کہ دوشیزہ نہیں مل رہا تھا۔ اللہ کا شکر اب مل رہا ہے اور دوشیزہ میں رونقیں بھی نظر آ رہی ہیں۔ آپ کی محنت بھی نظر آ رہی ہیں۔ اللہ دوشیزہ کو مزید ترقی دے آمین۔ مینا تاج کی رحلت کا پڑھ کر سچ ماننے یقین نہیں آ رہا کہ یہ کیا ہو گیا بار بار ایوارڈ کی تقریب میرے دماغ میں گھوم رہی تھی۔ جس میں مینا تاج کو میں نے ہنستے مسکراتے ایوارڈ وصول کرتے دیکھا تھا۔ سچ مچ بہت پیاری لگ رہی تھیں وہ اتنے پیارے لوگ اتنی جلدی کیوں چلے جاتے ہیں۔ پیچھے اپنی ڈھیر ساری یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اللہ اُن کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے آمین۔ سکینہ فرخ کو جون کی کہانی پر ایوارڈ کے لیے مبارکباد۔ اس ماہ عقیلہ حق نظر نہیں آئیں۔ اُن کا تبصرہ بھرپور ہوتا

سانحہ ارتحال

ہماری لکھاری ساتھی سلمی یونس کی والدہ گزشتہ ماہ اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں اُن کے ساتھ ہے اور مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے اور قارئین سے مرحومہ کے ایصال ثواب کیلئے دعا کی درخواست ہے۔

ہے باتیں صاف اور کھری کرتی ہیں کہ پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ زاہد احمد اچھے اداکاراؤں میں سے ہیں۔ اُن کا انٹرویو پڑھ کر اچھا لگا۔ سائرہ غلام نبی کا مختصر افسانہ اچھا تھا۔ مینا تاج بھی اچھا لکھتی ہیں اُن کی تحریر میں پختگی ہے۔ مگر ہائے...... اب وہ ہم میں نہیں، افسانے پڑھتے پڑھتے اُن کا افسانہ نظر سے گزرا تو آنکھ پھر سے نم ہوگئی۔ ام مریم کا ناول اختتام کو پہنچا۔ زمر نعیم کے ناول کا انتظار رہے گا۔ ام مریم آپ کے ناول کی آخری قسط کا اختتام اچھا تھا۔ آپ کو نئی زندگی کے آغاز کے لیے بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ آپ کے دامن کو خوشیوں سے بھرا رکھے آمین اور آپ یونہی لکھتی رہیں۔ اب اجازت چاہوں گی۔ قبل ازیں میرے شوہر کے ماموں کی رحلت ہوگئی تھی۔ میری ساس کی طبیعت ناساز رہی وہ اپنے اس بھائی سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اللہ اُن کے درجات بلند کرے آمین۔

✍: پیاری سی تمثیلہ! کچھ لوگ ہوتے ہی جلد باز ہیں ہر کام میں جلدی جلدی کرتے ہیں اور دنیا سے بھی جلدی چلے جاتے ہیں بس اب تو دعا ہے کہ اللہ مینا کے والدین اور بیٹے کو صبر اور ہمت دے۔ عقیلہ کی گمشدگی میں بھی محسوس کر رہی ہوں اور لگتا ہے اس بار تلاش گمشدہ کا اشتہار دے ہی دوں شاید میرا یہ انتہائی قدم عقیلہ کو دوشیزہ کے صفحات پر واپس لے آئے۔ شمارے کی پسندیدگی کا شکریہ اللہ آپ کی ساس کو صحت عطا فرمائے اور وہ بھائی سے جدائی کے غم کو سہہ پائیں آمین۔

✉: نگہت غفار تشریف لائی ہیں کراچی سے۔ لکھتی ہیں۔ رسالہ موصول ہوا دل خوش ہوگیا بھئی میں نے پچھلے مہینے بھر پور تبصرہ کیا تھا اور چند تحریریں بھی ارسال کی تھیں شاید آپ کو ملے نہیں یا دیر سے ملے بحرکیف پھر ایک بار شکریہ کہ جون میں میرا افسانہ شائع ہوا اور اس ماہ میر کے عزیز ترین ساتھیوں نے اُس افسانے پر تبصرہ کیا میں آپ سب کی بے حد ممنون و مشکور ہوں سب سے پہلے پیاری فرح اسلم سلامت رہیں ہزاروں برس جئیں خوشیوں اور کامیابیوں کے ساتھ۔ ارے گلابی آنکھوں والی خولہ سلامت رہو آپ کو بھی میرا افسانہ پسند آیا بڑی نوازش آپ ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہیں۔ بہت ہی پیاری اپنی سی لگنے والی فریدہ جاوید اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر اور مکمل صحت عطا فرمائے آپ نے بھی میرے افسانے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے فرح اسلم کی اندھی بے حد پُر اثر اور حقیقی تحریر تھی ویل ڈن فرح جی سبق آموز کہانی تھی۔ غزالہ جلیل مڑ کر جو دیکھا اچھا لگا' کوثر ناز میسجز بہت ہی اچھی کہانی ہے۔ سبق آموز بھی، منعم اصغر جگنو میری پلکوں پر بے حد خوبصورت ناولٹ تھا۔ بیشک ہر چیز کا مناسب جائز اور ایک لمٹ میں رہ کر استعمال کرنا چاہیے پوزیٹو انداز میں نئے لہجے نئی آوازیں میں فریدہ فری' راحت وفا' خولہ عرفان' تمثیلہ لطیف کے کلام پسند آئے۔

✍: نگہت جی! آپ کے دونوں خط مجھے ساتھ ساتھ ملے لہٰذا ایک خط جس میں تبصرہ پرانا تھا شائع نہیں کر رہی...... شمارہ آپ کو اچھا لگا، بہت شکریہ۔

✉: کوئٹہ سے تشریف لائے ہیں عمران مظہر، لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ آپی' السلام علیکم! امید ہے آپ کا شی

بھائی اور رسالے کا تمام اسٹاف خیریت و عافیت سے ہوگا۔ کافی عرصے بعد رابطہ ہو رہا ہے لیکن رسالہ بدستور زیرِ مطالعہ رہا رسالے کی کامیابی آپ سب کی محنتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے جولائی کے شمارے میں آپ کا اداریہ میرے من کی بات ہے۔ مینا تاج صاحبہ کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔ کاشی بھائی کے پھوپا کے بارے میں بھی خبر پڑھی۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند کرے اور تمام مردہ گان کے لواحقین کو صبر عطا کرے آمین۔ دوشیزہ کی محفل میں خطوط کی تعداد کم رہی۔ ابھی تک افسانے ہی پڑھ پایا ہوں چند ایک جن میں مینا تاج صاحبہ کا 'ایک کپ چائے' ٹھیک رہا۔ فرح اسلم قریشی نے 'اندھی' بہت اچھے پیرائے میں لکھا۔ 'ماسک' نگہت اعظمیٰ کے قلم سے نکلی ایک مسکراتی تحریر رہی۔ سائرہ غلام نبی کا 'یہ کہانی تو نہیں' بہت بہترین لگی۔ جون 2016ء کے شمارے میں شاید ثمینہ صاحبہ نے اپنی آنکھوں کا مسئلہ بیان کیا تھا۔ میری آنکھوں میں بھی وہی مسئلہ ہو گیا ہے۔ سوزش اور اُس کی وجہ سے موتیا، آپریشن ہوگا پر ڈاکٹر کہتا ہے کہ 100% رزلٹ نہیں ملے گا اور وقتاً فوقتاً سوزش کے حملے ہوتے رہیں گے۔ ثمینہ صاحبہ سے پوچھنا تھا کہ ان کی ٹیسٹ رپورٹ کیا ہیں ڈاکٹر اُن سے کیا کہتے ہیں اگر وہ جواب دیں گی تو شاید میرے لیے علاج کرنے میں مدد ملے گی۔ منزہ صاحبہ! بہت عرصے بعد ایک افسانہ بھجوا رہا ہوں۔ ایڈیٹر کی کرسی پر اب آپ براجمان ہیں دیکھ لیجیے گا۔ کمی بیشی ہوگی غلطیوں سے بھی انکار ممکن نہیں پر کوئی گنجائش نکلتی ہو تو...... اس سے پہلے دو افسانے دوشیزہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اجازت چاہوں گا زندگی رہی اور صحت نے ساتھ دیا تو آدھی ملاقات ہوتی رہے گی۔ اپنا بہت سارا خیال رکھیے گا کاشی بھائی، زین بھائی سب کو سلام دعائیں۔

جواب: عمران بھائی اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ جب اپنے بڑوں سے سنتے تھے کہ صحت دولت ہے تب ہنسی آتی تھی مگر اب اپنی کم عقلی پر ہنسی آتی ہے بے شک صحت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ آپ کا افسانہ مل گیا ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی۔

✉ لاہور سے رضوانہ کوثر کی بڑے دنوں بعد آمد ہے، لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ! سلامت رہو۔ یقین کرو تمہیں اس محفل میں دیکھ کر میں بہت مسرور ہوں۔ تم نے سہام بھائی کی جانشین ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ دوشیزہ ہر ماہ مل رہا ہے یہ تمہاری محبت ہے۔ کاشی سے اکثر بات ہوتی ہے تو وہ تمہاری پرچے سے محبت اور انتھک محنت کا ذکر جس طرح کرتا ہے یقین مانو سگی بہن کا سا گمان ہوتا ہے۔ خدا محبتیں برقرار رکھے۔ پرچہ اس ماہ بھی زبردست رہا۔ اس پرچے سے پہلے کچھ گزشتہ تحریروں کے بارے میں بات کروں گی۔ کیونکہ منزہ پیاری اب صحت اجازت نہیں دیتی کہ ہر ماہ اس محفل کا حصہ بنوں۔ میرے لیے صحت کی دعا کرنا۔ گزشتہ شماروں میں سب سے آؤٹ کلاس فرزانہ آغا کی 'یہ زخم خنجر کے نہیں' رہی۔ فرزانہ سچ میں تم نے اتنا ہٹ کر لکھا کہ جی چاہا تمہیں محبت کے گلابوں اور موتیوں میں تول دوں۔ واہ واہ...... میرے پاس تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ دردانہ نوشین خان متواتر شائع ہو رہی ہیں۔ یہ دوشیزہ کے بھاگ ہیں کہ اتنی اعلیٰ پائے کی تحریریں دوشیزہ کا حصہ بن رہی ہیں۔ دردانہ نظر اتروالیا کرو۔ تم تو خود بھی بہت پیاری ہو یار! فرح اسلم قریشی کی اندھی زبردست رہی۔ الماس روحی تم نے ڈاکٹر بن کر دوبارہ وہی شائع شدہ تحریریں بھیج دیں۔ میں سمجھی تھی کہ شاید تم نے ادبی سرجری کر کے ایک خط، ایک کہانی اور قدریں بھیجی ہوں گی مگر...... قندِ مکرر ثابت ہوئیں۔ ہم پرانے چاول ہیں

خیال رکھا کرو۔ سنبل کی تحریریں خوب رنگ جماتی ہیں۔ نفیسہ سعید دوشیزہ میں نیا اضافہ ہیں لیکن تحریر کے بانکپن اور انفرادیت نے نفیسہ کا وقار بلند کر دیا ہے۔ نفیسہ تم نے 'بنت حوا' کمال لکھا۔ ویلڈن! سلمیٰ یونس کی والدہ کے انتقال پر میں بہت ملول ہوں۔ سلمیٰ بہت پیاری بچی ہے۔ خدا تمہیں اس دکھ کو برداشت کرنے کا حوصلہ دے آمین۔ ناصر بھائی آپ بھی خیر سے نانا بن گئے۔ اللہ پاک آپ کو اور مہر بھابی کو آباد رکھے اور دکھوں سے دور رکھے آمین۔ نسیم آمنہ کا مکمل ناول 'توبہ' جولائی کے شمارے کی شان تھا۔ 'آہ مینا تاج!' مینا تم اتنی جلدی کہاں چلی گئیں۔ ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں...... تمہاری تحریر ایک کپ چائے نے رُلا دیا۔ غزالہ رشید کے خط نے بھی مجھے اُداس کر دیا۔ غزالہ تم اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ حسن کو میرا بہت سارا پیار دینا اور نسیم بھائی کو سلام کہنا۔ سائرہ غلام نبی کی تحریر منفرد تھی مزہ آیا پڑھ کر۔ عالیہ حرا، دانیہ آفرین، غزالہ جلیل راؤ کی تحریریں بھی ہلکی پھلکی رہیں۔ سعدیہ سیٹھی نے اہتمام رمضان خوب لکھی۔ سعدیہ سچ پوچھو تو تمہاری اپنے وطن سے محبت نے حیران کیا۔ لندن سے بھیجی گئی تمہاری تحریر بھلے ہلکی تھی۔ مگر اس میں سے تمہارا اخلوص اور محبت کے رنگ بہت پکے تھے۔ نگہت اعظمی ماسک ایک بہت خاص افسانہ تھا۔ مجھے بہت پسند آیا۔ اب بات ہوجائے دام دل کی، رفعت سراج کا نام ہی کوالٹی کی ضمانت ہے۔ دام دل بھی اعلیٰ پائے کی تخلیق ہے۔ اٹھارہویں قسط میں بھی قاری سطر سطر سیراب ہوتا ہے۔ خوش رہو۔ ادب آباد کرتی رہو رفعت۔ ام مریم کا ناول رحمٰن رحیم سدا سائیں اس ماہ اختتام کو پہنچا۔ ام مریم تم نے واقعی قلم کا حق ادا کر دیا۔ ایک یادگار ناول تھا، جس کی یادیں اور اپنے زندہ کرداروں کے ساتھ عرصے تک ذہن و دل میں گونجتی رہیں گی۔ اسماء اعوان کی لائف بوائے اسٹوری ہر بار ایک نیا مزہ دیتی ہے۔ لیجیے جی تبصرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ میرا خیال ہے کچھ کچھ محبت کا حق اس ماہ شاید مجھ سے بھی ادا ہو گیا۔ بس میری صحت کی دعا کرتے رہا کریں آپ لوگ، ارے ہاں! رضوانہ پرنس آپ کی تحریر کا ہر ماہ انتظار کرتی ہوں مگر...... پتا نہیں آپ کی تحریر کب پڑھ پاؤں گی۔ منزہ تمہارے لیے ایک نظم

تمہیں دیکھتی ہوں تو
لگتا ہے جیسے
خدا کا یہ سارا
جہاں بھی حسیں ہے

ج: بہت ہی اچھی رضوانہ! آپ کی صحت کے بارے میں پتہ چلا اپنا خیال رکھا کریں۔ بہت مفصل خط تحریر کیا اس کا شکریہ۔ رضوانہ پرنس تو بہت بڑے دکھ سے گزر رہی ہیں۔ ان کے منجھلے والے بھائی سلیم بہن بھائیوں، عزیز و اقارب سب کو چھوڑ، والدین کے ساتھی ہو گئے۔ میری دعا ہے کہ اللہ رضوانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ شمارے کی پسندیدگی کا شکریہ اور نظم کا بہت زیادہ شکریہ۔

اس آخری خط کے ساتھ اجازت دیجیے کاشی نے دفتر میں مینگو پارٹی کا اہتمام کیا ہوا ہے اور آم اتنے پیلے نہیں ہیں جتنی پیلی قمیض کاشی نے پہنی ہے خود سندھڑی آم لگ رہے ہیں...... یاد رکھیے آپ اپنا خط 24 تاریخ تک مجھے بھجوا سکتے ہیں وہ اسی ماہ محفل میں شائع ہو سکے گا۔ خوش رکھیے اور خوش رہیے۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام
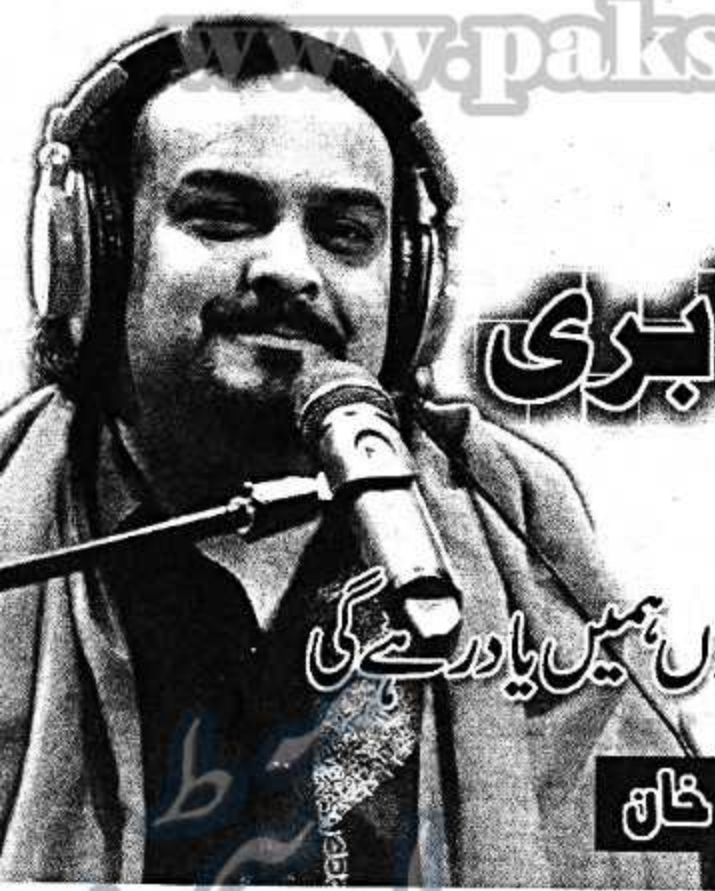
امجد صابری

ایک ایسی آواز جو مدتوں ہمیں یادرہے گی

مونی خان

امجد صابری 23 دسمبر 1976ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ وہ مشہور قوال غلام فرید صابری صاحب کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ وہ ساؤتھ ایشیا کے مشہور قوال، سنگرز میں شمار کیے جاتے تھے۔ نو سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ قوالی شروع کی اور 1988ء میں صرف 11 سال کی عمر میں اپنے

والد سے راگ بھیرون کی تربیت حاصل کی جس کے لیے چھوٹے سے امجد صابری کو آدھی رات کو نیند ترک کر کے مشق شروع کرنی ہوتی تھی۔ امجد صابری نے دنیا کے بیشتر ممالک میں پرفارم کیا۔ ان کو Rock Star آف
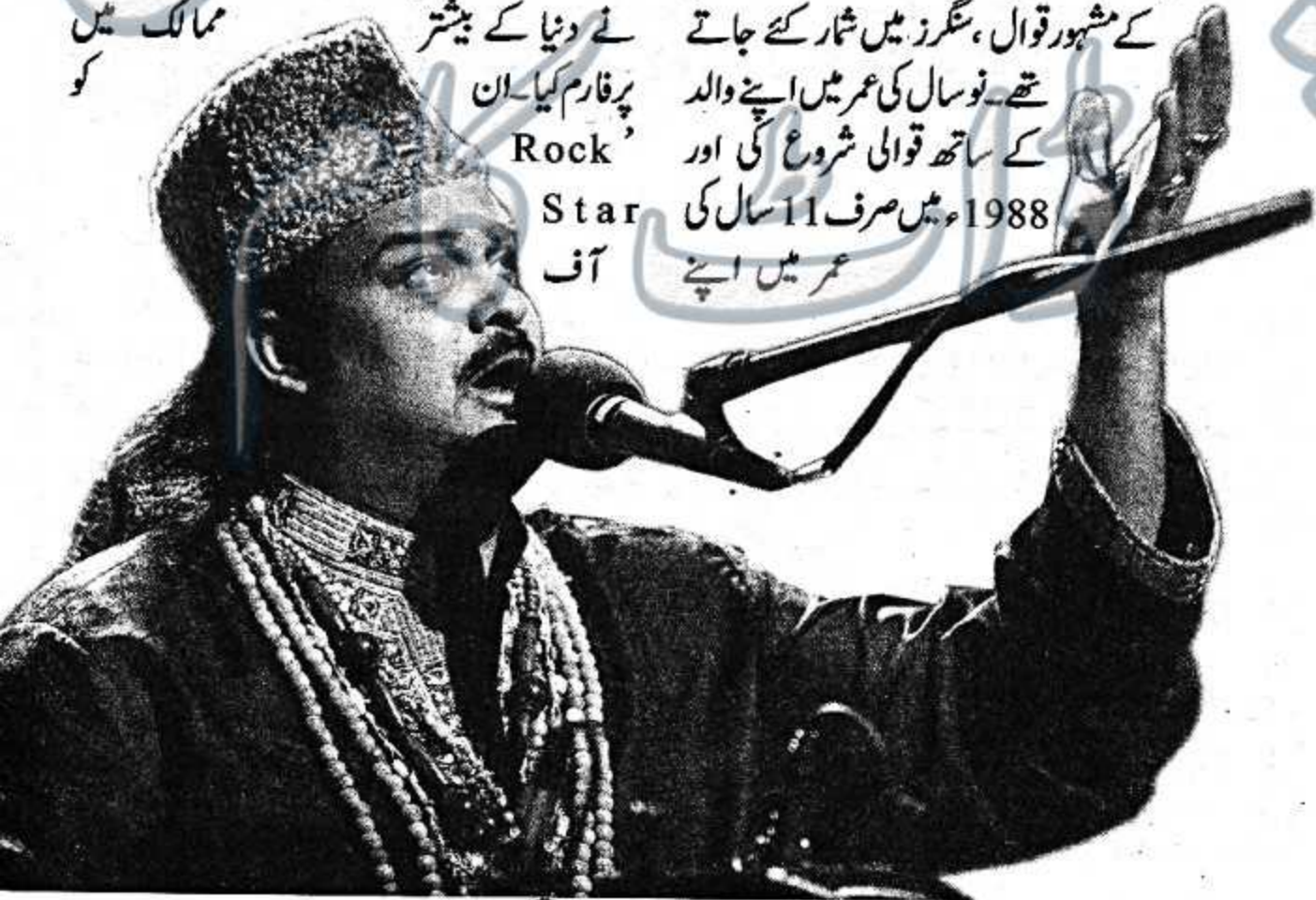
قوالی' مانا جاتا تھا۔ جو لوگ زبان سے واقفیت بھی نہیں رکھتے تھے وہ بھی سر دھنتے تھے۔

امجد صابری صاحب کے 3 بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جو ابھی بہت چھوٹے ہیں اور باپ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ عون دوران غسل اپنے باپ کے برابر میں لیٹ گیا تھا کہ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گا۔ ظالموں نے امجد صابری کو مار کر بہت برا کیا۔ 22 جون کی گرم دوپہر قاتلوں نے امجد صابری کی گاڑی کا پیچھا کیا اور جب وہ رمضان ٹرانسمیشن کے سلسلے میں ریکارڈنگ کے لیے جارہے تھے تب ان پر حملہ کرکے انہیں شہید کردیا اور ایک خوبصورت آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا۔

☆☆......☆☆

عائشہ خان

خوبرو اداکارہ

ذیشان فراز

آج ہم آپ کی ملاقات کروا رہے ہیں شوخ، چنچل اور بے انتہا حسین عائشہ خان سے، آیئے ملتے ہیں۔

ہم : عائشہ آپ کے بچپن سے شروع کرتے ہیں، یہ بتائیں کب پیدا ہوئیں، کہاں پیدا ہوئیں؟

عائشہ: (ہنستے ہوئے، یہ مت پوچھیے گا کہ کیوں پیدا ہوئیں) Any Way میں 27 ستمبر 1982ء کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ اس حساب سے میرا اسٹار 'لبرا' ہے۔

ہم : آپ کا بچپن کیسا تھا، شرارتی تھیں یا سنجیدہ؟

عائشہ: بچپن بالکل ویسا ہی تھا جیسا سب بچوں کا ہوتا ہے شرارتی بلکہ بہت شرارتی تھی، بہت ینگ ایج میں ہم سب کینڈا چلے گئے یہاں کے مقابلے میں وہاں لائف مختلف ہے۔ پھر ابوظہبی شفٹ ہوگئے اس طرح سارا وقت امی ابا کے ساتھ ہی گزرا۔

ہم : آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی؟

عائشہ: میں نے کینیڈا، ٹورنٹو سے گریجویشن کی اور پھر شوبز کی طرف قدم بڑھا دیے۔

ہم: آپ کی شوبز میں آمد کب ہوئی؟

عائشہ: میں نے 2000ء میں پی ٹی وی سے پہلا ڈرامہ کیا تھا۔ 'تم ہی کہنا' جس سے مجھے بہت پذیرائی ملی۔

ہم: آپ نے بے شمار ڈرامے کیے لوگوں نے آپ کو بہت سراہا بھی مگر آپ کو اپنے کون سے ڈرامے زیادہ پسند ہیں؟

عائشہ: مجھے ڈرامہ 'کافر، مانے نہ یہ دل، مہندی، کچھ پیار کا پاگل پن، پیاسا، پارسا، بس چپ رہو اور من مائل' بہت پسند ہیں۔

ہم: آپ نے فلمیں بھی کیں؟

عائشہ: میری پہلی فلم بلال لاشاری کی 'وار' تھی اس کے بعد 'جوانی پھر نہیں آنی'۔

ہم: کون سی زبانوں پر آپ کو عبور حاصل ہے؟

عائشہ: والد کیونکہ پنجابی ہیں اور والدہ پٹھان تو پنجابی اور پشتو، اردو اور انگلش ٹھیک ٹھاک بول لیتی ہوں۔

ہم: عائشہ آپ کو خوبصورت ترین اداکارہ مانا جاتا ہے تو کیا انڈین فلموں میں بھی کام کرنے کا ارادہ ہے؟

عائشہ: میں ایک اشتہار کے

سلسلے میں انڈیا گئی تھی مگر میں نے وہاں کسی سے ملاقات نہیں کی میں کبھی بھی بھارتی فلموں میں کام نہیں کروں گی۔

ہم: اس کی کوئی خاص وجہ؟

عائشہ: دیکھیے میں کسی کو برا نہیں کہہ رہی مگر میں نے اپنے لیے کچھ حدود متعین کی ہیں بس اسی میں رہ کر کام کرنا چاہتی ہوں جو ظاہر ہے بھارتی فلموں میں مشکل ہے۔ مجھے ڈراموں میں کام کرنا پسند ہے اور وہی کروں گی۔

ہم: آپ ڈراموں کے معیار سے مطمئن ہیں؟

عائشہ: بالکل نہیں یہ سچ ہے کہ ڈراموں کا معیار بہت گر چکا ہے۔ حقیقت سے بہت دور تحریر ہوتی ہے اسکرپٹ کمزور بلکہ کچھ تو بڑے لکھنے والے اسکرپٹ خود لکھتے بھی نہیں بلکہ اپنے اسسٹنٹ سے لکھواتے ہیں جو بہت بری بات ہے۔

ہم: اچھا یہ بتائیں کہ آپ کا نام ہمایوں سعید کے ساتھ بہت لیا جاتا ہے اس کی کوئی خاص وجہ؟

عائشہ: (کچھ ناراض ہوتے ہوئے) جی ہاں اس کی خاص وجہ ہے ایک تو یہ کہ وہ میرے کو اسٹار ہیں ہم نے کئی پراجیکٹ پر کام کیا ہے اور دوسری بڑی وجہ افواہوں کا پھیلانا ہیں صرف مزے کے لیے یہ سوچ ہی بڑی عجیب ہے کہ مرد اور عورت صرف ایک ہی رشتے میں بندھ سکتے ہیں، دوست نہیں ہوسکتے۔

ہم: تو ہمایوں کو آپ دوست مانتی ہیں؟

عائشہ: مانتی نہیں ہوں وہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔

ہم: محبت پر یقین رکھتی ہیں؟

عائشہ: بالکل اور یہ بھی مانتی ہوں کہ محبت دوستی ہے۔

ہم: شادی کب کر رہی ہیں؟

عائشہ: مجھے یقین تھا کہ آپ یہ ضرور پوچھیں گے جب وقت آئے گا تب کرلوں گی۔

ہم: ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟

عائشہ: بہت یقین ہے۔

ہم: آج کل آپ کا سیریل 'من مائل' بہت پسند کیا جارہا ہے آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

عائشہ: 'من مائل' ایک بہت اچھے اسکرپٹ پر لکھا ڈرامہ ہے۔ تمام کردار بھی بہت مضبوط ہیں۔ جب تعریف سننے کو ملتی ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔

ہم: کچھ اپنے کردار کے بارے میں بتائیں؟

عائشہ: میں اس میں جینا کا کردار ادا کر رہی ہوں جو منفی کردار ہے اور منفی کردار کرنا مجھے بہت مشکل لگتا ہے لیکن مزہ ایسے چیلنجنگ رول میں ہی آتا ہے۔

ہم: اپنی کون سی عادت آپ کو بہت پسند ہے؟

عائشہ: میں بہت محنتی اور Focused ہوں اور مجھے اپنی یہی عادت بہت پسند ہے۔

ہم: اور کون سی عادت بری لگتی ہے؟

عائشہ: بہت منہ پھٹ ہوں Sugar Coated بات نہیں کرسکتی اس لیے اکثر نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔

ہم: کون سی ایسی پاکستانی اداکارائیں ہیں جو آپ کو پسند ہیں؟

عائشہ: مجھے روبینہ اشرف' ثانیہ سعید اور نادیہ خان بہت پسند ہیں۔

ہم: کو اسٹار کون پسند ہے؟

عائشہ: نعمان اعجاز بہترین اداکار ہیں۔

ہم: ایسی کون سی عادتیں ہیں لوگوں کی جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟

عائشہ: لوگ اپنی ذاتی Hygiene کا خیال نہیں رکھتے اور دوسرے بہت Stingy ہوتے ہیں مجھے ایسے لوگ بہت Tease کرتے ہیں۔

ہم: فارغ وقت میں کیا کرتی ہیں؟

عائشہ: مووی دیکھتی ہوں دوستوں کے ساتھ یا پھر ڈنر پر جاتی ہوں۔ شاپنگ بھی بہت پسند ہے۔

ہم: چھٹیاں کہاں گزارنا چاہتی ہیں؟

عائشہ: I Think دنیا کی خوبصورت ترین جگہ سوئٹزرلینڈ ہے۔

ہم: یہ بتائیں جب ریکارڈنگ نہیں ہوتی تب کیا کرتی ہیں؟

عائشہ: مجھے بہت شوق ہے کہ میں سارا دن سوتی رہوں مگر ایسا ہوتا نہیں ہے بس فیملی کے ساتھ گپ شپ، ہلا گلہ۔

ہم: لباس کون سا پسند کرتی ہیں؟

عائشہ: مجھے جینز اور ٹی شرٹ پسند ہے بالکل Casual۔

ہم: پسندیدہ فلم کون سی ہے؟

عائشہ: دل والے دلہنیا لے جائیں گے All Time Favourite

ہم: موسیقی سے لگاؤ ہے؟

عائشہ: U2 کا کچھ بھی

ہم: کھانے میں کیا پسند کرتی ہیں؟

عائشہ: مجھے پاستا ہر قسم کا اور بریانی بہت پسند ہے۔

ہم: ایسی کون سی چیز ہے جس کو دیکھتے ہی آپ بے قرار ہو جاتی ہیں؟

عائشہ: ڈائمنڈ ایک ایسی چیز ہے جس کے پیچھے میں پاگل ہوں۔

ہم: اچھا یہ بتائیں کہ اگر آپ کو ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر کسی صحرا میں چھوڑ دیا جائے تو اپنے ساتھ کس کو لے جانا پسند کریں گی؟

عائشہ: (زور سے قہقہہ لگا کر) ظاہر ہے عمران خان کو۔

ہم: آپ کو عمران خان سیاست کی وجہ سے پسند ہیں؟

عائشہ: بالکل نہیں مجھے سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں مجھے اُن کی شخصیت ہمیشہ سے بہت پسند ہے۔

ہم: اِس کا مطلب ہے کہ آپ کا PTI میں شمولیت کا کوئی ارادہ نہیں؟

عائشہ: بالکل بھی نہیں۔

ہم: آپ کی آج کل رہائش کراچی میں ہے کیسا تجربہ ہے؟

عائشہ: بہت اچھا شہر ہے اور بہت اچھے لوگ سب بہت پروفیشنل ہیں اور یہی چیز مجھے بہت پسند ہے۔

ہم: عائشہ فینز تو آپ کو بہت تنگ کرتے ہوں گے؟

عائشہ: کبھی کبھی ذرا زیادہ ہو جاتا ہے ویسے ہم ان کے بنا کچھ بھی نہیں ہیں لہٰذا برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ہم: کوئی ایسی بات جو آپ اپنے پڑھنے والوں سے کہنا چاہیں؟

عائشہ: میں بس صرف اتنی سی گزارش کروں گی کہ ہم آرٹسٹ آپ لوگوں کے لیے ہی کام کرتے ہیں آپ کی پسندیدگی بہت طاقت دیتی ہے۔ فینز کا پریشان کرنا بھی برا نہیں لگتا مگر جب کوئی ہمیں پبلک پراپرٹی سمجھ کر بدتمیزی کرتا ہے تب دکھ ہوتا ہے۔ تو آپ ہم سے محبت کریں ہم آپ سے محبت کریں گے۔

اور یوں عائشہ خان سے یہ ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی بہت ساری باتیں پوچھنا رہ گئیں مگر ہم شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے انتہائی بزی ٹائم ٹیبل میں سے ہمارے لیے وقت نکالا۔

☆☆......☆☆

لائف بوائے... مون سون میں بھی کام دکھائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

''اوفوہ! ایک تو یہ مون سون جب آتا ہے نا ہمیشہ ہی ڈھیروں ڈھیر بالوں کے مسائل میں اُلجھا دیتا ہے قسم سے۔''

عندلیب بیٹی کے بالوں میں تیل میں دہی ملا کر مساج کررہی تھی۔

''امی آرام سے کریں، اتنی تیزی سے آپ ہاتھ مار رہی ہیں سر پر۔ میرا سر بجائے سکون کے پھٹنے لگا ہے۔''

اریبہ ماں کی ایسی محبت سے تنگ کر سر پکڑتی ہوئی بولی تھی۔

''میری شہزادی تو تم بارش میں کیوں نہانے کھڑی ہو جاتی ہو۔ دیکھو بالوں کا حشر کیا کردیا تمہاری لاپروائی نے۔''

عندلیب نے اب اُس کے سر پر تیزی سے چمپی شروع کردی تھی۔

''مجھے نہیں کرانی یہ مشقت آپ سے، بس میں اُٹھ رہی ہوں۔'' اریبہ نے منہ بسورنا شروع کردیا۔

''خبردار جو تم یہاں سے ذرا بھی ہلیں تو...... چپ چاپ بیٹھی رہو۔ دیکھو تو بھلا خشکی نے کیا حال کردیا میری بچی کے سر کا۔''

عندلیب بڑبڑائی اور پھر سے دیسی نسخے پر طبع آزمائی کرنے لگی۔

''آپ کے پاس صرف یہی ایک حل ہے خشکی دور بھگانے کا۔ ٹی وی پر اتنے سارے اشتہارات آتے ہیں امی۔ پلیز آپ کوئی شیمپو ہی لادیں نا۔''

اریبہ نے جیسے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''ارے میری گڑیا! دیسی ٹوٹکے دیرپا ہوتے ہیں اور یہ جو تم سب دیکھتی ہونا اشتہار وغیرہ یہ سب کہنے کی حد تک ہی کی باتیں ہوتی ہیں کتنے سارے شیمپو تو استعمال کرلیے ہیں مگر نتیجہ...... وہی خشکی، سکری اور بالوں کی بے رونقی۔'' عندلیب اپنی بات پر قائم تھی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ سب کچھ کہنے کی حد تک

کی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ کریں ان دیسی نسخوں سے میرے بالوں کا مزید بیڑا غرق۔
اریبہ روہانسی ہوئی۔
"ارے دلہن! چھوڑ دو معصوم کو، ساری خشکی آج ہی ختم ہو جائے گی کیا اس تیل دہی سے۔"
دادی ماں پوتی کی گریہ زاری سن کر اپنے کمرے سے باہر آ گئیں۔
"ارے ہٹاؤ یہ سب چیزیں...... میری بچی کا کتنا سا منہ نکل آیا ہے۔ بھیا بڑی جلاد ماں ہو۔ دیکھو تو چمپی کر کر کے میری بچی کا سارا خون ماتھے پر جمع کر دیا۔ آ میری گڑیا...... میری چندا۔"
دادی اُسے پچکارنے لگیں۔
اریبہ دادی کی طرف بڑھ گئی اور عندلیب کچھ دیر پہلے کے منظر کو پھر سے یاد کرنے لگی۔
"کیا میں نے واقعی کچھ غلط کیا ہے اریبہ کے ساتھ؟"
"نہیں تم ٹھیک ہو اپنی جگہ......" اُس کا دل بولا۔
"مگر...... میری مثبت بات کو منفی رنگ کیوں دے دیا گیا؟"
"آج تمہارا زمانہ نہیں بلکہ تمہاری بچی کا زمانہ ہے۔" اندر سے آواز آئی۔
"تو......"
"تو پھر یہ کہ آج کے حساب سے جینا سیکھو۔ جو مسائل تمہارے زمانے میں تھے۔ وہ مسائل آج بھی ہیں مگر اُن کا حل تبدیل ہو گیا ہے۔"
"مگر...... میں بھلا کس طرح سے آج کے زمانے کا ساتھ دے سکتی ہوں۔"
"آج کا زمانہ تمہارا منتظر ہے۔ بس قدم بڑھاؤ۔"
ضمیر کی تکرار سے وہ جلد ہی نتیجے پر پہنچ گئی۔

☆......☆......☆

"اریبہ! گڑیا اُٹھ جاؤ پلیز!"
عندلیب نے اریبہ کو اُٹھایا تو وہ منہ بسورتی اُٹھ گئی۔
"آج سنڈے ہے امی آج سونے دیں نا۔"
"ٹھیک ہے سونے دیتی ہوں مگر کتنی دیر تک......"
عندلیب نے بیٹی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو پھر سے خشکی کے ذرات اُس کے بالوں میں آ گئے۔
"او کے امی! میں اٹھ گئی۔" وہ بستر پر دوزانو بیٹھ گئی۔
"گڈ گرل!" عندلیب نے بیٹی کا ماتھا چوما۔
"امی چلیے میں آتی ہوں۔ میرا ناشتا آپ دادی کے کمرے میں لے آیئے۔"
"ٹھیک ہے چندا! میں تمہارا ناشتا وہیں لے کر آتی ہوں۔"
کچھ ہی دیر میں وہ بیٹی کا من پسند ناشتا لیے اُس کے کمرے میں تھی۔
"اماں آج آپ بتایئے کہ آپ کی پوتی کو کیا گفٹ دوں۔ آج مدرز ڈے ہے نا۔"
"ارے...... مدرز ڈے پر تو تم مجھے گفٹ دو بہو۔" دادی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ہم روایت بدل دیتے ہیں۔ مدرز ڈے پر ہم دونوں مائیں 'بیٹی' کو گفٹ دیتے ہیں۔" عندلیب نے ساس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"کیوں نہیں! بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ ماؤں کا سب کچھ بیٹی بیٹوں کا ہی تو ہوتا ہے۔"
"مجھے آپ لوگوں سے کچھ نہیں لینا ہے۔ آپ ہی میرا گفٹ ہیں۔" اریبہ نے کہا اور ماں

کے گلے لگ گئی۔

☆......☆......☆

ناشتے کے بعد اریبہ، عندلیب کے ساتھ ٹی وی پر مارننگ شو دیکھ رہی تھی۔ چمکدار لہراتے بالوں والی، لڑکیوں کو دیکھ کر اریبہ اُداس اُداس سی لگنے لگی۔ عندلیب نے فوراً محسوس کیا اور اس کا سر گود میں رکھ کر بال سہلانے لگی۔

''کیا ہوا، اُداس کیوں ہوگئیں بیٹا؟'' عندلیب نے محبت اُسے سے کھر کا۔

''پتا نہیں امی! جب بھی میں لڑکیوں کے ایسے خوبصورت بال دیکھتی ہوں تو اللہ میاں سے ایک ہی دعا مانگتی ہوں کہ کاش اللہ میاں میرے بھی ایسے ہی خوبصورت بال کردے۔ اور میں بھی خوب اتراؤں۔'' اریبہ معصومیت سے دل کی بات کہہ گئی۔

''میری پیاری بٹیا! تُو اُداس نہ ہوا کر، جب تُو اُداس ہوتی ہے تو کائنات اُداس ہوجاتی ہے۔ تُو تو اس گھر میں زندگی کی علامت ہے چندا۔'' عندلیب نے اریبہ کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''تیرے بال انشاء اللہ بہت جلد اچھے ہوجائیں گے۔ میں نے حل سوچ لیا ہے۔ اتنے سارے ٹوٹکے اور شیمپو استعمال کیے مگر اب میں ایک آخری بار ٹرائی کروں گی۔''

''دل بہلانے والی باتیں مت کریں امی، سب کے بال اچھے ہوتے ہیں مگر بس میرے ہی بال ایسے ہیں۔ ضروری تو نہیں امی کہ انسان کی ہر خواہش پوری ہو۔ خواہش بارشوں کی طرح تھوڑی ہوتی ہیں جو صحراؤں اور پہاڑوں دونوں کو جل تھل کردے۔''

''چندا کیا ہوگیا ہے؟ یہ فلسفہ مجھے سخت زہر لگا ہے تمہارا۔ تم تو بہت پیاری بچی ہو، چلو اب ذرا نیوز چینل لگادو۔ حالاتِ حاضرہ سے بھی باخبر رہنا چاہیے۔'' عندلیب نے مسکراتے ہوئے موضوع بدلا تاکہ بیٹی کی اُداسی کسی طور ختم ہو۔

☆......☆......☆

''بہو! میری مانو تو تم فوراً اریبہ کے لیے لائف بوائے شیمپو لے آؤ۔'' دادی ماں نے بہو کو مشورہ دیا تھا۔

''اماں اچھے سے اچھا شیمپو استعمال کرچکی ہوں۔ سارے شیمپو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔'' عندلیب جھنجلائی۔

''میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا بہو کہ آج کی ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ تم سب کچھ استعمال کرکے دیکھ چکیں تو بس یہ آخری شیمپو اور دیکھ لو۔

لائف بوائے نام ہی ضمانت کی ہے بہو۔ تم اسے اریبہ کے بالوں پر استعمال کرکے تو دیکھو۔'' دادی ماں نے کہا۔

''ٹھیک ہے اماں! میں آج ہی اریبہ کے بال لائف بوائے شیمپو سے دھوتی ہوں۔'' عندلیب ساس کے ہاتھ سے لائف بوائے شیمپو لے کر اریبہ کے کمرے میں آ گئی۔ اریبہ اپنے اُلجھے بالوں کو سلجھا رہی تھی۔

''ہیلو بیٹا......'' عندلیب نے اُس کی اُلجھن پر مسکراتے ہوئے کہا۔

''امی! دیکھیے نا پھر سے اُلجھ گئے سارے بال۔''

''ارے میری گڑیا...... یہ تو ان سارے مسائل کا علاج۔'' عندلیب نے اعتماد سے کہا۔

''علاج! کون سا علاج امی۔''

''یہ ہے تمہارے سارے بالوں کے مسائل کا حل۔'' عندلیب نے لائف بوائے شیمپو اس کے آگے کردیا۔

”یہ…… امی آپ اس سے پہلے بھی تو ایسے کئی علاج کر چکی ہیں میرے بالوں کے لیے۔“

”ہاں کر چکی ہوں مگر تم اس لائف بوائے شیمپو پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ لائف بوائے شیمپو جو کہتا ہے وہ کر کے بھی دکھاتا ہے۔ چلو شاباش…… اٹھو اور پورے اعتماد کے ساتھ لائف بوائے شیمپو استعمال کرو۔“

عندلیب نے بیٹی کو ساتھ لگاتے ہوئے جیسے ہمت اور حوصلہ بھی پھونکا تھا۔

اریبہ فوراً ہی لائف بوائے شیمپو سے بال دھونے چل دی تھی۔

’مجھے سو فیصد ہی نہیں اب دو سو فیصد یقین ہے کہ میرا اور اماں کا اعتماد ضرور جیتے گا، انشاء اللہ۔‘ عندلیب دل میں بولتی وہاں سے چل دی۔

☆……☆……☆

(اگلے برس)

آج بڑے زوروں سے بادل گرجے تھے۔ مون سون شروع ہوا تو ہر طرف جل تھل تھی۔ مون سون کی بہاریں ہی الگ ہوتی ہیں۔ جیسے تپتے صحرا میں مون سون اپنے رنگ بھر کر اُسے پانی پانی کر کے دھرتی ماں کی پیاس بجھاتا ہے اسی طرح مون سون دلوں میں امنگ جگاتا، نئے نئے محبت کے رنگ بھی برساتا ہے۔ گھر کے بڑے سارے صحن میں ایک طرف دادی ماں چارپائی پر بیٹھی بارش سے لطف لے رہی تھیں تو دوسری طرف اریبہ دل کھول کر بارش میں نہا رہی تھی۔ بنا خوف و جھنجھٹ کے……

عندلیب پکوان بنانے میں مگن کچن میں مصروف تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ ٹرے میں گرم گرم آلو کے پراٹھے، اچار اور حلوہ لیے برآمدے میں آ گئی۔

”چندا آ جاؤ! پہلے کھا لو اور پھر بعد میں نہاتی رہنا۔“ عندلیب نے اریبہ کو پکارا۔

”اماں جان! پلیز آپ بھی آ جائیں۔ سب ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”ارے امی جان پکوان تو پھر سے بن جائیں گے مگر یہ بارش! اُف! کتنا مزہ آ رہا ہے۔ پلیز آ جائیں اور دیکھیں کتنا انجوائے کر رہے ہیں میں اور دادی اماں!“

اریبہ نے آخر عندلیب کو زبردستی بارش میں کھینچ ہی لیا۔

”اوفوہ! چلو ٹھیک ہے۔ واقعی بارش تو نعمت ہے۔ اور کراچی والوں کے لیے تو بارش اب خواب ہو چکی ہے۔ سچ کہتی ہو، موسم کا لطف تو اٹھایا نہیں جا سکتا بعد میں مگر پکوان ضرور دوبارہ سے لطف دے سکتے ہیں۔“ عندلیب بھی خوشی سے کہہ رہی تھی۔

”ارے…… رکو میں اس خوشی میں تمہیں خوشیاں دینے والے تمہارے سب سے اچھے ساتھی کو کیوں بھول گئی۔“ جیسے عندلیب کو کچھ یاد آیا۔

”کیا مطلب امی؟“

”مطلب یہ کہ…… ابھی بتاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر عندلیب بھیگی ہوئی اندر گئی اور کچھ لے کر واپس صحن میں آ گئی۔

”اوہ میرا لائف بوائے شیمپو…… امی یُو آر گریٹ۔“

اریبہ نے ماں کو چوم لیا۔

”لو اور موسم کو کھل کر انجوائے کرو۔ یاد ہے نا پچھلے مون سون میں تمہارے بالوں کا کیا حشر تھا اور اب۔“

عندلیب نے اریبہ کے گھنے، دراز بالوں کو

ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''اب یہ بال ہو گئے ہیں، بنگال کا جادو۔''

اریبہ نے قہقہہ لگایا۔

''نو...... بنگال کا نہیں، اب پاکستان کا جادو، لائف بوائے شیمپو...... بالوں کے سارے مسائل سے نجات دلائے۔ خشکی سکری کا جڑ سے خاتمہ کرے اور اپنی ملک پروٹین کی طاقت سے بالوں میں نئی زندگی اور قدرتی چمک واپس لائے۔''

''ارے بہو! لائف بوائے پھر سے لائف بوائے شیمپو کی شکل میں جیت گیا۔ دیکھ لو آج بٹیا مون سون میں کیسے مزے سے بنا کسی ڈر کے نہا کر موسم انجوائے کر رہی ہے۔''

دادی ماں نے دور سے ہی بہو اور پوتی کی بلائیں لیں۔

''اماں جان لائف بوائے شیمپو کی جیت نہیں ہے یہ...... یہ تو یقین اور بھروسے کی جیت ہے۔ یہی حقیقت ہے۔ سب دعوے کرتے ہیں مگر لائف بوائے شیمپو اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنے کام میں مگن رہتا ہے۔ یہ واحد شیمپو ہے جو مون سون کے اثرات سے بھی بالوں کی حفاظت کرتا ہے۔''

اب اریبہ بالوں کو لائف بوائے شیمپو سے تیز برستی بارش میں دھو رہی تھی۔

''امی...... میرا سپنا، میری خواہش لائف بوائے شیمپو نے پوری کر دی۔ سپنے حقیقت میں بدل دیے لائف بوائے شیمپو نے۔ میرے بال خوبصورت کر دیے لائف بوائے شیمپو نے۔''

اریبہ کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ کر عندلیب کو سرشار کر رہی تھی۔ عندلیب ساس کے پاس جا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''اماں لائف بوائے شیمپو کی جیت کا سہرا آپ کے سر جاتا ہے۔

آپ نے آج کے ٹریٹمنٹ کا کہہ کر لائف بوائے شیمپو ہی کو آخری حل کس طرح کہا تھا اماں!''

''بہو! کچھ چیزیں ٹریڈ مارک ہوتی ہیں۔ لائف بوائے بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔

لائف بوائے کی مصنوعات نمبر ون اپنے دیرپا اثر کی وجہ سے ہوئی ہیں۔

جب میری گڑیا کے بالوں کا مسئلہ سامنے آیا تو میں تو بہت پہلے سے تم سے لائف بوائے شیمپو کا کہتی مگر میں نے اس لیے نہیں کہا کہ تم بازار میں ملنے والے وقتی چمک دمک والے مہنگے شیمپو استعمال کر لو اگر بات نہ بنی تو پھر میں اپنے اعتماد کو آزماؤں گی۔ اور دیکھ لو...... نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔

لائف بوائے، نسلوں کا بھروسہ ہے اور یہ اعتماد بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ خدا کا شکر ہے لائف بوائے شیمپو پر بھروسہ کیا اور وہ بھروسے پر پورا اترا۔''

''ارے جس پر بھروسہ کیا وہی سب کچھ ہے اور جو تختہ مشق بنا وہ کچھ نہیں ہے۔'' اریبہ بھی دادی اور ماں کے قریب چلی آئی تھی۔

''جو تختہ مشق بنا وہی تو کامیاب بھی ٹھہرا۔''

عندلیب نے اریبہ کی ناک پکڑ کر محبت سے دبائی۔

''تھینک یو لائف بوائے شیمپو۔ تم نے مون سون کو اصل میں مون سون بنا دیا۔ بغیر کسی ڈر کے۔''

اب تینوں مل کر برسات انجوائے کر رہی تھیں۔ بادل پھر زور سے گرجا تھا۔

جیسے لائف بوائے شیمپو کی کامیابی پر وہ بھی خوشی میں قہقہہ مار کر ہنسا ہو۔

☆☆......☆☆

ناول

رفعت سراج

قسط 19

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کردیں گی' رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

دنیا میں بہت سے لوگ موت سے کم کسی حادثے، سانحے پر راضی ہی نہیں ہوتے...... ہوش میں ہی نہیں آتے...... جب تک ٹھسے سے چلتے پھرتے رہتے ہیں سمجھتے ہیں کہ موت دوسروں کے لیے ہے۔ وہ تو اسی طرح زمین کا سینہ چیر کر چلتے پھرتے رہیں گے۔

افشاں بانو آپا کے منہ سے چمن کا نام سن کر حق دق ہو کر ثمر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''یہ کیا ہو گیا...... یہ چمن پھر درمیان میں آ گئی...... وہ تو آج رات سے پہلے تک بغلیں بجا رہی تھی کہ جان چھوٹی منحوسوں سے...... اس منحوس گھڑی میں...... منحوس لوگ مبارک کیوں ہونے لگے؟'' ماں کی حالت نے اُسے پاگل سا بنایا ہوا تھا۔ پیاری ماں ریت کی طرح مٹھی سے پھسلتی نظر آ رہی تھی۔ ہمیشہ کی جدائی کے تصور سے اعصابی نظام تلپٹ ہو رہا تھا۔

''بھائی جلدی سے جا کر بھابی کو لے آئیں...... امی ہوش میں آ کر بھابی کو دیکھیں گی تو اُن کے ذہن پر اچھا اثر پڑے گا۔ Survive کرنے کے لیے سپورٹ ملے گی۔''

''بس آپ دیر نہ کریں...... جلدی سے بھابی کو لے آئیں۔'' ماں کی دوبارہ بیہوشی نے افشاں کو دیوانہ سا بنا دیا تھا۔

ثمر کو دریا کے پار اُتر کر ایک اور دریا کا سامنا تھا۔ ماؤف ذہن کے ساتھ، ایک ٹک افشاں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''بھائی جائیں نا...... دیر کیوں کر رہے ہیں؟'' نرسوں نے انہیں کمرہ چھوڑنے کا اشارہ کر دیا تھا اور بانو آپا کو ہوش میں لانے کے لیے تگ و دو کرنے لگی تھیں۔

''افشاں...... یہ Possible نہیں ہے۔'' ثمر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔

افشاں کے لیے تو اس وقت سب کچھ Possible تھا۔ اس کے سامنے تو ماں کی زندگی کا سوال تھا۔

''کیا مطلب......؟ مجھے پتہ ہے وہ ناراض ہو گی...... آپ ان کی منت خوشامد کیجیے...... اللہ کا واسطہ دیجیے...... اُن کو منانے کے لیے سب کچھ کیجیے...... بھائی میری امی کو بچا لیجیے۔'' یہ کہہ کر افشاں ثمر کے کندھے سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب وہ دونوں کاریڈور میں کھڑے ہوئے تھے۔

افشاں کے حساب سے تو اس کی ماں دنیا کی نمبر ایک دانشور عورت تھی۔ حکمت تو اس پر ختم تھی۔ اب جو بے ہوشی اور ہوش کے وقفے میں ماں کے منہ سے کچھ نکلا تو ضرور یہ ماں کے دل کی آواز اور ضمیر کا تجزیہ تھا۔ جس پر فوراً سے پیشتر عمل درآمد کرنا بہت ضروری تھا۔

یوں بھی قرآن انسان کی نفسیات کا بہت خوبصورت تجزیہ پیش کرتا ہے کہ جب انسان کی کشتی بھنور میں پھنستی ہے تو وہ بے اختیار اللہ کو پکارتا ہے اس وقت دنیا پس منظر میں چلی جاتی ہے اور انسان صرف اور صرف ایک نکتے پر مرتکز ہو جاتا ہے اللہ کے سوا اس کے ذہن میں کچھ اور نہیں رہتا۔ افشاں بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ چمن جس طرح سے جن حالات میں گئی ہے وہ ہمارے کہنے سے واپس نہیں آئے گی۔ ثمر نے منتشر ذہن کے ساتھ انسان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بھابی اب ایسی بھی نہیں ہیں...... جب اُن کو امی جان کی حالت کا پتہ چلے گا تو وہ کبھی انکار نہیں کریں گی۔'' انسان شدید غصے اور دکھ کی کیفیت میں ہی بھرپور سچ بولتا ہے۔

افشاں کی بات سن کر پورے پانچ سال کی زندگی جو چمن کے ساتھ گزری تھی۔ سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''وہ ایسی نہیں ہے...... پھر ایسا کیوں ہو گیا؟ ایک لاشعور میں چھپا ہوا احساس جرم یوں پھڑ پھڑایا...... جیسے پرندہ اُڑان بھرنے سے پہلے پر کھول کر پھڑ پھڑاتا ہے۔

''بھائی..... اس وقت..... بس امی جان کی طرف دیکھیے، سب کچھ بھول جائیں۔'' افشاں پھر رونے لگی۔

''بھول جاؤں.....!'' ثمر نے چونک کر خالی خالی آنکھوں سے افشاں کی طرف دیکھا جو گھمسان کا رن لڑ کر نڈھال ہوتے ہیں..... وہی تو سب کچھ یاد رکھتے ہیں اور یہ یادداشت تو ناسور کی طرح ہوتی ہے جو آخری سانس تک رِستا رہتا ہے۔

''نہیں افشاں..... میں ذلیل ہونے کے لیے اس دروازے پر نہیں جا سکتا، سوری.....'' معرکے میں لگنے والی پرانی چوٹیں، پرانے زخم درد کرنے لگے۔

''ایسا نہ کریں بھائی جان..... امی جان کے دل میں کچھ ہے ورنہ وہ کبھی بھابی کا نام لیتیں.....'' افشاں نے گویا اب منت کے انداز میں کہا تھا۔

ضمیر کے بوجھ اٹھانے والے..... بہت کمزور ہوتے ہیں ان میں حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ذرا سی اونچی آواز سے ڈر جاتے ہیں۔ پیروں میں پڑ جاتے ہیں۔ ہر وقت ذاتی پسند ناپسند کو اہمیت دینے والے ہٹ دھرم لوگ..... کمزور ترین لوگ ہوتے ہیں۔ کیونکہ اصل سے ہٹ کر زندگی گزارتے ہیں اور جو بھی اصول سے ہٹ جائے اسے بے چینیاں لاحق ہو جاتی ہیں۔

''افشاں..... افشاں..... تم نے تو بالکل ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے ہیں۔ امی جان کی حالت دیکھو..... جانے کس کیفیت میں اُن کے منہ سے نکل گیا اور تم لے کر ہی بیٹھ گئیں۔

''آرام سے ایک جگہ بیٹھ کر دعا کرو..... مجھے پوری امید ہے امی کی طبیعت بہت جلد سنبھل جائے گی۔'' ثمر نے تسلی و تشفی کے انداز میں افشاں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ افشاں نے ذرا سی دیر میں اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

''امی جان..... دیکھیے اس وقت سچویشن ہی ایسی تھی کہ بچیوں کو کسی نے تو سنبھالنا تھا..... مگر ایکچوئیلی بچیاں ذمہ داری تو یاور کی ہیں ناں..... اب نانا نانی یہ تو کبھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم نہیں سنبھال سکتے آ کر لے جاؤ.....'' ربیعہ جانے کون سی ڈش بنانے جا رہی تھیں ڈھیر ساری سبزیاں تھال میں رکھنے لگی فردوس سے باتیں کرنے.....

''تمہیں بہت شوق ہو رہا ہے بچے پالنے کا..... فردوس کی تو گویا دُم پر پاؤں پڑا تھا، کھولتے ہوئے لہو کو بمشکل حدوں پر روکا۔

''اللہ سے دعا کرو..... اللہ جلد تمہاری گود ہری کرے، اپنے بچے پالو..... ان کی خوشیاں مناؤ'' فردوس کو لہجے کی نرمی حاصل کرنے کے لیے بہت مشقت اٹھانا پڑ رہی تھی۔ اندر سے تھک مری.....

''امی جان میں تو اس خیال سے کہہ رہی تھی کہ دادا دادی پوتے پوتیوں سے دل و جان سے پیار کرتے ہیں۔ کہیں آپ میری وجہ سے.....''

''ارے..... مجھ میں اتنا دم نہیں کہ بچے سنبھالوں..... یہ تو میں جانوں یا میرا خدا میں کس طرح سے خود کو گھسیٹ رہی ہوں..... جانے کتنی رہ گئی ہے۔'' فردوس نے آخری جملہ اس کیفیت میں کہا کہ پتھر سے پتھر

دل بھی پگھل جائے۔

''بیٹا...... بچیاں نانا نانی کی عادی ہیں...... ماں تو اُن کی سدا کی بیمار تھی بچیاں زیادہ وہیں رہتی تھیں...... اب آئندہ بچیوں کے معاملے پر مجھ سے کوئی بات نہ کرنا......'' فردوس نے آئندہ کی پیش بندی کی مبادا بہو آئے روز اُن کا صبر آزمانے لگے۔

''ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں...... لیکن میں یاور کے ساتھ ان سے ملنے ضرور جایا کروں گی۔''

''تمہارا کتنا حرج ہو رہا ہے...... ارے تم اپنا گھر بار سنبھالو......'' فردوس کا دماغ چٹخنے لگا۔ وہم ہوا شاید بہو جان بوجھ کر ان کو چڑا رہی ہے۔

''حرج کی بات نہیں...... یاور باپ ہیں باپ کے ہوتے ہوئے وہ باپ سے کیوں محروم رہیں۔ کل کو بڑی ہوں گی تو یہی سمجھیں گی کہ دوسری ماں نے ان سے باپ چھین لیا تھا۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے انہیں باپ سے دور کیوں کیا جائے۔

ربعیہ بڑی سادگی سے بولتی چلی جا رہی تھی۔ سمجھدار ذمہ دار ماں باپ کی بیٹی تھی۔ روشن ضمیر اور حق سچ کی بات کو پسند کرتی تھی۔ اب اُسے کیا پتہ تھا کہ وہ انجانے میں فردوس کے دل پر حملے کر رہی ہے۔

''ارے...... توبہ کیا حال ہو گیا......'' فردوس نے اپنی پیشانی پر زور سے ہاتھ مارا۔

''کیا ہوا امی جان؟'' ربعیہ گھبرا گئی۔

''ارے صبح گولی کھانا بھول گئی تھی۔ تب ہی کہوں ٹانگیں کیوں اکڑ رہی ہیں۔'' فردوس پورا زور لگا کر اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں لے کر آؤں......؟'' ربعیہ نے اپنی خدمات پیش کیں۔

''ارے تم کہاں میری دوائیوں کے ڈبے میں ڈھونڈو گی...... پوری زنبیل ہے۔'' وہ یوں لنگڑا کر آگے بڑھی گویا پاؤں زمین پر رکھنا محال ہو۔

''ٹھیک ہے پھر میں ذرا اپنے روم کی صفائی کر لوں...... آپ ٹیبلیٹ لے کر تھوڑی دیر آرام کر لیجیے......'' ربعیہ نے بڑے ترحم آمیز انداز میں فردوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور بھاگنے کے انداز میں زینہ چڑھ گئی فردوس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر زینے کی طرف گھورا جس کے آخری سرے پر ربعیہ غائب ہوئی تھی۔

''توبہ...... یہ آج کل کی مکار چلتر لڑکیاں...... شوہر کو مٹھی میں کرنے کے لیے کتنے سوانگ رچاتی ہیں۔ تا کہ کل کو وہ ماں کی ایک نہ سنے کہ اس کی بیوی نیک پرہیز گار ہے۔ ماں نے ہی کچھ کیا ہوگا۔''

''سیدھے سیدھے چلے گی تو ٹھیک...... ورنہ میرا نام بھی فردوس ہے۔ نہ کبھی ہار مانی ہے نہ ہاری ہوں۔'' عزم صمیم نے لہو گرما دیا۔ لنگڑانا بھول کر پاؤں پٹختی اپنے بیڈروم کی طرف جا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

خالہ ٹینا کے گھر چلیں؟ چھوٹی مہ پارہ خوشامدانہ انداز میں چمن سے کہہ رہی تھی۔ میری جان روز روز کسی کے گھر تھوڑا ہی جاتے ہیں۔ چمن نے مہ پارہ کے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے اسے

بہلانے کی کوشش کی۔

''لیکن ٹینا نے تو کہا تھا کہ روز آنا..... We Are Friends.....'' دور بیٹھی مہ وش نے چمن کو مطلع کیا جو بڑے اہتمام سے اپنی گڑیا کے گیسو سنوار رہی تھی۔

''فرینڈز تو اسی طرح کہتے ہیں..... لیکن سب کی اپنی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔ اس طرح جب دل چاہے کسی کے گھر نہیں جاتے۔''

''تو آپ ان کو فون کر کے پوچھیں ناں.....؟'' ماہ پارہ نے ضد کے انداز میں کہا۔

''کیا پوچھوں؟'' چمن نے ایک سچ کے دوران بے ساختگی سے سوال کیا۔

''کہ ہم ان کے گھر آجائیں.....؟'' مہ پارہ نے جلدی سے کہا۔

''خالہ ٹینا بہت اچھی ہیں۔ وہ بہت بڑی ہیں..... مگر چھوٹی ہیں۔'' مہ وش نے اپنا خیال الفاظ میں پرونے کی کوشش کی۔

چمن کو بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔ بہت بڑی ہیں مگر چھوٹی ہیں۔ جملہ بہت مزیدار تھا۔

''آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟'' مہ وش کو حیرت ہوئی۔

مہ وش کا سوال چونکانے والا تھا۔ اسے یاد آیا وہ بہت دنوں سے کوشش کے باوجود ہنس نہیں پا رہی تھی۔ مسکرانا ہی ایک دم لگتا تھا۔ ہنسی تو بہت دور کی بات تھی۔

اس پر بیٹھے بیٹھے انکشاف ہوا وہ ہنس سکتی ہے۔ ہنسی کوئی بہت مہنگا سودا نہیں..... اور خوشی ایک انسان کی محتاج نہیں۔

''یہ تو ایک کیفیت کا نام ہے..... اور کیفیت روحانی اختیار ہے اور روح قید و سلاسل سے ماورا ہے۔ بہت دنوں بعد بے اختیار ہنسنا خود کو اچھا لگا۔ اس نے باری باری دونوں بچیوں کی طرف دیکھا جو اُس کی ہنسی کا بہانہ تھیں۔ فطرت کی عطاء، انمول تحفے، پیاری پیاری شکلیں، فرشتوں جیسی معصومیت..... کائنات کتنی بھرپور ہے۔ ہر شے متبادل صورت میں موجود ہے۔ یہ الگ بات کوئی ضد میں متبادل لینا ہی نہ چاہے۔

اس نے مہ پارہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس کی پیشانی چوم لی۔

''کتنی پیاری گڑیا ہے۔ آپ کی ڈول سے زیادہ اچھی میری ڈول ہے۔ اس نے اب اس کا گال چوم لیا۔ معصوم روح محبت کے بھرپور اظہار پر جھوم جھوم گئی۔

''میری خالہ بھی تو سب سے اچھی ہیں۔'' مہ پارہ نے اپنا سر چمن کی گود میں رکھ دیا پل بھر کو دل میں ایک لہر اٹھی اور معدوم ہو گئی۔

''محبت بہت ہی ضروری ہے تو یہ محبتیں کیا کم ہیں۔'' وہ سوچ رہی تھی یا شاید کوئی کسک مٹا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''یا اللہ کیا مصیبت ہے۔ ابھی سیل آف کیا ہوا ہے۔'' ندا نے جھنجلا کر سیل فون تکیے پر پٹخ دیا۔ نرگس نے محلے کے دو تین لڑکوں سے گھر کا پھیلاوا سمیٹنے کا کہہ دیا تھا۔ دریاں، چاندنیاں، دیگ گھر سے اٹھ چکی تھیں اب دو ماسیاں جھاڑ و پونچھا واش رومز کی دھلائی میں جتی ہوئی تھیں۔ جب سے وہ اٹھی تھی فون کر کے

ثمر کا بھی پوچھ چکی تھیں۔ گھر کا گیٹ بند رکھنے کی سخت تاکید بھی کی تھی۔ جب سے ندا نے انہیں گھر میں دس پندرہ تولہ سونا اور نقدی کی خبر دی تھی ان کی تو ذمہ داری میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔
آج کے زمانے میں کون اتنا مال متاع گھر میں رکھ کر بیٹھتا ہے۔ شبیر انکل تو خزانے پر ناگ بنے بیٹھے تھے مگر یہ ندا تو سدا کی لاپرواہ ہے۔
وہ چاہ رہی تھیں کہ ثمر ہاتھ لگے تو اس کے ساتھ بیٹھ کر بات کریں کہ اب وہ ندا کے ساتھ مل کر ان چیزوں کو سنبھالے۔ تاکہ وہ اپنے گھر میں سکون سے کام دھندے نمٹائیں۔
دن کے دو بجے بھی جب ندا کی طرف سے پتہ چلا کہ ثمر سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا تو اپنے کام ادھورے چھوڑ کر ندا کے پاس چلی آئیں جو شبیر حسین مرحوم کا وہ بوسیدہ سا شاپر لیے بیٹھی تھی جس میں مختلف مالیت کے نئے پرانے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ بہت اہتمام سے نوٹ سیدھے کر کے تکیے کے نیچے رکھتی جا رہی تھی۔
بیڈ روم کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ نرگس کے پاس ہمیشہ سے گھر کی ایک ایکسٹرا چابی ہوتی تھی تا کہ ندا کے اسکول، کالج، آفس جانے کے بعد شبیر حسین کو بار بار گیٹ کھولنے کے لیے اٹھنا نہ پڑے۔
وہ لاؤنج میں پہنچی تھیں کہ اندر کمرے کا نظارہ دیکھ کر سر ہی پیٹ لیا نوٹوں کا ڈھیر بیڈ پر پڑا تھا اور ندا ایک جیسے نوٹ چن چن کر سیدھے کر رہی تھی۔ ماسی باہر کا داخلی راستہ اور پورچ پائپ لگا کر شڑاپ شڑاپ دھو رہی تھی۔
''تھوڑی سی عقل کہیں سے اُدھار لے لو...... یا یہ سارے نوٹ اُٹھا کر اپنے ہاتھوں سے اس ماسی کو دے دو۔'' انہوں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر کے لاکڈ کر دیا۔
''کیا ہوا آنٹی؟'' ندا نے نرگس کے لہجے کی تبدیلی پر اظہارِ حیرت کیا۔
''ان ماسیوں کا کسی کو کچھ پتہ نہیں ہوتا...... کوئی تو اتنی ایماندار ہوتی ہے کہ گھر میں گولڈ کی چیز پڑی ملے تو ہاتھ پر لا کر رکھ دیتی ہے اور کوئی بلی کی طرح چوکس ہوتی ہے کہ موقع ملے اور ہاتھ دکھائے۔'' نرگس نے سمجھانے کے انداز میں اس کی لاپرواہی کو نشانہ بنایا۔
''آنٹی یہ تو بہت پرانی ہے...... بے چاری بہت اچھی ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔'' ندا نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔
''بیٹا انسانوں کو اتنے بھونڈے طریقے سے نہیں آزمانا چاہیے...... یہ بتاؤ کتنے گن لیے؟'' نرگس دروازہ مقفل ہونے کے بعد بہت سکون سے بات کر رہی تھیں۔
''اُف توبہ میں گن تھوڑا ہی رہی ہوں۔ ایک جیسے نوٹ الگ الگ کر رہی ہوں۔ یہ دیکھیں یہ گلے سڑے پرانے نوٹ...... دیکھ کر بھی گھن آ رہی ہے...... ان کو الگ کر رہی ہوں۔ دل چاہ رہا ہے ڈسٹ بن میں ڈال دوں۔'' ندا نے منہ بنا کر کہا۔
''ماشاء اللہ...... بہت ہری ہری سوجھ رہی ہے...... ذرا انہیں گنو تو سہی تین چار آٹے کی بوریاں آ جائیں گی۔'' نرگس نے ہزار، پانچ سو، سو، پچاس، بیس، دس کے مڑے تڑے پھٹے پرانے نوٹوں پر ایک نگاہ ڈال کر ان نوٹوں کی قدر و قیمت کا احساس دلایا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''تو پھر آپ لے جائیں...... غریبوں میں بانٹ دیجیے گا...... یہ دیکھیں نئے اور اچھی کنڈیشن کے بھی بہت سارے ہیں۔''

''بیٹا کچھ پڑھ کر نانا کی روح کو بخش دو...... کیوں ان کی روح کو تڑپا رہی ہو۔ برزخ میں بیٹھے بھی اپنے نوٹوں کے تھیلے کو یاد کر رہے ہوں گے۔'' نرگس نے ندا کے شاہانہ انداز پر گویا سر پیٹ کر کہا تھا۔

''اور یہ بتاؤ تمہارے میاں کی کوئی خبر ہے؟'' اب انہوں نے ثمر کا پوچھا۔ اسی مقصد کے لیے چل کر آئی تھیں۔

''اُف......'' ندا نے یوں اپنے سر پر ہاتھ مارا جیسے کہہ رہی ہو کہ کیا یاد دلا دیا۔

''آنٹی اُن کا سیل فون آف ہے۔ آفس فون کیا تو پتہ چلا وہ آفس ہی نہیں گئے۔ لگتا ہے اُن کی مدر کی حالت بہت سیریس ہے۔'' ندا نے آخری جملہ بہت تشویش کی کیفیت میں ادا کیا۔

''یہ تو تم وہ کہہ رہی ہو...... جو اس نے تم سے کہا ہے۔ اللہ جانے حقیقت کیا ہے۔ مجھے تو یونہی طرح طرح کے وہم آ رہے ہیں۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ سوچ سمجھ لو...... اس نے ابھی تک اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی ہے۔ بھئی جب اس کے ساتھ نہیں رہنا...... تو اسے چھوڑ دے، کیوں باندھ کر رکھا ہوا ہے۔''

''میں انہیں کہہ دوں گی تو وہ چھوڑ دیں گے...... اُن خاتون سے ثمر کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تو کہتے ہیں کاش میری پہلی اور آخری شادی تم ہی سے ہوتی...... میں تو بس پھنس گیا تھا۔'' ندا بہت اعتماد اور بے نیازی سے بولتی جا رہی تھی نرگس اُس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

''یا اللہ...... یہ کون سے زمانے کی لڑکی ہے۔ جو کہو فوراً آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی ہے۔''

''بیٹا...... اندھا بھروسہ بھی ٹھیک نہیں ہوتا...... اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ اُس پر شک کرو۔ مگر وہ پہلے سے شادی شدہ ہے بیوی کو طلاق نہیں دی ہوئی...... وہ اس کے نکاح میں ہے۔ وہ اس سے ملنے جائے تو کوئی اس سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ رات گزارنے چلا جائے تو تم اُسے روک نہیں سکتیں...... ماں بیمار ہے تو کیا ہوا دکھ بیماری تو سب کے ساتھ ہے۔ مگر تم سے رابطہ تو رکھے تم گھر میں اکیلی ہو اسے احساس ہونا چاہیے۔'' نرگس اس کا سویا دماغ جگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''آنٹی...... آپ ٹینشن نہ لیں، غصہ تو مجھے بھی بہت آ رہا ہے۔ مگر کیا کریں بے چاروں کی امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اور ہاں وہ اپنی پہلی بیوی کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ رات تو بہت لمبی ہوتی ہے وہ تو ان کے پاس ایک منٹ کے لیے بیٹھنا پسند نہ کریں۔'' نرگس بے بسی سے ندا کی شکل دیکھنے لگیں۔

''یقین واعتبار کو شک میں تبدیل کرنا تو بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔ کسی کے پُرسکون تالاب جیسے ذہن میں شک کا پتھر پھینکنا اور پھر اپنے ضمیر کو سمجھانا بہت بڑا معرکہ ہے۔

مگر تجربہ کار عورت ہونے کے ناتے اور ندا کی حماقتوں سے آگاہ کرنے کی وجہ سے مختلف قسم کے خیالات ستا رہے تھے۔ کل نانا سُسر کی تدفین ہوئی اور آج مکمل طور پر منظر سے غائب......

''اللہ کرے ثمر وہی ہو جو تم سمجھتی ہو...... میں تو بس ایک ہی بات سے کھٹکتی ہوں کہ جب اسے پہلی بیوی سے اتنی نفرت ہے تو اسے باندھا ہوا کیوں ہے؟''

''آنٹی میں کہہ رہی ہوں ناں...... میں کہوں گی تو وہ چھوڑ دیں گے۔ میں نے اس لیے نہیں کہا کہ کسی

عورت کو طلاق دلوانا بہت بری بات ہے۔'' ندا نے اپنی فطری ہمدردانہ خصلت کی وجہ سے بڑی بے نیازی سے کہا اور پھر نوٹ سیدھا کرنے لگی۔

''وہ کسی 'عورت' نہیں ہے......سوکن ہے تمہاری......''

''اچھا ناں وہ جو کوئی بھی ہیں...... مجھے تو کچھ نہیں کہہ رہیں۔ اگر کچھ کہا تو میں آپ سے شیئر کروں گی۔ ابھی آپ رہنے دیں۔ مجھے ثمر پر پورا ٹرسٹ ہے۔ آنٹی انہوں نے مجھ سے 'لو میرج' کی ہے۔ میں نے اُن سے ریکوسٹ نہیں کی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کریں۔'' ندا کے انداز میں نرگس کے اندیشوں سے کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ اب تو اِس نے باقاعدہ نرگس کو لاجواب کر کے رکھ دیا تھا۔

''اچھا بیٹا...... اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ سُکھی رہو اپنے گھر میں۔'' انہوں نے ندا کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ ندا نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

''مجھے پتہ ہے آپ مجھ سے سچا پیار کرتی ہیں۔ آپ کو میری بہت فکر رہتی ہے۔''

''اچھا اب تم بھی یہ کاروبار بڑھاؤ...... ماسی کو رخصت کر کے...... انہیں سنبھال کر رکھو۔ ثمر سے کہہ کر اپنا اکاؤنٹ کھلواؤ...... پیسے اور جیولری بنک میں رکھو۔ بیٹا اونٹ باندھ کر توکل کیا جاتا ہے...... آج کل کے حالات میں کیش، سونا گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں......'' نرگس نے اٹھتے ہوئے تاکید کی۔

''جی...... ٹھیک ہے ثمر آئیں گے تو میں کہہ دوں گی۔'' ندا نے مصروف انداز میں جلدی سے وعدہ کر لیا۔

''اور ہاں تم نے اپنے ماموں جان کو فون کر کے اطلاع دے دی تھی؟'' نرگس کو جاتے جاتے خیال آیا، رُک کر پوچھنے لگیں۔

''جی وہ تو کل ہی بتا دیا تھا...... آج صبح اُن کا فون بھی آیا تھا کہہ رہے تھے وہ ارسلان بھائی کو پاکستان

جانے کے لیے کہیں گے۔ ہوسکتا ہے ارسلان بھائی اسی مہینے آ بھی جائیں۔ ان کے انداز سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔'' ندا نے ایک سانس میں سب کچھ بتا دیا۔ اس کا دماغ نوٹوں کے ڈھیر میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ تو گویا دال میں کنکر چُن رہی تھی۔

''اب کیا کرنے آئیں گے...... جیتے جی تو باپ بیٹے نے مدتوں باپ کو صورت نہیں دکھائی۔ اب کیا یہاں آ کر دیواروں سے باتیں کریں گے۔'' نرگس حیران ہو کر کہہ رہی تھیں۔

''پتہ نہیں......اب ان کی مرضی......'' ندا نے اپنے فطری پھکڑ پن کے ساتھ جواب دیا۔

''انہیں پتہ ہے ناں کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔'' نرگس کا ذہن دوسری طرف کام کرنے لگا۔

''جی جی......انہیں یہ بھی پتہ ہے......'' ندا نے فوراً جواب دیا۔

نرگس اب نئی سوچ میں جا پڑی تھیں۔ دروازہ کھولتے ہوئے انہوں نے پلٹ کر ندا کی طرف دیکھا۔

''دروازہ لاک کرو۔''

''اوفوہ آنٹی......آپ تو کچھ زیادہ ہی ٹینشن لے رہی ہیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ندا اب آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھو......اور جو میں سمجھاتی ہوں اُس پر غور کیا کرو آ جائے تمہارے ماموں کا بیٹا......کلاس تو اُس کی بھی لوں گی۔'' نرگس باہر نکلتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''ہیں......؟ ارسلان بھائی کی کلاس لیں گی۔ ان بے چاروں نے کیا کیا ہے؟'' ندا حیران ہو کر سوچنے لگی۔

☆......☆......☆

بانو کو دوبارہ ہوش آ گیا تھا۔ ثمر اور افشاں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ ڈاکٹر نے یہ کہہ کر بانو آپا سے ملنے سے روک دیا کہ ابھی ان کا بات چیت کرنا مناسب نہیں اُن کا دماغ بری طرح متاثر ہے۔ دونوں پھر جا کر ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھ گئے کہ وہاں بیٹھ کر ماں کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ افشاں اب قدرے پُرسکون تھی۔ اب اس کا ذہن ہر طرف سے ہٹ کر دعا میں لگ گیا تھا۔ وہ تو شکر کر رہی تھی کہ چمن کی بات جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں ختم ہو گئی تھی۔

وہ بیگ سے تسبیح نکال کر ورد کرنے لگی۔ ثمر سر جھکائے گہری سوچ میں گم تھا معاً اسے ندا کا خیال آیا۔ ساتھ ہی یاد آیا کہ اس کا سیل فون کئی گھنٹوں سے آف ہے۔ اس نے افشاں کی طرف دیکھا وہ بڑی شد و مد سے ہل ہل کر کوئی تسبیح ورد کر رہی تھی۔

''افشاں......ایک منٹ میں ابھی آیا۔'' یہ کہہ کر وہ لاؤنج سے نکل کر باہر لان کی طرف بڑھا۔ ساتھ ہی اپنا سیل جیب سے نکال رہا تھا۔ چلتے چلتے ہی اُس نے سیل آن کیا۔ سیل آن ہوتے ہی دھڑا دھڑ لفافے گرنے لگے۔ اس نے فوراً InBox چیک کیا زیادہ میسجز سیلولر کمپنی کے تھے۔ ایک ندا کا تھا اس نے وہی کھولا، لکھا تھا۔

''آپ کہاں ہیں؟ گھر کب آئیں گے؟'' اس نے لان کے درمیان پہنچتے پہنچتے ندا کا نمبر ڈائل کر دیا تھا۔ دوسری رنگ پر کال ریسیو ہو گئی تھی۔

''ہیلو......السلام علیکم......'' ندا کی آواز میں بے تابی تھی۔

''وعلیکم السلام...... میں ابھی ہاسپٹل میں ہی ہوں ندا۔ پلیز ڈونٹ وری۔''

''اللہ...... آپ نے تو ڈرا کر ہی رکھ دیا ثمر...... فون کیوں آف کیا ہوا تھا؟ بندہ پریشانی میں دور بیٹھا ہو تو اسے اپنا فون تو آن رکھنا چاہیے۔ دوسرے کو طرح طرح کے وہم آتے ہیں۔ ٹینشن ہوتی ہے۔ میں کب سے ٹرائی کر رہی ہوں۔ آپ تو بس جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ میرا تو خیال ہی نہیں......'' وہ ایک تواتر سے بولتی جا رہی تھی۔ اس کے منہ میں 'اسٹاپ' لگانا ایک مرحلہ لگ رہا تھا۔

''ایک منٹ...... ایک منٹ...... میری بات سنو...... صبح جب امی جان کو تھوڑی دیر کے لیے ہوش آیا تو میں نے اپنے حساب سے تھوڑی دیر کے لیے سیل آف کر دیا تھا۔ پھر آن کرنا بھول گیا۔ سوری یار......'' ثمر نے اپنی بات کہہ کر ساتھ ہی معذرت کر لی تاکہ گلے شکووں کا سلسلہ بند ہو۔

''اچھا ٹھیک ہے...... یہ بتائیں امی جان کی طبیعت کیسی ہے؟'' ندا نے گویا اُس کی وضاحت و معذرت قبول کر لی۔

''ابھی ہوش میں آئی ہیں لیکن ڈاکٹر اُن سے ملنے نہیں دے رہے۔ شاید ان کو C.T اسکن کے لیے لیب لے جا رہے ہیں۔ بتا رہے ہیں اُن کے ذہن پر بہت زیادہ اثر ہے۔ شاید انہوں نے کسی بات کا گہرا اثر لیا ہے یا کافی Stress لیتی رہی ہیں۔'' ثمر اب پُرسکون انداز میں بات کر رہا تھا۔ کیونکہ اُسے اندر جانے کی جلدی نہیں تھی۔

''اوہ...... میں بھی امی جان کے لیے بہت دعائیں کر رہی ہوں...... آپ کی امی میری بھی تو امی ہیں۔ میری اپنی امی تو ہیں ہی نہیں...... اب یہی میری امی ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے میں اُن سے ملوں۔ اُن کی خوب خدمت کروں۔ مگر آپ...... چلیں ٹھیک ہے، جیسے آپ کہتے ہیں میں وہی کروں گی۔ آپ ظاہر ہے کسی وجہ سے ہی کہہ رہے ہوں گے۔'' ندا نے حسبِ عادت ایک ہی نشست میں بات نمٹا دی۔ اور سانس لینے کا عمل مکمل کیا۔

''تھینک یو ندا...... اس وقت مجھے سچ مچ تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔ یہ سب وقتی ہوتا ہے۔ انشاء اللہ امی جان بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ اور میں مناسب وقت دیکھ کر انہیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا آخر بتانا تو ہے ناں...... یہ کوئی چھپانے والی بات تو نہیں ہے۔''

ثمر کی بات میں ایک جادو تھا۔ ندا کی ساری بے چینیاں ہوا ہو گئیں۔

''جی مجھے پورا یقین ہے آپ پر بھی اور آپ کی محبت پر بھی......'' وہ کہہ رہی تھی۔

''محبت'' یہ محبت پھر درمیان میں آ گئی۔ کچھ یاد دلانے کے لیے اس حسین لفظ سے کتنا کھیلا تھا۔ کسی کو محبت کی تاروں سے بُن کر گلابی ریشم کا لباس پہنایا تھا۔ محبت کے بھرپور احساس کا مان دیا تھا اس کے گھر میں جب وہ چلتی تھی تو پاؤں کی آہٹ محبت کا ازلی رقص محسوس ہوتی تھی۔

اس کے دل سے محبت کے میٹھے سُر پھوٹتے اور اس کے دل میں اتر جاتے تھے۔ وہ مسکراتی تو لگتا اس نے محبت پر اندھا یقین کر لیا ہے۔ وہ قسم کھا سکتی ہے کہ اس نے محبت کے جوہر کا سراغ لگا لیا ہے۔

''ٹھیک ہے ندا...... میں تھوڑی دیر بعد فون کر کے تمہیں بتاتا ہوں کہ امی جان کی ایکچوئل کنڈیشن کیا ہے۔ اس نے آسمان پر اڑتے پرندوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر بہت کمزور آواز میں بات کی۔ چند سیکنڈ

میں ہی توانائیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ کوئی دھیان میں آیا اور وہ ٹوٹنے لگا۔

''او کے..... مگر سیل آف مت کیجیے گا۔ سائلینٹ پر کرلیں۔ کال ریسیو نہیں ہوتی تو مجھے بہت ٹینشن ہوتی ہے۔'' ندا نے تاکید اور مشورہ ایک ساتھ ہوا کے دوش پر روانہ کیا۔

''ٹھیک ہے خدا حافظ۔'' اس نے رابطہ منقطع کر کے اِدھر اُدھر دیکھا اور چونک پڑا۔ افشاں لشتم پشتم اُس کی طرف چلی آرہی تھی۔ اس نے افشاں کے قریب آنے کا انتظار نہیں کیا اور خود سرعت سے اُس کی طرف بڑھا۔

''کیا ہوا افشاں؟ خیریت ہے ناں......؟'' وہ پریشان ہو کر پوچھ رہا تھا۔ کیونکہ افشاں کے چہرے پر کسی خوش خبری کے تاثرات نہیں تھے۔

''اُف...... آپ یہاں ہیں...... میں اِدھر اُدھر تلاش کرتی یہاں تک پہنچی ہوں۔ امی جان اللہ کا شکر ہے کہ ہوش میں ہیں۔''

''تم اُن سے مل کر آرہی ہو؟'' ثمر نے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں...... ابھی اُن سے ملنے کی اجازت نہیں ملی۔ تھوڑی دیر پہلے سسٹر میرے پاس آئی تھی۔ وہ کہہ رہی ہے کہ آپ چمن کو بلالیں پیشنٹ بار بار اُن سے ملنے کی ضد کررہا ہے۔ ابھی انڈر آبزرویشن ہیں۔ امید ظاہر کررہے ہیں کہ ایک گھنٹے بعد ملاقات کی اجازت دے دیں گے۔'' افشاں پھولی پھولی سانسوں کے درمیان سب کچھ بتانے کی کوشش کررہی تھی۔

اوہ...... اچھے امکانات کے باوجود جیسے سر پر ریت کی بارش ہونے لگی ایک بار پھر غبارے سے ساری ہوا نکل گئی۔ وہ بے بسی کی کیفیت میں افشاں کی طرف دیکھنے لگا۔

''بھائی...... اب تو آپ جا کر بھابی کو لے آئیں۔ پتہ نہیں امی جان کے دل میں کیا ہے۔ وہ ہوش میں آتے ہی بھابی کو کیوں یاد کررہی ہیں۔ ہمیں اس وقت سب کچھ بھلا کر بس امی جان کا سوچنا ہے۔ پلیز آپ ابھی جا کر بھابی کو لے آئیں۔ منت خوشامد کرنا پڑے تو کرلیں۔ مجھے اپنی ماں چاہیے بھائی، میں امی جان کے بغیر مر جاؤں گی۔'' افشاں کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے، وہ حق دق کھڑا افشاں کی صورت دیکھ رہا تھا۔

''منت خوشامد...... وہ بھی اس احسان فراموش عورت کی جو قدم قدم پر اس کی مردانگی کا مذاق اڑانے لگی تھی؟''

اس کا دماغ اب بھونچال کی زد میں تھا۔ ذلت کے تلخ ترین ذائقے سے آشنا کرانے والی عورت کے جا کر پاؤں چھوئے کہ خدا کے لیے میری ماں کی خاطر واپس آجاؤ...... جتنا مرضی ذلیل کرو، تمہیں اجازت ہے، بھائی کیا سوچ رہے ہیں۔ جلدی کریں۔

''میں چاہتی ہوں جب ہم امی جان سے ملنے اندر جائیں تو بھابی ہمارے ساتھ ہوں۔ اس سے امی جان کے دماغ پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ وہ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں گی، آپ دیکھیے گا۔''

جذبہ جگانے کے لیے افشاں پوری زور آزمائی کررہی تھی۔ اس وقت ماں کے علاوہ اس کے ذہن میں اور کچھ نہیں تھا۔

دنیا میں کس جگہ
دوشیزہ
کے چرچے نہیں
آپ دوشیزہ کے خریدار بن کر ملک کو
زرِ مبادلہ بھیجیے
اندرون ملک =/890 روپے
ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے
زرِ سالانہ
کویت 55امریکی ڈالرز
ایران 55امریکی ڈالرز
سعودی عرب 55امریکی ڈالرز
سری لنکا 55امریکی ڈالرز
یو اے ای 55امریکی ڈالرز
جاپان 55امریکی ڈالرز
مصر 55امریکی ڈالرز
لیبیا 55امریکی ڈالرز
یونان 55امریکی ڈالرز
ڈنمارک 55امریکی ڈالرز
فرانس 55امریکی ڈالرز
جرمنی 55امریکی ڈالرز
برطانیہ 55امریکی ڈالرز
ہالینڈ 55امریکی ڈالرز
ناروے 55امریکی ڈالرز
پولینڈ 55امریکی ڈالرز
امریکہ 65امریکی ڈالرز
کینیڈا 65امریکی ڈالرز
افریقہ 65امریکی ڈالرز
آسٹریلیا 65امریکی ڈالرز
آج ہی رابطہ کیجیے
88-C II ۔فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

''افشاں...... پیشنٹ سیریس کنڈیشن میں مختلف Phases سے گزرتا ہے امی جان کی طبیعت مزید بہتر ہوگی تو وہ اس طرح کی باتیں نہیں کریں گی۔'' اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ امی جان کی خاطر یہ بھی نہیں کر سکتے...... دوسری طرف دیکھ کر بھی سوچیے اگر ہم اپنی ماں کی خواہش پوری نہ کرسکے اور خدانخواستہ...... اللہ نہ کرے اللہ نہ کرے کچھ ہو جاتا ہے تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کرسکوں گی۔'' افشاں کی آواز میں پھر رقت اترنے لگی۔

''تو پھر ایسا کرو...... ثمر کے انداز سے لگا وہ کوئی صائب مشورہ دینے جا رہا ہے۔

''جی...... جلدی سے بتائیں کیا کروں؟'' افشاں کی بے تابی دیدنی تھی۔

''تم جا کر اُسے لے آؤ'' ثمر نے بولتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ یوں لگا آسمان شیشے کا بنا ہوا تھا۔ ایک دم چٹخ گیا اور شیشے کے ٹکڑے بارش بن کر برسنے لگے۔

''اُسے'' ...... اُف...... نام زبان پر لانا محال تھا۔ جیسے نام لے لیا تو اپنی شکست کا اعتراف اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دینا پڑے گا۔

''میں...... میرے کہنے سے وہ آجائیں گی۔'' افشاں تذبذب کا شکار ہونے لگی۔

''تمہارے کہنے سے چٹان سرک گئی ہے، شاید تمہارے آنسو تمہیں الفاظ کی محتاجگی سے بچالیں۔''

''لکھ کر رکھ لو...... میرے کہنے سے وہ نہیں آئے گی۔ اس لیے کہ وہ آ بھی گئی تو اسے واپس جانا ہوگا۔'' ثمر نے یہ کہہ کر رخ موڑ لیا۔ افشاں اُلجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''امی جان کی طرح آپ بھی بہت کچھ بھلانے کی کوشش کیجیے گا۔ شاید قسمت میں یہی لکھا ہے۔ افشاں کو اپنی غرض سے سروکار تھا۔ وہ کھلے ذہن سے سوچنے کے قابل نہیں تھی۔

''اگر وہ آ گئی تو میں اس کے اس احسان کا شکریہ ضرور ادا کروں گا مگر اب ہمارے راستے ہمیشہ کے لیے الگ ہو چکے ہیں۔'' ثمر نے افشاں کو مزید خوش فہمی سے بچانے کی کوشش کی۔

''اب ایسے تو نہ کہیں بھائی جان...... یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو ہمیں صرف اپنی ماں کے بارے میں سوچنا ہے۔'' افشاں کے انداز میں منت تھی۔ وہ چمن کے مشورے پر عمل درآمد کرنے کے لیے سرتاپا تیار ہو چکی تھی۔

''ٹھیک ہے پھر میں جاتی ہوں...... جب تک واپس آؤں انشاء اللہ امی جان سے بات کرنے کی اجازت بھی مل جائے گی۔''

افشاں امید کی کرن پاتے ہی پُر جوش نظر آنے لگی تھی۔ ثمر جواب میں بالکل خاموش تھا۔ افشاں جانے کے لیے بڑی سرعت سے پلٹ گئی تھی۔ وہ جاتی ہوئی افشاں پر نظر جما کر سوچ رہا تھا۔

یہ دن بھی دیکھنا تھا۔

☆......☆......☆

مہ وش و مہ پارہ کو اس نے شاور دلا کر، لنچ کرا کر سُلا دیا تھا۔ خود ظہر کی نماز پڑھ کر درود شریف کی تسبیح کر رہی تھی۔ عطیہ بیگم بھی مشکور احمد کو دوپہر کا کھانا دے کر میڈیسن کھلا کر آرام کر رہی تھیں۔

چاروں اور سکوت طاری تھا درود پڑھتے ہوئے ایک لطف کی کیفیت طاری ہو رہی تھی یوں محسوس ہو رہا

تھا چاروں طرف سے اسے روپہلی کرنوں نے اپنے حصار میں لیا ہوا ہے۔ ایک جذب کی کیفیت دھیرے دھیرے مستحکم ہورہی تھی۔ ایک ناقابلِ بیان طمانیت روح میں اُتر رہی تھی۔

مگر ماحول میں گونجنے والی کال بیل نے اسے پھر زمان ومکان کی چٹیل سطح پر لا پٹخا...... وہ تسبیح ہاتھ میں لیے لیے گیٹ تک آئی۔ درود ابھی بھی زبان پر جاری تھا۔ وہ اس بری طرح چونکی تھی کہ دھیان ہی نہیں رہا کہ انٹر کام پر ہی پتہ کرلے کہ کون آیا ہے۔

''کون ہے؟'' اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''بھابی ...... میں...... افشاں......'' چمن کو اپنی سماعتوں پر اعتبار نہ آیا۔ اسے یوں لگا وہ کسی گہرے دھیان کے دباؤ میں ہے۔

''افشاں......؟'' بالآخر اس نے تصدیق چاہی۔

''جی بھابی...... پلیز گیٹ کھولیے۔'' افشاں کے انداز میں عجلت و بے صبری تھی۔ چمن نے ایک پل کی تاخیر کے بغیر گیٹ وا کردیا۔ واقعی سامنے افشاں کھڑی تھی۔ چمن خود کو خواب کے عالم میں محسوس کرنے لگی۔

''افشاں...... تم اس وقت...... اتنی شدید گرمی میں...... خیریت تو ہے ناں؟'' چمن کو اس کے انداز بہت مختلف اور غیر معمولی محسوس ہورہے تھے۔ اس نے جھٹ افشاں کو اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

افشاں اندر آئی اور چمن نے گیٹ بند کردیا پلٹی تو افشاں بے اختیار اس کے گلے لگ گئی۔

''بھابی یہیں کھڑے کھڑے سب کچھ بھلا دیں۔'' اس کے آنسو دیکھ کر چمن کو طرح طرح کے وہم ستانے لگے۔ دھیان فوراً ثمر کی طرف گیا۔

''اچھا...... اچھا...... آؤ...... اندر آرام سے بیٹھو...... پانی وانی پیو......'' اس نے افشاں کو کندھوں سے تھام کر اندر کی طرف قدم بڑھائے، افشاں سر جھکائے مجرموں کی طرح چل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اپنے آنسو بھی پونچھتی جاتی تھی۔ چمن گردن موڑ کر بہت تشویش سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کو لاؤنج میں لے کر آئی۔ اسپلٹ اور فین دونوں ساتھ چلا دیے۔

''بیٹھو...... میں تمہارے لیے پانی لاتی ہوں۔'' وہ اس کی سنے بغیر تیزی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

مقام حیرت پر دماغ منجمد ہورہا تھا۔ رہ رہ کر خیال ثمر کی طرف اڑان بھرتا تھا۔

ڈسپنسر سے گلاس بھرا اور اسی طرح سرعت سے افشاں کے پاس آئی۔ افشاں کو سچ مچ بہت پیاس لگ رہی تھی اس ذرا توقف نہیں کیا جھٹ چمن کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ آدھا گلاس پی کر سانس لیا پھر ہونٹوں سے لگا کر خالی کردیا۔ اور خالی گلاس چمن کی طرف بڑھایا جو بہت غور سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

''اور لاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

تھوڑی دیر بعد پہلے آپ میرے پاس بیٹھ کر میری بات سن لیں۔'' افشاں نے بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ چمن نے گلاس ٹیبل پر رکھا اور افشاں کی طرف دیکھنے لگی۔

''بھابی...... امی جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ ہاسپٹلائزڈ ہیں۔''

''اوہ......'' چمن کو سن کر واقعی دھچکا لگا۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ سنجیدہ ہوکر پوری طرح مرتکز ہوگئی۔

''ابھی کچھ نہیں پتہ چل رہا...... گھر میں بے ہوش ہوگئی تھیں۔ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونے کے بعد ذرا دیر کو ہوش آیا تو آپ کا نام لینے لگیں۔'' افشاں کی آواز پر رقت طاری ہونے لگی۔

''میرا نام......؟'' چمن حیرت زدہ ہو کر افشاں کا منہ تکنے لگی۔ یہ کیسی انہونی سی بات سن رہی تھی وہ......

''جی...... کہنے لگیں چمن کو بلاؤ۔'' افشاں نے مزید کہا۔ چمن کو نئے سرے سے حیرانی سے آلیا۔

''مجھے بلا رہی ہیں...... تم سے کہا؟''

''جی...... جی...... میں اور بھائی اُن کے پاس ہی تھے۔''

''بھائی......'' لفظ بھائی نے نئی کیفیات سے پرے دھکیل دیا۔

''امی جان مجھے بلا رہی ہیں...... اور لینے افشاں آئی ہے۔'' دل کو کچھ ہوا اُس نے رُکی ہوئی سانس سینے سے آزاد کی۔

''جس طرح کی سچویشن تم بتا رہی ہو...... اس میں تو کوئی پتھر سے پتھر دل بھی انکار نہیں کر سکتا...... مگر......'' وہ جھجک کر رُک گئی۔

''اگر مگر کچھ نہیں بھابی...... میں آپ کو لینے آئی ہوں۔ اپنی ماں کی زندگی کی خاطر مجھے جو کرنا پڑا کروں گی۔ وہ بار بار بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ خدانخواستہ اندر کوئی گڑبڑ ہے۔ بھابی ماشاءاللہ آپ کے تو ماں باپ دونوں ہیں۔ میری تو صرف ماں ہے...... انہی سے میرا میکہ ہے۔''

''میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں آپ کو کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' افشاں نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

چمن اس عاجزی کے مظاہرے کی تاب نہیں لاسکی۔ تھرا کر رہ گئی۔

''افشاں اس طرح نہ کرو...... ایسے موقع پر تو اپنی طرف سے کچھ اچھا ہی کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ تم بیٹھو...... میں امی کو بتا کر آتی ہوں۔'' چمن اپنی فطرت کے حساب سے کسی سے ناک سے لکیر کھینچنے کی فرمائش نہیں کر سکتی تھی۔ سب کچھ بھلا کر تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔

یہی افشاں جس نے مدتوں اس سے مسکرا کر بات نہیں کی تھی۔ اب اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ آنسو بہا رہی تھی۔

''بھابی جلدی کریں...... آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ میرا ذہن تو بس امی کی طرف لگا ہوا ہے۔'' افشاں کی ذہنی حالت بہت مخدوش تھی وہ باقاعدہ گڑگڑا رہی تھی۔

''یہی ہوتا ہے...... بے اصولی اور حق سے منہ موڑ کر چلنے والے جب منہ کے بل گرتے ہیں تو عاجزی کی انتہا کر دیتے ہیں۔ گھبرا جاتے ہیں حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہوتی...... دل کا اندھیرا دعاؤں کو حجاب میں لپیٹ دیتا ہے۔ خود کو بہت تنہا اور بے بس محسوس کرتے ہیں...... غیبی مدد کی تھپکی سے محروم ہوتے ہیں۔

چمن بڑے عجلت کے انداز میں عطیہ بیگم کے بیڈروم کی طرف بڑھی تھی۔ افشاں اپنی ریسٹ واچ پر سیکنڈ کی سوئی پر نظر جما کر بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر نے فیملی کے ایک فرد کو پیشنٹ سے ملنے کی اجازت دے دی تھی۔ افشاں اتفاق سے نہیں تھی وہ ہوتی تو پہلے اسے بھیجتا۔

اجازت ملتے ہی ثمر جیسے دوڑتا ہوا ماں کے پاس آیا تھا۔

بانو آپا کی آنکھیں بند تھیں۔ دائیں آنکھ کے کنارے پر ایک آنسو ٹھہر گیا۔ چہرے کی ساری رعونت، کرختگی بے بسی میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ثمر نے آہستہ سے ماں کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

بانو آپا نے آہستگی سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ بیٹے کا چہرہ دیکھ کر توانائی کی تخلیق عمل میں آنے لگی۔

انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی۔ جیسے کوئی بھاری پتھر اٹھا رہی ہوں۔ ثمر نے جلدی سے اُن کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

''کیسی طبیعت ہے امی جان؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔ بانو آپا نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... آپ گھبرائیں نہیں...... انشاء اللہ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔'' اس نے دل و جان سے ماں پر فدا ہوتے ہوئے تسلی دی۔ بانو آپا نے نظریں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا، کمرہ خالی تھا۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

''اف...... اف......'' انہوں نے افشاں کا نام لینے کے لیے زور لگایا۔

''افشاں...... امی جان...... وہ اِدھر ہی ہے۔ شاید نماز پڑھ رہی ہے۔ بس ابھی آ جائے گی۔'' ثمر نے چمن کی بابت اپنی طرف سے بات شروع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دل کو یقین ہی نہیں تھا کہ چمن افشاں کے ساتھ یہاں آنے پر رضا مند ہو جائے گی۔ اسی لاشعوری خوف کی وجہ سے تو اس نے چمن کے پاس جانے کی ہمت نہیں کی۔ اس کے حساب سے تو چمن سے رجوع کرنا ذلت کے تابوت پر آخری کیل ٹھونکنا تھا۔

ثمر کا جواب سن کر بانو آپا نے پھر آنکھیں موند لی تھیں۔ دونوں طرف گہری خاموشی طاری ہو گئی۔

افشاں کو سمجھایا بھی تھا کہ امی جان نے بے خبری میں چمن سے ملنے کی بات کی ہو گی۔ ابھی دیکھو امی جان نے چمن کا نام بھی نہیں لیا اور افشاں کا انتظار کرنے لگیں۔ ثمر کو سخت کوفت کا سامنا تھا۔ مفت کا احسان لینے نکل پڑی۔ اب اسے افشاں پر غصہ آنے لگا۔ اگر وہ آ گئی تو فضول کے کام بڑھ جائیں گے۔ اُس کے آنے نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ اندر ہی اندر افشاں کی جذباتیت پر پیچ و تاب کھانے لگا۔

''چمن کو فو...... فو...... فون...... ک...... ی...... یا......'' بانو آپا کی مہین کمزور آواز نے دھماکہ کر دیا تھا۔

اس نے بدحواس ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ افشاں کو کسی طرح فون کر کے منع کر دے...... سر توجھکا مگر کچھ تو بچت ہو جائے گی۔

''جی...... جی...... کر دیا تھا...... امی جان...... میرا خیال ہے وہ راستے میں ہو گی۔'' ثمر بے سوچے سمجھے بول گیا تھا۔ بول کر دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

''اگر وہ نہ آئی...... کیا اسے ہاتھ پاؤں جوڑ کر لانا پڑے گا۔''

''آخر ایسا کیا ہوا...... کہ امی کو چمن یاد آ رہی ہے۔ اس نے تو امی جان کی بھی ٹھیک ٹھاک انسلٹ کی تھی۔ جادو ٹونے کرنے کے الزامات لگائے تھے۔''

''میں...... میں......'' بانو آپا نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''جی...... جی...... امی جان بولیے......'' ثمر سرتاپا سماعت بن گیا۔ اور اپنا بایاں کان ماں کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔

''میں...... نہیں بچوں گی......'' بانو آپا نے اٹک اٹک کر بمشکل کہا۔

''اللہ نہ کرے امی جان...... جب ہم انسان بہت زیادہ بیمار ہوتے ہیں تو قدرتی طور پر اس طرح کے خیالات آ جاتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ بہت جلد اچھی ہو جائیں گی۔ ڈاکٹر پوری طرح پُر امید ہیں۔ آپ کی رپورٹس بھی کلیئر ہیں۔ کوئی خاص پرابلم نہیں...... وہ ذرا سا شوگر لیول ہائی ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ امپروومنٹ ہو رہا ہے۔'' وہ ماں کو مایوسی کے اندھیروں سے نکالنے کی سعی کرنے لگا۔

☆......☆......☆

عطیہ بیگم تو سنتے ہی غصے سے کانپنے لگی تھیں۔

''میری بیٹی کا تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ جب چاہا پرانے سامان کی طرح باہر پھینک دیا۔ جب مطلب پڑا تو سر پر بٹھا لیا۔ کوئی ضرورت نہیں جانے کی...... موت زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

''خود اب بھی نہیں آیا...... بہن کو بھیج دیا۔ تاکہ مشکل سے نکل جائیں تو پھر ذلیل کریں......'' وہ درحقیقت ہتھے سے اکھڑ گئی تھیں۔

چمن کے لیے اُن کا ردِعمل متوقع تھا کہ وہ اُس کی ماں تھیں۔ مشکور احمد اپنی فطرت کے حساب سے بہت سکون سے دونوں طرف کی سن رہے تھے۔ عطیہ بیگم دل کی بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر آواز دھیمی رکھیں۔ کوئی پریشان حال آپ کے گھر چل کر آیا ہے۔ انہوں نے بڑی متانت سے بیوی کی جذباتیت پر گرفت کی۔

''ہم بھی پریشان حال ہیں...... ہماری شادی شدہ بے قصور بیٹی ہماری دہلیز پر آ کر بیٹھ گئی ہے۔'' عطیہ بیگم پھر پھٹ پڑیں۔ مگر اس مرتبہ آواز خاصی نیچی تھی۔ گویا بڑبڑا رہی ہوں۔

ایمان کے بعد سب سے بڑی دولت صحت ہے۔ الحمدللہ...... ہم اس وقت ان سے بہتر حالت میں ہیں۔ چل پھر سکتے ہیں۔'' مشکور احمد نے اسی طرح بڑے حلم سے جواب دیا۔

''مشکور صاحب...... بس کر دیں...... آپ کی اسی نرمی و درگزر سے لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔'' عطیہ بیگم نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے

''فائدہ اٹھاتے ہیں...... نقصان تو نہیں اٹھاتے...... تم نے اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث نہیں سنی؟''

''خیر الناس من ینفع الناس''

''تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جس سے اللہ کے بندوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔'' عطیہ بیگم کے سارے ہتھیار ٹوٹ گئے۔

چمن جو جانے کے لیے سو فیصد آمادہ تھی اور ماں کو قائل کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی

تھی۔ اُس کی مشکل باپ نے آسان کر دی۔

''ٹھیک ہے بیٹا...... اللہ ہمارے دشمنوں کو ہدایت دے، چلی جاؤ، سن لو...... کیا سنانا چاہ رہی ہیں۔'' یہ کہہ کر افشاں سے ملنے کے بجائے واش روم کی طرف بڑھ گئیں۔

''چلو بیٹا...... اللہ مالک ہے...... میں ذرا اس بچی کے سر پر ہاتھ رکھ دوں جو اِس وقت پریشانی کے عالم میں ہمارے گھر آئی ہے۔'' مشکور احمد اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

☆......☆......☆

جیب میں پڑا موبائل مسلسل مرتعش ہو رہا تھا۔ گمان غالب تھا کہ ندا ہی کوشش کر رہی ہوگی...... افشاں کو ناکامی یا کامیابی دونوں صورتوں میں فون کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

بانو آپا کے پاس سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا کہ بیٹی بیٹا دونوں کو غائب پا کر اُن کے اعصاب پر دباؤ بڑھے گا، پریشان ہو جائیں گی۔

''میں نے دیکھا...... چمن بالکل چھوٹی سی بچی ہے۔'' اچانک بانو آپا کی دھیمی کمزور آواز نے سکوت توڑا۔ اس طرح سے گویا ہوئیں کہ ایک ایک لفظ گنا جا سکتا تھا۔ ثمر حیران و پریشان اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

بانو آپا نے بھی ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھول کر ثمر کی طرف دیکھا۔ پھر دوبارہ آنکھیں موند لیں...... ثمر نے آگے بولنے کی فرمائش نہیں کی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بانو آپا کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ کب کی بات کر رہی ہیں۔

''اُس کی فراک کی جھولی پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ پہاڑوں پر اچھل رہی تھی...... بہت خوش تھی...... ہرے ہرے پہاڑوں کے بیچ بہت خوش تھی۔''

''میں پیاس سے مر رہی تھی......'' بانو آپا نے رُک کر گہری سانس لی۔

''پانی...... پانی کر کے چیخ رہی تھی۔''

اتنا کہہ کر بانو آپا تھک کر رک گئیں۔ گہری گہری سانسیں لینے لگیں۔

''امی جان آپ زیادہ بات نہ کریں...... آپ کی سانس پھول رہی ہے۔'' ثمر نے گھبرا کر ٹوکا۔

بانو آپا...... ایک الگ ہی کیفیت میں تھیں اُن پر ثمر کے ٹوکنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

''وہ میرے لیے دودھ جیسے سفید گلاس میں پانی لائی...... میں نے پانی پیا...... ایسا ٹھنڈا...... ذائقے دار...... پ...... پا...... نی......'' اسی وقت آہستگی سے دروازہ کھلا۔ نرس اندر آئی۔

''پلیز...... آپ باہر تشریف لے جائیں۔ پیشنٹ کا زیادہ بولنا ٹھیک نہیں...... احتیاط کیجیے۔''

بانو آپا نے نرس کی بات سُن کر گھبرا کر اپنا ہاتھ ثمر کی طرف بڑھایا گویا اُسے جانے سے روک رہی ہوں۔

''امی جان...... بس میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔'' اس نے ماں کی پیشانی پر بوسہ دیا اور فوراً روم سے باہر آ گیا۔ ذہن ابھی تک بانو آپا کے الفاظ میں اٹکا ہوا تھا اور اسی لمحے اُس کی نظر افشاں اور چمن پر پڑی تھی جو کاریڈور کے سرے پر تھیں۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

محبت کے راستے دل سے ہو کے گزرتے ہیں، یہ سارے رستے ہمیں، ہمارا رب جو دکھاتا ہے، اس کے حصول کے لیے، کسی کالج یا یونیورسٹی میں جانے کی بھاری فیس بھی ادا کرنی نہیں پڑتی۔ اس شام امی کو گھر سے نکلتے دیکھا، اور اس نے شانی پھوپھو......

سامعہ احمد، بہت خوبصورت تو نہ تھی۔ بس اس کی آنکھیں خوابیدہ تھیں، شاید وہی چمک اس کے چہرے کو اجالتی، اور پرکشش رکھتی تھی۔ کیا کبھی آپ کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ کبھی تو ہوا ہوگا ناں۔ ہزار چہروں کے درمیان، کبھی کبھی دو آنکھیں آپ کو متحیر کر دیتی ہیں۔ بھولتی ہی نہیں ہیں۔ مسکراتی ہیں، باتیں کرتی ہیں، بہت سی ناپسندیدہ آوازوں میں بولتی مسکراتی۔ اندر تک کھوجتی آنکھیں۔

سامعہ احمد کی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں شاید، تبھی تو وہ قریب سے گزرتے ہوئے جب جب اسے نظر انداز کرتی، وہ اس قدر ہی اس کی نظر اتارتی، یہ اس کے دوستوں کا خیال تھا۔ وہ جتنا اسے اپنی نظروں کے حصار میں رکھنا چاہتا ہے۔ وہ نظر چرا لیتی۔ نظر پھیر لیا کرتی، اور تو اور کبھی کبھی دنوں نظر نہ آتی، وہ اس کی تلاش میں دربدر ہونے لگتا، دل سے دل کو راہ ہوتی ہے، یہ سب اسے جھوٹ لگنے لگتا۔ کالج لائف گزرنے کے بعد وہ اسے کبھی نہ ملی، ملتی بھی کیسے، نہ اس نے دوستی کی، نہ ہی سمیر نے دل کا حال بتایا۔

اب جبکہ وہ ایک کامیاب زندگی گزار رہا تھا امی کی اچانک ڈیتھ کے بعد بھابی جان نے دیورانی لانے کی فرمائش کے ساتھ، سمیر کی پسند پوچھی تو محترمہ سامعہ احمد دل کے کمرے میں دھرنا ڈال کے بیٹھ گئیں، اور اب جانے کا نام نہیں لیتیں، سمیر کو بھی خدشہ تھا کہ اب راہ فرار نہیں ملے گی۔

بہت تلاشنے کے بعد یہ خوش قسمتی ہی تو تھی کہ اس ایک بہت اچھی دوست بنیش جو اس کی بھی تو دوست تھی اسے face Book پہ مل گئی۔ اور پھر ایک عرصے بعد وہ بھی نظر آ گئی، لیکن وہ تو اب پاکستان میں نہیں تھی تھی۔ ستارہ آنکھیں اسی طرح روشن تھیں، لیکن سمیر کی راہ میں تو دور دور تک کوئی جگنو نہ تھا جو اس کی راہ روشن کرتا، قصور اس کا بھی کب تھا، بھلا A,level کے دوران اس میں کہاں ہمت تھی کہ امی سے یہ بات کر پاتا، اور وہ دور دیس جا چکی تھی یہ جان کر، اس رات وہ نہ رو سکا اور نہ ہی سو سکا۔ ہاں اس رات اس کے اندر کا تخلیق کار جاگتا رہا۔ لفظ اشک بن کے اس کی ڈائری میں محفوظ ہوتے گئے، وہ بھی تو بے قصور تھی، اس نے بھلا اس سے کچھ کہا ہی کب تھا، اور وہ تتلی جیسا مزاج رکھنے والی سامعہ احمد بس نام ہی کی سامع تھی۔ اس سے کچھ بھی کہنا آسان کب تھا، سمیر نے پہلی بار

شاید فجر کی نماز خود اٹھ کے پڑھی اور اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی پناہ میں دے دیا۔

کچھ شعر پہلی بار ڈائری میں لکھ کر، تاریخ بھی ڈالی، دعا کی طاقت کو بے بس انسان ہی تو جانتا ہے۔ اس نے سجدے میں جا کے دعا کے پھول رخصت کر دیے۔

ہاں یہ شعر بھی تو ہو گئے تھے ناں اس رات۔

میں نے جس رات تم کو کھویا تھا
اس کی صبح میں تم کو پایا ہے
دل کو پھر دیر تک ملال رہا
کس خوشی سے تمہیں گنوایا ہے

سمیر نے پھر خود کو کتابوں میں گم کر لیا۔ وقت کو تو جیسے پر ہی لگ گئے تھے۔ لمحے وقت کے ہاتھوں میں روئی کے گالے بن بن کے اڑتے جا رہے تھے۔

بند دروازے بھی بہت شور کرتے ہیں، لیکن ان کا شور ہر کسی کو سنائی نہیں دیتا۔ ایسا اوپر والا بھی کرتا ہے، سب کے لیے نہیں، کسی کسی کے لیے۔ تو کیا مجھے پھر سے دستک دینی چاہیے۔ پھر سے۔ دبی دبی ہنسی، لیکن بے حد پر اسرار۔ چاروں طرف صرف آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ تم دستک کیسے دے سکتی ہو۔ کیسے دو گی دستک۔ کبھی سوچا ہی نہیں ناں۔ پر اسرار ہنسی کی آوازیں۔ نہیں دے پاؤ گی کوئی بھی دستک۔ تمہارے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں۔ نہیں ہیں تمہارے وہ ہاتھ، جس سے دستک دیتے ہیں۔ نہیں ہیں ناں وہ ہاتھ!!!!!

سامعہ نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھا۔ سرخ نیل کلر سے سجے گداز ہاتھ سلامت تھے، رات دیر تک وہ اسٹڈی کرتی رہی تھی

،کافی دیر تک جاگتے رہنے کے بعد آنکھ لگی تھی۔ ایسا خواب تو اسے بچپن میں امتحان کے دنوں میں آیا تھا، جب وہ اکنامکس کے ٹیسٹ میں فیل ہوئی تھی، اب تو اس نے سارے مضامین اپنی مرضی کے لیے تھے، تیاری بھی اچھی تھی، ساتھ ہی ساتھ بھیا کے ایک پروجیکٹ پہ بھی کام کررہی تھی ۔اس نے دوبارہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ سوچا ....کل ہی تو اس نے یہ نیل کلر لگایا ہے۔ خوبصورت مخروطی انگلیاں ۔ اسے اپنے ہاتھوں پر بے اختیار ہی پیار آ گیا۔

موبائل الارم نے، صبح پانچ بجے کا اعلان کیا۔ وہ آج کی خوبصورت صبح کو اس خواب کی وجہ سے انجوائے بھی نہ کرسکی ناشتا کرنے کا بھی موڈ نہ بنا، ویسے بھی آج سے پہلے بھی اسے اس بری طرح تنہائی کا احساس بھی نہ ہوا تھا، جی تو چاہا کہ ماما سے بات کروں، پھران کے ہائی بلڈ پریشر نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ کچھ دنوں سے اسے پاکستان بھی بہت یاد آ رہا تھا، احمر بھائی اب تو جمعہ کے جمعہ ہی روزہ رکھتے تھے۔ وہ لیکن اب نماز پڑھنے لگی تھی، لیکن سحری میں اُٹھنا اور روزہ رکھنا، لندن جیسی جگہ پر مشکل ہی لگتا تھا۔

وقت بھی بڑی ظالم شے ہے۔ اسے بے اختیار بیتے دنوں نے گھیر لیا، جبکہ وہ بالکل بھی ایسی نہ تھی کہ بات بات پہ ماضی کے ویرانوں میں خوشیاں تلاشنے نکلتی، اس کے پاس اچھی جاب تھی، مصروفیت تھی، امی ابو کی محبت سے دل آباد تھا۔ وہ معمولی لڑکی نہ تھی، اس نے پھولوں کے سارے رنگ چرائے تھے، بہار اس کی سنگی ساتھی تھی، لیکن شاید وہ بھول گئی تھی۔ قدرت، رشتوں کے رنگوں سے کھیلتے پھولوں سے ان کے مہکنے کا خراج کسی بھی لمحے لے لیتی ہے۔ اسے اپنے بندوں کو کندن بھی تو بنانا ہوتا ہے۔

سامعہ احمد نے واش بیسن کے نلکے کو کھول کر بار بار منہ دھویا۔ آنسو بار بار اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ پانی کے ساتھ اس کا چہرہ بھیگ رہا تھا۔ اس سرد موسم میں بھی۔ وہ بھیگ رہی تھی۔ آوازیں اس کے دامن سے لپٹ رہی تھیں۔ اسے گھر یاد آ رہا تھا۔ شانی خالہ یاد آ رہی تھیں۔ اس کا بچوں کی طرح چیخ چیخ کے رونے کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ شاید ماضی کے بند دروازوں کو کھول رہی تھی جس پہ اس کے خوابوں نے ایک عرصے سے قفل ڈالے ہوئے تھے۔ خواہشوں کی چابیاں چھنک رہی تھیں۔

☆......☆......☆

پھولوں سے مہکتے ''احمد ولا'' میں رات کی رانی کی مہک میں، چائے کے دھواں اڑاتے مگ کو ہاتھ میں لیے، احمر نے ہمیشہ کی لاپروا بے نیازی سے چاکلیٹ کے مزے اڑاتی، سامعہ سے، ابو کے سامنے کہا۔

''سنو سامعہ احمد!!! اس بار تم نے پورے روزے رکھنے ہیں۔''

''آپ کا بہت دل چاہ رہا ہے ناں تو ایسا کریں آپ رکھ لیں، ویسے بھی آپ نے سحری کرنے تو شانی پھوپھو کے ہی گھر جانا ہوتا ہے'' سامعہ نے خوبصورت آنکھوں کو گول گول گھمایا۔

احمر گھورتا ہی رہ گیا اور وہ شان بے نیازی سے اپنی کتابیں اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کی ہر ادا تو احمر کو پیاری لگتی، ننھی سی گڑیا، گھر بھر کی رونق تھی، اسے آج بھی وہ چھوٹی سی ڈول لگتی، جو اس کے دوستوں کے درمیان ایسے آکر بیٹھ جاتی، جیسے وہ اس کے دوست ہوں، خواہ وہ کرکٹ کا میچ دیکھ رہے ہوں یا پھر کسی فلم کا پروگرام بنا رہے ہوں۔

''احمر، رمضان آتے ہی، کیوں اس کے ایسے پیچھے پڑ جاتے ہو، ہر سال ایسے ہی پریشان کرتے ہو، جانتے تو ہو نا، وہ بچپن سے بھوک کے معاملے میں، ایسی ہی ہے، وہ تو بخار میں بھی پرہیز نہیں کرتی، ناراض ہو جاتی ہے، لیکن رزلٹ اس کا ہمیشہ شاندار ہوتا ہے۔ اور لڑکیوں کی طرح موبائل اور میسجز نہیں کرتی رہتی۔ نماز روزے کی بھی خود ہی عادی ہو جائے گی، تم نصیحتیں مت کیا کرو، زیادہ، سب اپنی

عمر میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔" صفیہ خانم کی اپنی ہی کوئی فلاسفی تھی جس پر احمد اشرف چاہ کر بھی تنقید کرنے سے قاصر تھے۔

"آپ لوگ شاید جاننا ہی نہیں چاہتے کہ اس مزاج کا نقصان بھی اسی کو اٹھانا پڑے گا، آپ بعض وقت اس کی بے جا سائیڈ لیتی ہیں ماما!!" احمر کو اپنے گھر والوں سے اس معاملے پر کچھ عرصے سے شدید اختلاف ہونے لگا تھا۔

"اچھا بحث ختم کرو، اور ذرا کم جایا کرو اپنی پھوپھو کے گھر، لگتا ہے تم پہ ان کی باتوں کا کچھ زیادہ ہی اثر ہونے لگا ہے، میری صبح میٹنگ ہے، رات کو دیر سے سوؤں تو سارا دن سر میں درد ہوتا رہتا ہے، یہ بلڈ پریشر تو میری ساری انرجی لے جائے گا، لگتا ہے"۔ صفیہ خانم نے اٹھتے اٹھتے بیاری کا سہارا لیا۔

"نہیں بھئی بلڈ پریشر آپ کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا، ہمیں یقین ہے۔" احمد اشرف نے ماحول کو نارمل کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔

"میں نے فرخندہ بی سے کہہ دیا ہے، وہ سحری میں تم سب کے لیے کھانا تیار کر دے گی، سامعہ کو بھی اٹھا لینا، اگر اٹھ جائے تو۔"

☆......☆......☆

پھولوں سے گھرے اس خوبصورت آشیانے میں، سب ہی کچھ تھا، بس جو کمی تھی وہ دین سے بے خبری تھی، شاید آنے والے وقت کی بے خبری۔ انسان کو مغرور بھی بنا دیتی ہے اور کبھی کبھی مٹی سے گندھے انسان کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ اپنے الفاظ کی تپش سے پہلے دوسروں کو جلاتا ہے، اور آہستہ آہستہ وہی تپش خود اس کے اپنے وجود کو جھلسانے لگتی ہے۔

☆......☆......☆

احمر کو اپنے سے دس سال چھوٹی، سامعہ بے حد عزیز تھی، جب اسے، اس لفظ کی سمجھ بھی نہیں تھی۔ پھولوں جیسی سامعہ سے پہلے سائیکل بچانا مشکل تھا، پھر موٹر سائیکل اور اب گاڑی۔ جسے وہ کبھی بھی اڑا لے جاتی اور وہ اسے چاہ کر بھی نہ تو ڈانٹ سکتا تھا، اور نہ ہی ناراض ہو پاتا، ماما ابو کی آئے دن کی میٹنگز، اور ٹرپ کی وجہ سے وہ اس کی ذمہ داری اٹھانے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اسے لگتا، وہ وقت سے پہلے بڑا ہو گیا ہے، وہ تو شکر ہے، شانی پھوپھو اینیکسی میں، اپنی بیوگی اور پیاری، بیٹی سوہنی کے ساتھ رہ رہی تھیں، اور ان دونوں کے لیے شجر سایہ دار کی طرح تھیں۔ ان کی ذمہ داری شاید ابو ہی اٹھاتے تھے، جس کا احسان وہ تو مانتی ہی تھیں لیکن ماما بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھیں۔

سامعہ کا بھی اپنا ہی مزاج تھا، وہ بچپن سے ہی سوشل ورکر تھی، گھر کی چیزیں ماما سے بنا پوچھے بانٹنا اس کے مزاج کا حصہ تھا، اس کی شرارتی آنکھیں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کے مواقع تلاش کرنے کی عادی تھیں۔ جو کبھی کبھی بے حد تکلیف دہ بھی ہو جاتیں، ایک شام امی کے لیکچر کے باوجود اس نے اپنے تمام کپڑے ایک سوٹ کیس میں ڈالے اور گھر سے چل دی۔ فرخندہ بی نے گھبرا کے شانی پھوپھو کو فون کر کے بلا لیا، کیونکہ صفیہ خانم ان دنوں ایک سیمینار کے سلسلے میں شہر سے باہر تھیں، احمد اشرف ایسے میں گھر کی ذمہ داری ہمشیرہ کے سپرد کر کے مطمئن ہو جانے کے برسوں سے عادی ہو چکے تھے۔

اس وقت بھی گھر بھر پریشان تھا، اور وہ جنابہ بڑے مزے سے خالی سوٹ کیس اور، لال بھبھوکا چہرہ لیے گھر میں داخل ہوئیں تو شانی کی سانس میں سانس آئی، ناراض ہونے کی کیا جسارت کرتیں، لیکن چہرہ کی رنگت دل کا حال چیخ چیخ کے کہہ رہی تھی۔

"اوہ مائی ڈیرسٹ پھوپھو!! یہ تو سارا معاملہ۔ اف" وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی، فرخندہ بی!! آپ بھی ناں ذرا انڈین ڈرامے کم دیکھا کریں۔ آپ نے ہی روزے میں میری پھوپھو کا خون خشک کیا ہوگا"۔

"لو جی ایک تو آپ ہمیں بتا کے جاتی نہیں ہیں، ہمیں بھی تو بیگم صاحبہ کو جواب دینا ہوتا ہے ناں جسے داری

ہے نا، ہماری۔''

''کہاں گئی تھیں، وہ بھی ایسی تپتی دوپہر میں؟؟ شانی پھوپھو کا لہجہ بھی ناراضی لیے ہوئے تھے۔

''رمضان میں، ساری نیکیاں آپ لوگ ہی کمائیں گے کیا، مالی بابا کی بیٹی کی شادی تھی، بس اپنے کپڑے ان کی بیٹی کے لیے دینے چلی گئی اور محترمہ فرخندہ بی نے سوچا، میں گھر سے بھاگ گئی، لو بھلا اس گھر سے اچھا گھر تو فرخندہ بی کو نہیں ملنے والا تو بھلا مجھے کہاں ملے گا، اور ایسی پیاری پھوپھو جو مجھے ہر وقت پراٹھا بنا کے کھلانے کو تیار رہتی ہیں۔'' اس نے آ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اچھا اب میں گھر جا رہی ہوں، سونی بھی کالج سے آنے والی ہوگی۔'' انہوں نے اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔''

''آج شام کو میں اور بھیا آپ کے پاس افطاری کرنے آ رہے ہیں، سونی کو بھی بتا دیجیے گا۔''

اسے سونی بہت اچھی لگتی تھی اتنی اچھی کہ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ وہ احمر بھائی کو یا ماما ابو کو کیسی لگتی ہے۔ اس کو خود ہر فیصلہ کرنا بڑا اچھا لگتا تھا۔ جب بھی رات کو دیر تک نیند نہ آتی تو وہ ٹیرس پہ بیٹھ کر، آسمان کی طرف دیکھ کر سوچتی کہ وہ جب کبھی امی بنے گی تو سارا وقت اپنے بچوں کو شانی پھوپھو کی طرح اپنے ساتھ رکھے گی، ہر وقت تاکہ ان کو کبھی ڈر نہ لگے، ایک دفعہ اس نے یہ بات شانی پھوپھو سے کہہ بھی دی، بس کبھی ماما سے نہ کہہ سکی، کیونکہ وہ کہتی تھیں ان کو لڑکیاں بولڈ اچھی لگتی ہیں، جو کسی سے بھی نہ ڈریں، جیسے میری سامعہ!!! چھوئی موئی لڑکیاں تو مجھے اداکارہ سی لگتی ہیں۔ اب بھلا وہ کیسے بتاتی کہ اسے، کبھی کبھار رات کو بہت ڈر لگتا ہے

☆......☆......☆

''یار سامعہ۔ اتنی تیز گاڑی نہ چلایا کرو پلیز۔ کیسے چلا لیتی ہو، مجھے تو خوف آتا ہے ٹریفک سے، ہر کوئی جلدی جلدی میں لگتا ہے۔'' اس کی دوست بینش نے گاڑی میں بیٹھتے کے ساتھ ہی خوفزدہ ہونا شروع کر دیا۔ تمہیں اجازت مل جاتی ہے گھر سے، اف۔ میری ممی تو بالکل بھی گاڑی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتیں۔''

''میں پوچھتی دو چھتی کسی سے نہیں ہوں، میری مرضی چلتی ہے، بس'' سامعہ نے آنکھیں گھمائیں۔

''اور اگر کبھی چالان ہو گیا تو۔'' بینش نے پوچھا

''زندگی میں، گردن اٹھا کے چلو۔ یہ یکھو، کوئی مائی کا لال تمہارا راستہ نہیں روک سکتا'' سامعہ کا انداز سیاستدانوں والا تھا۔

''جھوٹ بول دو گی، کہ تمھارے پاس لائسنس ہے'' بینش نے کریدا۔

''گاڑی روکوں گی تو سوال جواب ہوگا ناں'' سامعہ کی نظروں میں شرارت تھی۔

''دیکھو میرے ابو کہتے ہیں، لائسنس کے بغیر گاڑی چلانا جرم ہے'' بینش نے سادگی سے کہا۔

''ہاں ہاں جرم تو ہر دوسری بات میں ہے، لیکن دیکھ لو سڑک پہ نکل کے کتنے لوگ ہمارے ہاں قانون کی پابندی کرتے ہیں، بلکہ سادگی کا، قانون کا مذاق اڑانے میں سب ہی پیش پیش ہیں، میرا بس چلے تو میں کسی ایسے ملک میں جا کے رہنے لگوں، جہاں واقعی قانون کو لوگ obey کریں۔ اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔

''ہاں ہاں چلی جانا تم بھی مس شیما اکرام کی طرح لندن، لیکن ابھی تو مجھے زندہ سلامت میرے گھر ڈراپ کر دو۔ بینش نے کہا۔

''کیا مطلب تم، ابھی میرے ساتھ ٹیلر کے پاس نہیں چل رہیں، کوئی بکواس نہیں سنوں گی، واپسی میں پھر میرے ساتھ گھر چلو گی۔ اور۔ اور پھر ہم آنٹی کو فون کریں گے، وہ میرے لیے اچھا سا کھانا تیار کریں گی، اور ہم افطاری کا سامان لے کر چلیں گے''۔ سامعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ گڈ، پروگرام تو اچھا ہے، ویسے روزہ رکھا ہے

کیا؟ بینش نے گاڑی کا ایر کنڈیشن ہلکا کیا۔

"میری طرف سے آج تمہاری افطاری کی دعوت ہے ناں، کیا یاد کرو گی، آج میں نے ایک نئی جگہ دکھاتی ہوں، وہاں کی چاٹ، بھیل پوری، سیو پوری کا جواب نہیں۔ مسالا ڈوسا بھی ہے۔ سامعہ نے پورا مینیو سنا دیا۔

"بس کردو یار، میرا روزہ ہے، شکر ٹیلر شاپ آگئی، ورنہ تم وہاں کٹلری کا کلر بھی بتانے والی تھیں۔ بینش نے اپنا بیگ سنبھالا۔

"اوہ ایکسکیوزمی، چار سوٹ بھی تمھارے ہی ہیں، میرا تو تمہیں پتا ہے نا ایک جینز اور ٹاپ، ایک دو کرتیاں۔" سامعہ نے گاڑی کا اگنیشن آف کیا۔

"جی جی۔ آپ تو۔" بینش کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا" اوہ سمیر!!! تم یہاں۔ کیسے؟ بینش نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے، سامنے سے بائک پر آتے سمیر کو دیکھ کر کہا۔

"اسلام علیکم۔" سمیر کے چہرے کی مسکراہٹ دیدنی تھی۔

"میں یہاں کوچنگ کی کلاسز کے لیے آتا ہوں، اور آپ لوگ کیسے ہیں، اسٹڈی کیسی چل رہی ہے؟" احمر نے بائیک پر بیٹھے بیٹھے ہی سوال کیا۔

"سب سیٹ ہے، جلدی کرو بینش، دیر ہورہی ہے۔" سامعہ نے قدم آگے بڑھادیے۔

'اس سے تو بات کرنا مشکل ہے، نہ کہ یہ کہنا کہ تم مجھے کالج میں سب سے زیادہ اچھی لگتی ہو، تمہاری جیسی کوئی بھی نہیں لگتی ہے، اور شاید ہے بھی نہیں۔" سمیر نے سوچتے سوچتے بائیک اسٹارٹ کی۔

"مجھے یہ بہت ڈیسنٹ لگتا ہے، اس لیے بات کر لیتی ہوں، ورنہ ہمارے فیانسی محسن کو تو کسی سے بات کرنا پسند ہی نہیں۔" بینش نے وضاحت کی۔

"جی جی، کوئی بات نہیں، ہم نے بھی آپ کو اجازت دی، بندہ اسمارٹ ہے، اس کا نام سمیر صدیقی ہے ناں۔" سامعہ نے کندھے اچکائے۔

☆......☆......☆

سامعہ سحر اور افطار میں ہر شے سے بھرپور انصاف کرتی۔ ایسے میں روزے کی پابندی کرنے والے، احمر کبھی کبھی تو جل کے رہ جاتے، دوستوں کی بہنوں کی سلیقہ مندی اکثر ہی دیکھتے، اور پھر شانی پھوپھو کی سونی بھی، جو گھر میں ہو تو ماما کوئی بھی کام نہ کرنے دیتی، سامعہ کے معاملے میں انہیں اکثر امی ابو کی بے نیازی بالکل بھی پسند نہ آتی، وہ اسے ایک آئیڈیل لڑکی کے طور پر دیکھنا چاہتے، کیا کرتے، ماما ابو کی مصروفیات نے انہیں سامعہ کے معاملے میں حساس بنا دیا تھا، یہ بات وہ ہمیشہ محسوس کرتے کہ وہ سامعہ کو ماما، ابو سے زیادہ اپنی ذمہ داری سمجھنے لگے تھے، ایسے گھروں کے بچے شاید وقت سے پہلے بڑے بھی ہو جاتے ہیں، تب ہی والدین بے فکرے بھی زیادہ ہوجاتے ہیں۔

آج بھی ڈنر ٹیبل پر جب احمر کو یہ بتایا گیا کہ عید کے فوراً بعد ان کو ایک سیمینار کے سلسلے میں، ملائیشیا جانا ہے، تو وہ بے اختیار بولے۔ "امی میری مانیں تو اب آپ لوگ سامعہ کی شادی کردیں۔" احمر کی سنجیدگی دیکھنے والی تھی۔

اس سے پہلے کہ والدین کی طرف سے کوئی جواب آتا، حاضر دماغ سامعہ کی جانب سے مسئلے کا حل نہایت دانشمندی سے دیا گیا، وقت نے ان صداؤں کو اپنے دامن میں، نہایت شتابی سے سمیٹ کے، ستاروں سے بھرے دامن میں سمیٹ لیا۔

"تو کردیں، بینش کی بھی شادی ہورہی ہے، میری بھی ہوجائے گی، مجھے کیا، مجھے کون سا یہاں سے جانا ہے، وہ بھی آ کے ہمارے ساتھ اس گھر میں رہے گا، میں، وہ سونی احمر بھائی۔ کتنی رونق ہوجائے گی، ہمارے اس خاموش سے گھر میں۔ پھر راتوں کو ہم آپ کی گاڑی لے کے۔ کبھی سمندر پہ، کبھی چائے والا۔ کبھی پورٹ گرینڈ، اور جب پٹرول ختم ہوجائے گا تو گاڑی وہیں چھوڑ کے، ٹیکسی لے کے واپس گھر آجائیں گے۔" سامعہ کی آنکھوں میں

شرارت تھی۔ لیکن صفیہ خانم کے لیے یہ خبر نامہ۔ سونامی نیوز تھی۔ انہوں نے چونک کر پہلے احمر اور پھر احمد اشرف کی جانب دیکھا۔

''بس کرو دو'' احمر، ماں کا سرخ چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ''ڈھیٹ ہو بے حد''

''ڈھیٹ کو stubborn ہی کہتے ہیں ناں، وہ تو ہوں۔'' وہ مسکرادی۔

''میرا خیال ہے اب تم دونوں خاصے میچور ہو گئے ہو، اسٹڈی کے لیے، باہر جانے کی تیاری کرو، شادی کے لیے عمر پڑی ہے، ہو جائے گی، تم بھی سامعہ، اب خیال رکھا کرو، ہر بات کا جواب دینا سمجھداری نہیں ہے، میرا خیال ہے اب دوبارہ اس طرح کی باتیں ڈنر ٹیبل پہ نہ کی جائیں تو اچھا ہے۔'' انہوں نے جو کہنا تھا وہ کہہ چکی تھیں۔ احمر کو اندازہ تھا کہ وہ کیا سمجھانا چاہ رہی ہیں۔ سامعہ احمد نے بھی سر جھکانے میں ہی عافیت سمجھی، احمد اشرف برسوں سے صفیہ خانم کے اس مزاج سے واقف تھے۔ وہ ایک حد سے زیادہ کسی بھی تعلق کو نبھانے کا نہ مزاج رکھتی تھیں نہ ارادہ۔ سوہنی ان کو بھی پسند تھی، لیکن وہ اپنے بچوں کے معاملے میں بہت زیادہ حساس تھیں، اسٹیٹس اور صرف اسٹیٹس کی قائل تھیں، انہیں اپنے معیار سے ہٹ کے فرنیچر تک پسند نہ آتا تھا، اور یہ تو ان کی آنے والی نسل کے مستقبل کا سوال تھا۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں منہ چھپا رہا تھا۔

☆......☆......☆

سامعہ احمد کا دل اپنی امی کے اس انداز پہ اکثر کڑھتا۔ اس رات وہ دیر تک ٹیلی ویژن کے چینل چینج کرتی رہتی، اسے یہ بات کبھی سمجھ نہ آتی، کہ امی جو اکثر سوشل ورک کے کام کرتی نظر آتیں، رات کو دیر تک پھر ان کی رپورٹس بھی بناتیں، اسے بھی اکثر یہ ہی سمجھاتیں، کہ ضرورت مندوں کا خیال رکھنے سے ہمارا رب ہم سے خوش ہوتا ہے، پھر ہمارے ایسے خواب جو ہم ابھی سوچ ہی رہے ہوتے ہیں، پلک جھپکتے ہی پورے کر دیتا ہے، تو

جب وہ پھوپھو کا بھی خیال رکھتی ہیں، اور ایوان کو ہر ماہ لفافہ دینے جاتے ہیں تو امی اتنی بے زار کیوں ہوتی ہیں، ان کو سوہنی آخر کیوں اچھی نہیں لگتی جبکہ اس کے بال کتنے سیاہ اور خوبصورت ہیں، بھائی جان کو اس سے فرمائش کر کے بریانی پکوانا کیوں پسند ہے، اور وہ اس کی پسند کی چاکلیٹ آئسکریم سے کیوں، شانی پھوپھو کا فریج خالی نہیں ہونے دیتے۔ اف آسمان سے ان گنت سوال لیکن اس کے جواب شاید ہر اس بچے کو نہیں مل پاتے جو رات کو بجلی جانے کے غم میں مبتلا نہیں ہوتا، اور نہ ہی اس کے کمرے کا ایر کنڈیشن اسے مچھروں کے دھیمے سروں میں بے چین کرتا ہے۔ وہ بھی سو گئی، سوالوں کے جواب کھوجتے کھوجتے۔

محبت کے راستے دل سے ہو کے گزرتے ہیں، یہ سارے رستے ہمیں، ہمارا رب جو دکھاتا ہے، اس کے حصول کے لیے، کسی کالج یا یونیورسٹی میں جانے کی بھاری فیس بھی ادا کرنی نہیں پڑتی۔

اس شام امی کو گھر سے نکلتے دیکھا، اور اس نے شانی پھوپھو کی انیکسی کا رخ کیا، وہ کچن میں افطاری کی تیاری کر رہی تھیں، سوہنی کاسنی رنگ کے دوپٹے میں سر جھکائے، قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھی، اسے دیکھ کے اس کا بھی جی چاہا کہ وہ ساتھ ہی بیٹھ جائے، لیکن کچن سے سموسوں کی اشتہا انگیز خوشبو اسے کھینچتی ہوئی اپنے ساتھ لے گئی۔

''شانی پھوپھو یہ تو بتائیں، آپ سارا دن روزے کے ساتھ کام کرتے کرتے تھک نہیں جاتیں، آپ کے گھر میں AC بھی نہیں ہے، تو آپ کبھی بے ہوش تو نہیں ہو جاتیں۔''

وہ ہمیشہ سے اس کے ایسے سوالوں کی عادی تھیں۔ بیوگی نے انہیں صبر کے ساتھ ساتھ شکر کرنا بھی سکھا دیا تھا، بھائی کی خاموش محبت، ان کے لیے اب سب کچھ تھی جو کبھی کبھی تو آفس سے صرف ان کی دلجوئی کی خاطر اٹھ کے آتے، کیونکہ صفیہ خانم کو شانی سے ہی نہیں، ان

کے سب ہی رشتوں سے نہ جانے کیوں الرجی تھی، جس کا علاج ناممکنات میں سے تھا۔

''اللہ تعالیٰ کی محبت اس کی رضا کے لیے، اس کی خاطر، اور جب ہمیں یہ احساس ہو جائے، کہ اس نے ہمیں بن مانگے اتنا کچھ عطا کیا ہے، تو خود بخود دل اس راستے پہ چل پڑتا ہے، اور پھر پتا بھی نہیں چلتا کہ وقت کیسے گزر گیا'' وہ اب گرم تیل میں پھلکیاں ڈال رہی تھیں۔

''ماما کو یہ سب کرنے کی عادت کیوں نہیں ہے؟''

اس نے دل چاہتے ہوئے بھی پھلکیاں افطاری پر ہی کھانے کا فیصلہ کیا۔

''وہ اب بلڈ پریشر، شوگر کی وجہ سے نہیں رکھتیں، وہ روزے کا فدیہ دیتی ہوں گی ناں'' ان کا لہجہ ہمیشہ ہی مصلحت پسندانہ ہوتا ہے۔

''اف، آپ یہ چٹنیاں اتنی مزے دار کیسے بناتی ہیں؟ سامعہ نے چمچہ سے املی کی چٹنی کھائی، اور پھر پانی کا پورا گلاس پینا پڑا۔

یہی حرکت اگر سونی کرتی تو وہ اسے ضرور ٹوکتیں۔ لیکن سامعہ کو وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کہہ پاتیں۔

''پورا دن روزہ رکھ کے جو افطاری کا مزا ہے ناں، وہ تم بھلا کیسے جانو گی اگر روزہ نہیں رکھو گی'' سونی نے روح افزا کا جگ فریج میں رکھا۔

ایسا کرنا، اس روز سحری بھی ہمارے گھر کرنا، اس فرائی ڈے۔'' سونی نے خوشدلی سے کہا۔

''Done'' سامعہ نے سونی سے ہاتھ ملایا۔ لیکن وہ Friday جس میں سامعہ روزہ رکھ لے، آیا ہی نہیں!!

☆......☆......☆

وہ ایسی ہی تھی، کسی کی بھی پروانہ کرنے والی، ہر دم خوشیوں کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لینے والی، بس تعلیم حاصل کرنے کا بھی جنون تھا۔ خود کو کسی اونچے مقام دیکھنا، اور پھر ساری دنیا کو اپنی مرضی سے چلانا۔ معصوم سی خواہش تھی، کامیابی کا حصول، اس کا خواب تھا۔ جو پورا ہونا اسے مشکل بھی نظر نہ آتا تھا۔

وقت نے زندگی کو کب ایسا مشکل کیا تھا، کہ وہ کوئی پریشانی دیکھتی۔ ہاں لیکن جب اسے پتا چلا کہ احمر بھائی اور اس کا ایڈمیشن لندن یونیورسٹی میں ہو چکا ہے۔ وہ خوش تھی لیکن بار بار اس کے ذہن میں سونی کا معصوم سا چہرہ آنے لگا، جو احمر بھائی کے نام سے ہی سرخ ہونے لگتا، وہ تو تھے ہی ایسے کہ سب ہی کو اچھے لگتے، لیکن شاید سونی کو وہ ہم سب سے زیادہ عزیز تھے، اس خیال کے آتے ہی وہ احمر کے کمرے میں جا پہنچی۔

''ایک بات بتائیں، آپ ماما سے کہتے کیوں نہیں ہیں؟ اس نے بیٹھتے ہی سوال داغا۔

''کیا نہیں کہتا، سپر ومین؟'' احمر نے مسکرا کے اسے دیکھا۔

''یہی کہ آپ کو سونی اچھی لگتی ہے، آپ اس سے شادی کریں گے، اس لیے آپ میرے منگنی کر کے ہی مجھے لندن پڑھنے کے لیے بھیجیں، بس اور پھر میں ماما کو راضی کر لوں گی۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

''یہ سب کاش اتنا آسان ہوتا، تو شاید میں کہہ بھی دیتا، احمر نے ایک لمبا گہرا سانس لیا۔

کیوں، آپ کو خود پہ یقین ہی نہیں ہے۔'' وہ برا مان رہی تھی۔

''اصل میں تم نہیں جانتیں نا کچھ بھی، بہت سی باتوں کا وعدہ ابو نے بہت پہلے مجھ سے لیا تھا، جس کی وجہ سے، کچھ چاہ کر بھی میں کہہ نہیں سکتا۔ مجھے ماما بہت عزیز ہیں، وہ جہاں چاہیں گی، میں وہیں شادی کروں گا۔'' احمر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

احمر بھائی کو تو رازداں بننے کا شوق تھا، ہمیشہ آدھی بات بتاتے اور کمرے سے بھگا دیتے، وہ سوچتی ہی رہ جاتی 'اتنی سی زندگی میں ہم سب نفرت، انتقام، کے لیے کیسے اتنا وقت نکال لیتے ہیں، اب اگر پھوپھو کی شادی ماما کے بھائی سے نہ ہو سکی تو ماما نے اس بات کے لیے آج تک پھوپھو کو اس لیے معاف نہیں کیا کہ پھوپھو نے بھی

انکار کیا تھا، کیونکہ وہ پھوپھا جان کو پسند کرتی تھیں۔ اور جس بات کا حق، اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اس کا حق ہم انسان کیوں چھیننا چاہتے ہیں' یہ سوچتے سوچتے سامعہ کو نیند آگئی، وہ نہیں جانتی تھی کہ قسمت نے اسے، محبت کرنے اور محبت بانٹنے کے لیے ہی پیدا کیا ہے، تب ہی تو وہ اتنی بہادر تھی۔ حق بات کے لیے ڈٹ جانے والی۔ کہہ دینے والی۔ کرگزرنے والی۔ ایقان سے بھرا دل لیے۔ نئے راستوں پر قدم رکھنے والی!!!!

☆......☆......☆

زندگی سے شکایت پہلی بار ہوئی، امی ابو کے ساتھ ساتھ احمر بھائی سے بھی، کیسے بھول گئے وہ سوہنی کو، کیا وہ کبھی اسے بھی ایسے ہی بھول جائیں گے، جو آج تک اس کی سالگرہ نہ کبھی بھولے تھے، وہ بہت روئی، لندن کے سفر کے دوران۔ شاید اسے امی ابو کے ساتھ سوہنی، شانی پھوپھو، بنیش اور کالج اور پھر بہت کچھ یاد آنے لگا۔ سفر انسان کی روح کو نئے جہانوں سے آشنائی دیتا ہے۔ اسے چلتے چلتے ابو کی وہ بات بار بار یاد آرہی تھی۔ ''دیکھو بیٹا۔ روشنی بہت اچھی لگتی ہے، لیکن اس میں بھی کچھ لوگ گم ہو جاتے ہیں، تم دونوں بہن بھائی میرا مان ہو، مجھ سے کبھی جھوٹ نہ بولنا، دل دور نہیں ہوں تو فاصلے آپ کا کچھ نہیں بگاڑتے''

ماما نے بھی اس کا ماتھا چوما ''ضد اچھی نہیں ہوتی، اسے یہیں چھوڑ جانا، ورنہ اکیلی رہ جاؤ گی''

اس نے بہادری دکھائی ''آپ بھی شانی پھوپھو کو معاف کردیں، ان کے گھر جایا کریں، ورنہ آپ اداس رہیں گی''

انہوں نے مسکرا کے پہلی بار اسے، اس بات پہ دیکھا، لیکن اسے محسوس ہوا کہ یہ بات انہیں اچھی نہ لگی تھی، شانی پھوپھو نے بھی اسے چلتے چلتے پہلی بار ماتھا چومتے ہوئے بڑے مان سے بتایا۔

''تمہاری آنکھیں اور ماتھا امی جان کی طرح روشن ہے، جہاں بھی جاؤ گی، لیکن اس گھر کو دوبارہ تم ہی آباد کرو گی۔ انشاءاللہ

سوہنی نے کچھ بھی نہ کہا، کوئی گلہ۔ کوئی شکایت نہیں کی اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، بس اس کا ہاتھ الوداعی انداز میں تھامتے ہوئے کہا ''اپنے بھیا کا بہت خیال رکھنا، انہیں کوئی الزام کبھی نہ دینا کوئی بھی بے وفا نہیں ہوتا، کوئی ظالم نہیں ہوتا سوائے اس وقت کے جو اس لمحے ہمارا نہیں ہوتا، اور پھر سہنا تو پڑتا ہے ناں کسی کو زیادہ۔ کسی کو کم!!!

☆......☆......☆

بدیسی زندگی مشکل تھی یا آساں ہاں اس کا خواب ضرور تھی، اس کے والدین بھی وقت سے آگے دیکھنے والے لوگوں میں سے تھے، ان کا خیال تھا کہ اپنے بچوں کے راستوں میں محبت کی دیواریں چن کے ان کو اسیر نہیں بنانا چاہیے۔ اسی لیے وہ ان کو رخصت کرنے کے بعد اپنی مصروفیات میں مشغول ہوگئے، ویسے بھی انٹرنیٹ نے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے۔ وہ تو کبھی کبھا شانی پھوپھو سے بھی باتیں کرلیتی، خاص طور پر جب اس معاشرے کے مختلف انداز اسے پریشان کرنے لگتے۔ دوست طرح طرح کے سوال کرتے، کیونکہ ہر ملک کے اسٹوڈنٹس اس کے ساتھ تھے۔ ماما نے تو کچھ ہی عرصے بعد لندن میں مقیم فرح آنٹی کی بیٹی سے، احمر بھائی کی شادی طے کردی، پاکستان میں شانی پھوپھو نے بھی سوہنی کی رخصتی کرنے میں دیر نہ لگائی، وہ چاہ کر بھی اس شادی میں نہ جاسکی، احمر بھائی نے خود کو پڑھائی میں گم کررکھا تھا، اسے شانی پھوپھو نے اس کی سالگرہ پہ Digital Quran بھیجا تھا، وہ شاید سب جانتی تھیں یہ بھی کہ اب اسے نماز پڑھنا مشکل نہ لگتا تھا اور قرآن کریم میں بھی دل خود ہی لگنے لگا تھا، شانی پھوپھو کہا کرتیں ''سکون چاہیے تو قرآن حکیم کو اخلاص سے پڑھو، اور ترجمہ و تفسیر کے ساتھ۔ اور واقعی اب بہت سے سوال اسے الجھاتے نہیں تھے نہ ہی نیند اڑتی اور نہ ہی من

مانی کرنے کو جی چاہتا خود بخود ہی۔ تب ہی تو سونی کی رخصتی پہ رونا تو بہت آیا، لیکن غصہ نہیں، البتہ اس دن احمر بھائی کے ساتھ اس نے پورا دن گزارا اور بہت دیر تک وہ دونوں اپنا بچپن یاد کرتے رہے۔ اور فلم بھی بہت دنوں بعد دیکھی۔ واپسی میں اس کا گانا بھی گنگناتے رہے۔ لیکن اس رات پھر بھی احمر بھائی کے کمرے کی لائٹ صبح تک جلتی رہی۔

☆......☆......☆

سامعہ کو یہ خواب بہت عرصے بعد آج آیا تھا، دل بے اداس تھا، رات ہی تو احمر بھائی نے بتایا تھا، سونی کی رخصتی کے دوسرے ہی دن ماما اور ابو کی ملائیشیا کی فلائٹ تھی، انہوں نے فون کر کے بتایا تھا، ابو کی آواز کچھ تھکی تھکی سی تھی، اس وقت اس کا بالکل دل نہیں چاہا کہ وہ پاکستان فون کرے، وہ ناراض تھی، کتنا دل چاہ رہا تھا، سونی کی شادی اٹینڈ کرنے کو، لیکن ماما نے یہ کہہ کے منع کر دیا کہ ملائیشیا سے واپسی کے بعد، ان کا پروگرام خود لندن آنے کا ہے۔ کبھی کبھی انسان زیادہ ہی پلاننگ کرتا ہے، جانتا بھی ہے کہ اگلا لمحہ اس کے بس میں نہیں پھر بھی نہ جانے کیوں مسز صفیہ خانم کو ہر فیصلہ اپنے انداز میں کرنے کی عادت سی ہو چکی تھی۔

اس کا فون silent پہ تھا۔ وہ کلاس سے باہر آئی تو خلاف توقع فرح آنٹی اپنی گاڑی میں باہر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اور پھر ایک ایسا سانحہ، ایک ایسی خبر اس کی منتظر تھی کہ لندن کی بارشوں سے بھی زیادہ جل تھل موسم اس کی روح کو بھگوتا چلا گیا، وہ پاکستان آنا چاہتی تھی مگر ایسے تو نہیں کہ جب اس پھولوں بھرے گھر میں چاروں طرف خزاں کا ڈیرہ ہو، اسے کچھ سمجھ نہیں آیا، چاروں طرف آوازیں تھیں۔ لیکن ایسی غیر مانوس کہ وہ زمیں پہ بیٹھتی جا رہی تھی، اسے نہیں پتا چلا کہ کب شانی پھوپھو نے اسے اپنے سینے میں سموتے ہوئے کہا۔

''میں ہوں نا تمہاری امی، دیکھو میری طرف۔ ادھر دیکھو'' وہ کیا کرتی ہر چہرہ آنسوؤں کی دھند میں کھو رہا تھا۔''

اس ایئر ایکسیڈنٹ میں وہ دونوں چلے گئے، ان دونوں اپنے پیاروں سے ملے بغیر۔ وہ جو ہر کام نہایت پلاننگ سے کرتے تھے نہیں جانتے تھے کہ ایک دن سارے کام ادھورے رہ جائیں گے، راستے ان مسافروں کی راہ تکتے رہ جائیں گے، جو ہر شام ایک نئی مصروفیت کے ساتھ گھر کی دہلیز پہ قدم رکھتے تھے۔

☆......☆......☆

سمیر نے بینش کی پوسٹ پر جب یہ خبر پڑھی تو دکھ کے ساتھ ساتھ، یہ امید بھی دل کو روشن کر گئی کہ سامعہ احمد اب پاکستان میں ہے اور اس بار وہ اسے جانے نہیں دے گا۔ اس کے راستے میں ڈیرے ڈال دے گا، روک لے گا، بھلا روگ لگانے سے بہتر نہیں کہ انسان وقت کی قدر کرے۔ دعائیں خلوص دل سے ہوں تو رائیگاں نہیں جاتیں۔ وہ بھی تو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایگزیکٹو پوسٹ پہ تھا۔ اسی خیال کے تحت سمیر نے بینش کو in Box میں لکھ بھیجا کہ وہ بھی، condolence کے لیے، سامعہ احمد سے ملنا چاہتا ہے۔

سامعہ احمد کے سارے لفظ جیسے بے وقعت ہو گئے تھے، بے معنی ہو گئے تھے، وہ بینش کے ساتھ بیٹھی تھی، لیکن اتنی خاموش کہ وہ بتا بھی نہیں سکی کہ تم واپس آئی ہو، تمہیں آنا ہی تھا، کچھ زندگی کے تجربے ایسے ہوتے ہیں کہ انسان آفاقی فیصلوں کی حقیقت کو جاننے لگتا ہے، ماننے لگتا ہے، شانی پھوپھو کو بھی اس کی خاموشی اب کھلنے لگی تھی، اب وہ کوئی سوال نہ کرتی، بس نماز پڑھ کے قران پاک کی تلاوت کرنے لگتی، رات کو اکثر ہی خاموشی سے ان کے پاس آ کے لیٹ جاتی۔

''اب، میں تمہاری شادی بھی جلدی ہی کر دوں گی'' شانی پھوپھو نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ بالکل خاموش تھی، نہ کوئی احتجاج، نہ کوئی خواب۔ روح میں ایک گہرا سناٹا۔ اس کی آواز بھی اس سے جیسے

روٹھی ہوئی تھی۔

"تمہاری کوئی پسند ہے تو بتادو، کہیں سوچو کہ لو جی پھوپھو نے بھی اپنے فیصلے مجھ پہ مسلط کرنے شروع کردیے۔"

اس نے کروٹ لی، کھوئے کھوئے لہجے میں کہا 'احمر بھائی'' اور پھر خاموش ہوگئی۔

دوسرے دن فرح آنٹی نے واپسی کا بتایا تو سامعہ نے بھائی کی طرف دیکھا۔

"مجھے بھی جانا ہوگا تم چاہو تو یہ سمسٹر ڈراپ کردو۔" احمر بھائی کا لہجہ اسے اجنبی سا لگا۔ "کچھ فیصلے مشکل ہوتے ہیں لیکن کرنے تو پڑتے ہیں ناں"

وہ سونی کو دیکھ کے اب بھی شاید بہت ڈسٹرب تھے۔ انہیں شاید دامن بچا کے نکل جانے کی عادت ہی ہوگئی تھی، بس وہ ایک خواب جو اسے اکثر بے چین کرنے لگا تھا۔ لیکن جب سے اس نے جائے نماز پہ سجدہ کرنا سیکھ لیا تھا، دعا پہ اس کا یقین اور صبر کے پھولوں سے دامن بھرنے کا ہنر بھی پالیا تھا۔

"تم بھی میرے پاس آجانا، یہاں اکیلے رہ کے کیا کروگی" فرح آنٹی نے بھی حق دوستی نبھاتے ہوئے کہا۔

'میں اب کہیں نہیں جاؤں گی اور کوئی خواب بھی اب مجھے پریشان نہیں کرے گا۔ درد کا اذیت ناک لمحہ گزر چکا تھا، لیکن اس وقت نے جاتے جاتے اسے بند دروازے کھولنے کا اسم سکھادیا تھا۔ اس نے سوچا اور یہی message احمر بھائی کو بھی کردیا۔

"تم اس تنہائی میں ڈپریشن کا شکار نہ ہوجانا" فرح آنٹی نے، ناشتے کی ٹیبل پر سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے اس گھر کو آباد بھی تو رکھنا ہے، میری تنہائی پھوپھو کی تنہائی سے زیادہ تو نہیں ہے ناں۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

گھر سے سب رخصت ہوئے تو اس نے خود کو گھر کے کاموں میں مصروف کرلیا، فرخندہ بی بھی اس کے ساتھ لگی رہتیں، شانی پھوپھو کو بھی اس نے اپنے کمرے میں شفٹ کرلیا، ویسے بھی جب وہ ٹھان لیتی تو فیصلہ کرنے سے اسے بھلا کوئی روک سکتا تھا۔

بینش آتی لیکن اب اس سے زیادہ وقت وہ شانی پھوپھو کے ساتھ گزارنے لگی تھی، سونی بھی جب آتی اس کا ماتھا چوم کے چل دیتی، وہ حیران تھی، اسے دیکھ کے وہ احمر بھائی کو ضرور سوچتی۔ ایسے میں اسے، رومیو جیولٹ کی کہانی بھی فضول سی لگنے لگتی، پھولوں کو اس کی معصومیت پر پیار آنے لگتا۔ جب وہ شام کو ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کیا کرتی۔

احمر نے خود کو پڑھائی میں کچھ ایسا مصروف کیا کہ وہ اکثر سوچتی، جب وہ اس کی خیریت پوچھ کر فون ایسے رکھتے، جیسے سارے موضوع ماما ابو کے ساتھ ہی رخصت ہوگئے ہوں۔ وہ یہی سوچتے سوچتے اکثر خود کو بہت تنہا محسوس کرتی، اس شام پھوپھو بہت دنوں بعد فرخندہ بی کے ساتھ کچن میں شام کی تیاری کرنے میں مصروف تھیں، اس نے سوال جواب کرنے چھوڑ دیے تھے، خود ہی پھر پھوپھو نے بتایا، شام میں بینش کے ساتھ کچھ لوگ آرہے ہیں، وہ پھوپھو کے خلوص کے آگے کچھ بھی بولنے سے قاصر تھی۔ جبکہ وہ پھر سے اپنی تعلیم شروع کرنے کے موڈ میں تھی۔

سٹنگ روم میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر سامنے صوفے پہ براجمان جس شخص پہ پڑی۔ اسے احساس ہوا، وہ چونکی، اس کی آنکھوں میں جتنے بھی سوال تھے۔ اس کا جواب بینش کی بے اختیار مسکراہٹ میں تھا، سمیر صدیقی کی شخصیت، اب ایسی تھی کہ سامعہ احمد چاہ کر بھی نظر انداز نہ کرسکی۔ احمد ولا میں، بہت دنوں بعد پھولوں نے شام کو مسکراتے ہوئے الوداع کیا، اور سرگوشی کی۔ جو فیصلہ آسمانوں پہ بہت پہلے ہوچکا تھا۔

تم اتنی دور سے چل کر میرے قریب آئے
اب آؤ پاس ہی بیٹھو، تھکن مجھے دے دو

☆☆......☆☆

افسانہ

روحیلہ خان

سنہری بٹوا

"کچھ نہیں کرتی...... بس چپ چاپ آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ویسے میں بھی زیادہ ان کی بہنوں کو منہ نہیں لگاتی۔ ذرا لفٹ کراؤں تو میرے ہی سر پر آ بیٹھیں۔" "چل یہ تو تُو بڑا اچھا کرتی ہے۔ یہ نندیں بڑی خبیث مخلوق ہوتی ہیں۔" رفعت خالہ کا خون......

جب سے پپو بھائی کی شادی ہوئی تھی اماں نے نجانے کیوں انہیں الگ کر دیا تھا۔ رانی بھابی اسے کچھ خاص اچھی نہ لگتی تھیں لیکن اس کی نگاہیں تو بس ان کے ستاروں والے سنہری بٹوے پر جا کر ٹک جاتی تھیں۔ جگر جگر کرتا وہ بٹوہ کتنا خوبصورت لگتا تھا چھوٹا سا مُنا سا بالکل ایسا جیسا اس کے لیے ہی بنا ہو۔

''ارے مُنی...... سنتی نہیں چل جا دفع ہو۔ میسنی کہیں کی...... تو ہی جا کر اپنی اماں کو لگاتی ہے ناں...... رفعت خالہ نے اسے بری طرح گھر کا...... وہ چپ چاپ اُن کی صورت دیکھتی رہی ان کی نگاہوں میں جیسے آگ سی لپک رہی تھی اُس کا ننھا سا دل خوف سے ذرا سمٹا۔

''اے دیکھ تو کیسے لکڑی بنی کھڑی ہے......''

رفعت خالہ کا بس چلتا تو اُسے اُٹھا کر سیڑھیوں سے نیچے پھینک دیتی۔

''جانے بھی دو اماں...... کانوں سے کم سنتی ہے بیچاری......'' رانی بھابی نے ماں کا شانہ پکڑ کر سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''ابھی کم سنتی ہے تو یہ حال ہے...... اگر پورا سنتی تو......''

''کچھ نہیں کرتی...... بس چپ چاپ آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ویسے میں بھی زیادہ ان کی بہنوں کو منہ نہیں لگاتی۔ ذرا لفٹ کراؤں تو میرے ہی سر پر آ بیٹھیں۔''

''چل یہ تو تُو بڑا اچھا کرتی ہے۔ یہ نندیں بڑی خبیث مخلوق ہوتی ہیں۔'' رفعت خالہ کا خون اَب بھی جوش مار رہا تھا۔ رانی بھابی نے یقیناً کل کی ساری رام کہانی آتے ہی ان کے گوش گزار کر دی ہوگی نہ وہ پپو بھائی سے باہر کھانا کھانے کی فرمائش کرتیں اور نہ ہی اماں کا پارہ چڑھتا اچھی بھلی آلو گوبھی کی بھجیا پکی تھی پر رانی بھابی کا نان کباب کھانے کا من کر رہا تھا اور اسی پر ساری بات شروع ہوئی تھی۔

''چل مُنی...... جا تو...... دیکھ تیری اماں نے کیا پکایا ہے......''

رانی بھابی نے باقاعدہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکالتے ہوئے کہا ساتھ ساتھ ہاتھ کے اشارے سے اسے سمجھاتی جا رہی تھیں اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ستاروں والا سنہری بٹوہ سامنے ہی بیڈ کے سرہانے دھرا تھا، پر رانی بھابی اُس کے دل کی کب بات سمجھتی کہ وہ انہیں نہیں بلکہ اس سنہری بٹوہ کو دیکھنے آئی ہے۔

☆......☆......☆

ٹرین بڑی زور سے شور مچاتی جا رہی تھی وہ بھی ہمیشہ کی طرح دوسرے بچوں کے ساتھ اس گزرتی ٹرین کو دیکھنے لگی جو ہر دوسرے گھنٹے بعد اس ریلوے ٹریک پر سے گزرتی تھی۔ شہر کے اس مضافاتی علاقے میں اگر کوئی دلچسپی تھی تو ان ٹرینوں کی آمد و رفت جو پورے علاقے کے بچوں کے لیے اچانک سے خوشی کا پیغام لے کر ابھرتی تھی۔ نجانے کیوں ٹرین کے وجود کو دیکھتے ہی سب بچوں کے چہرے کھل اٹھتے تھے کوئی زور زور سے آوازیں لگاتا کوئی پتھر سے نشانے بازی کی مشق کرتا اور کوئی زور زور سے یوں ہاتھ ہلاتا جیسے ٹرین کے سارے مسافر ان کے اپنے ہوں۔ اپنوں سے دور جانے کا احساس کتنا عجیب ہوتا ہے بس ایک ہاتھ ہلانا...... اسے بھی ہاتھ ہلانا بہت اچھا لگتا تھا ایسے جیسے کسی اپنے کو جاتے ہوئے رخصت کر رہی ہو...... اس کے ننھے سے ذہن میں بس اتنا ہی گردش کرتا۔

''ٹاٹا......'' ہاتھ ہلاتے وہ زیر لب بڑبڑاتی۔

رفعت خالہ کی پڑھائی پٹی کام آ رہی تھی۔ رانی نے پپو کے ذہن میں ماں بہنوں سے الگ گھر لینے کا خیال ڈال دیا تھا پر اس کا دل کسی کسی طرح نہیں مان رہا تھا کہ جس ماں نے اس کی خواہش پر رانی کو اپنی بہو بنالیا تھا اسے اچانک چھوڑ کر کے چلا جائے۔ چھوٹی موٹی کھٹ پٹ تو ہر گھر میں چلتی ہی رہتی ہے۔ لیکن انہیں بنیاد بنا کر علیحدہ گھر لینا یہ کون سی دانشوری کا فیصلہ تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں رہتا تھا۔

''تو پھر تم نے کیا سوچا پپو جی......'' وہ بہت دُلار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔ سستے سے پرفیوم کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہ پرفیوم اس نے ہی اسے خرید کر دیا تھا۔ جتنی اس کی تنخواہ تھی اس میں ایسا ہی پرفیوم آ سکتا تھا۔ پھر علیحدہ گھر......سو طرح کے اندیشے یکا یک ابھر گئے تھے۔

''کس بارے میں......'' اس نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھیں جی...... اب اس گھر میں ہمارا گزارا مشکل ہے۔ پہلے ہی آپ کی اماں نے ہمیں الگ کر رکھا ہے۔ انہیں تو پہلے دن سے ہی مجھ سے خار ہے نجانے کس دل سے بیاہ کر لائی تھیں۔''

''ایسے نہ کہو یار! اماں نے تمہیں تمہاری وجہ سے ہی الگ کیا تھا۔ تمہیں آتے ہی گلہ ہو گیا تھا کہ میری ماں بہنیں تمہارے جہیز کی چیزیں خراب نہ کر دیں۔ تم بھی تو ہر وقت اسی طرح کی باتیں کرتی رہتی تھیں کہ فلاں چیز نہ ٹوٹ جائے۔ وہ چیز نہ گندی ہو جائے میرے کپڑے نہ کوئی خراب کر دے۔''

''طعنے دے رہے ہیں......'' اس کا منہ بن گیا۔

''نہیں......سچ کہہ رہا ہوں۔''

''سچ تو یہ ہے کہ سوچنے میں جو لگتا ہے وہ دیکھنے میں ویسا نہیں ہوتا۔'' وہ الگ ہو کر بیٹھ گئی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ سوچا تھا اپنی الگ چھوٹی سی جنت بساؤں گی۔ پر اس اسی گز کے گھر میں کیا جنت......اوپر آنے کے لیے سیڑھیاں چڑھو تو ڈر لگتا ہے کہ کوئی اینٹ ہی نہ سرک کر مجھ پر آ پڑے......'' ماضی کی ساری سہانی باتیں وحشت زدہ روحوں کی طرح سیاپا ڈال رہی تھیں۔

''تم خود سوچو...... میری بہنیں ابھی بہت چھوٹی ہیں...... مجھ سے بارہ سال چھوٹی مینا ہے، اس کے بعد ترنم پھر منی...... اتنی چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ اماں اکیلی کیسے گزارہ کرے گی، ذرا سوچو تو......'' وہ چیخ اٹھا۔

''جیسے پہلے رہتی تھیں۔ مینا، ترنم اور منی...... کیا سمجھتے ہو اتنی معصوم ہیں ناں تمہاری بہنیں...... اور وہ منی ایک دم چوٹی ہے۔'' وہ بھی بھڑ گئی۔

''دیکھو تم الزام لگا رہی ہو منی پر وہ چور نہیں ہے۔ وہ تو صحیح سے سن بھی نہیں سکتی، بولتی بھی نہیں۔'' اس سے رہا نہیں گیا۔

''ہاں ہاں بہت معصوم ہے ناں...... ہر وقت تو میرے پاس گھسی رہتی ہے۔ میری ایک ایک چیز پر اس کی نظر رہتی ہے، کب موقع ملے اور کب لے اُڑے۔''

''تم زیادتی کر رہی ہو رانی......''

''زیادتی تو تمہاری ماں بہنوں نے کی ہے میرے ساتھ......تم نے کی ہے...... کیسے کیسے سہانے سپنے دکھائے تھے اور اب معصوم بننے لگے۔''

''بتایا تھا کہ باپ نہیں سر پر...... میں ہی ہوں

اس گھر کا کرتا دھرتا...... چیخ پکار کی آواز بڑھتی ہی جارہی تھی۔ نیچے فاصلہ ہی کتنا تھا کان تو ویسے بھی لوگوں کے نئے بیاہتا جوڑے پر لگے رہتے ہیں۔

☆......☆......☆

''اماں...... بھائی کی لڑائی ہو رہی ہے بھابی سے......'' مینا نے پھر سے لگائی تو ماں نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔

''کیا میرا پپو مجھ سے الگ ہو جائے گا۔'' روایتی دھڑکا تھا۔ پپو نے کیا کہا رانی نے کیا جواب دیا انہیں کچھ خیال ہی نہ رہا سوائے اس کے کہ پپو انہیں چھوڑ کر جا سکتا ہے آثار کچھ بھی ہو نتائج انہیں ستا رہے تھے۔

رانی بھابی نے سنہری ستاروں والا بٹوہ اٹھایا اور گھوم کر اس کی جانب دیکھا اس کی چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھیں پرستائش نظروں سے بٹوے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں وہ اسے اس کی نظروں سے تولتی آگے بڑھی۔

''مُنی...... تجھے یہ بٹوہ بہت پسند ہے۔'' وہ اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گئی۔ بٹوہ مُنی کی آنکھوں کے سامنے جھلمل کر رہا تھا۔

''ہوں...... بول...... یہ اچھا لگتا ہے تجھے......'' رانی نے بٹوہ اس کی نظروں کے سامنے کرتے پُراسرار انداز میں پوچھا۔ مُنی کی نظریں تو بس سُنہری ستاروں کی چمک میں غرق تھیں۔

''یہ بٹوہ تجھے اچھا لگتا ہے تو...... تُو اسے رکھ لے......'' رانی نے بٹوہ اس کے ننھے ہاتھ میں تھمایا تو حیرت و استعجاب سے اُس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ بے یقینی کی لہریں ایک کے بعد ایک ابھرے جارہی تھیں۔

''ہاں تُو لے لے اِسے......'' اُس نے مسکراتے ہوئے مُنی کو یقین دلایا تو خوشی سے اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ رانی کو مسکراتی ہوئی مُنی بڑی عجیب سی لگی اس کے دل میں کہیں کھرچ سی لگی۔

''چل پکڑ اسے...... اور اس میں جو پیسے ہیں وہ بھی تیرے...... ٹھیک......'' مُنی نے کچھ سمجھتے ہوئے بٹوے کو کھول کر دیکھا پانچ کے چند سکے بٹوے میں چمک رہے تھے۔ خوشی اب سنبھالنی مشکل تھی۔

''اچھا سن...... کسی کو نہ بتانا...... ٹھیک ہے۔'' رانی بھابی نے اشارے سے اس سے وعدہ لیا اور مُنی نے جھٹ سر ہلا کر وعدہ وفا کرنے کا عہد بھی کر لیا۔

''تُو بہت پیاری بچی ہے...... اچھا اب جا...... جا کر کھیل...... ہوں......'' رانی نے اُسے پیار سے چمکارا اور وہ سدھائے ہوئے بیل کی طرح اس کے کہے پر چل پڑی۔

اس بٹوے میں ایسا سحر تھا کہ اس سے سنبھالے نہ سنبھل رہا تھا۔ گھر سے باہر نکلی تو ساری دنیا کی نظریں بٹوے کی جانب گھورتی محسوس ہوئی۔ بٹوے کو دنیا بھر کی نظروں سے چھپانا بھی ضروری تھا وہ بمشکل اسے اپنی قمیض کے دامن میں چھپاتی پٹڑی کی جانب چلنے لگی۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے کچھ بناء کپڑوں کے چھوٹے بڑے ہر سائز ہر عمر کے بچے کھیل میں مگن تھے۔ ان بچوں کی اپنی ہی دنیا ہوتی ہے مُنی کی دنیا ان بچوں کی دنیا جیسی تھی جن میں رنگ تو تھے پر آوازیں نہ تھیں خوشبو تو تھی پر پرندوں کی چہچہاہٹ نہ تھی۔ اس کی اپنی زندگی میں اب ایک اہم چیز شامل ہو چکی تھی سنہری ستاروں والا بٹوہ سب سے الگ جھلمل کرتا، خوبصورت بٹوہ......

پپو آج سخت چڑچڑا ہو رہا تھا اس کے ایریا منیجر نے آج اسے خوب جھاڑا تھا اک ذرا سی غلطی

پر اتنی بے عزتی، صبح سے لمبے لمبے چکر لگ رہے تھے اسکوٹر چلا چلا کر اعصاب شل ہو چکے تھے لیکن کیا کرتا نوکری تو پھر نوکری ہوتی ہے سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ قریب کے ایریا سے گزر رہا تو سوچا گھر سے ایک کپ چائے پی لی جائے۔ بڑی سڑک سے راستہ کاٹ کر شارٹ کٹ لیا پٹڑی کے پاس پہنچا تو منی دور سے ہی نظر آ گئی۔

''افوہ...... اماں کو کتنی بار منع کیا ہے اسے اکیلا نہ چھوڑا کریں۔ بچی ہی تو ہے پر اماں بھی......''

کوفت سے اس نے سوچا پھر چیخ کر منی کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا پر وہ اپنی ہی دنیا میں مگن تھی اپنے آپ سے باتیں کرتی جا رہی تھی شاید اس نے اپنی قمیض میں گڑیا چھپائی ہوئی تھی۔

''منی......'' اس نے پھر چیخ کر اسے پکارا اتنے میں ٹرین کا سگنل روشن ہوا اور پھاٹک کے دروازے بند ہو گئے اب وہ اسکوٹر لے کر راستہ عبور نہ کر سکتا تھا۔ ٹرین گزرنے کا تو انتظار کرنا ہی تھا۔ اپنے اوپر سخت غصہ آیا، اسکوٹر سے اترا اور سوچا منی کو بھی ساتھ لے لے۔

''اے منی...... سن تو بہری......'' اس کی آواز منی کے قریب بچے نے سن لی تھی اس نے منی کو شانے سے جھنجھوڑا۔ منی نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی نظریں پپو کی نظروں سے ٹکرائیں۔ پپو نے اُسے آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی منی کے چہرے پر خوف کا سایہ لہرایا اس نے تیز رفتاری سے ریل کی پٹڑی کے متوازی دوڑنا شروع کر دیا۔

''منی...... او منی...... ارے......'' اسے یوں دوڑتا دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ دور سے ٹرین نقطے کی مانند سے بڑھتی جا رہی تھی۔

''منی...... رک......'' پپو کے ہاتھ پیر پھول گئے وہ اس کے پیچھے دوڑنے لگا اونچی نیچی راہیں چھوٹے بڑے گول کھردرے پتھر...... پر وہ دوڑتا چلا گیا، اس کے ذہن پر صرف منی سوار تھی۔ اس کے اور منی کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا وہ ہر صورت دوڑ کر منی کو پکڑنا چاہ رہا تھا ٹرین کی سیٹی بالکل اس کے کان پر ہی بجی اور جیسے اس کی سماعت بیکار ہو گئی ہو۔

''منی۔'' اُس نے منی کو دبوچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ رونے لگا۔ نجانے کیسے بٹوہ منی کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹرین کی پٹڑی پر جا گرا تھا۔ منی کو پہلی بار محسوس ہوا کہ اس کے اردگرد آوازیں ہی آوازیں ہیں۔ پپو کے رونے کی آواز، ٹرین کی چھک چھک اور لوگوں کی آوازوں کی بھنبھناہٹ، یہ سب کچھ بالکل نیا تھا اس کے لیے ''خدا کا شکر ہے بچی کی جان بچ گئی۔''

''بھائی ہے شاید......''

''بھائی ہی ہے، کوئی اور ہمت کر سکتا ہے بھلا......''

''بس خدا سب بہنوں کے بھائیوں کو سلامت رکھے آمین۔''

''منی...... میری منی۔'' پپو بے ساختہ اس کا منہ چوم رہا تھا وہ ایک قافلے کی صورت میں اپنی اسکوٹر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جیسے کوئی فاتح، کوئی ہیرو یا لیڈر ہو، منی اس کی گود میں تھی اور منی کی نظریں دور پٹڑی کی جانب تھیں۔ ٹرین کے بھاری فولادی پہیوں تلے سنہری ستاروں کی جھلمل بالکل ماند پڑ گئی تھی۔ پپو نے اسکوٹر اسٹارٹ کی اور منی کو آگے بٹھایا اس کی آنکھوں میں اب بھی ستارے جھلملا رہے تھے لیکن ان کی چمک سنہری ستاروں والے بٹوے کی چمک سے کہیں زیادہ تھی۔

☆☆......☆☆......☆☆

ناولٹ
بنت حوا

خانہ بدوش

''آئندہ خالہ کے ساتھ مت جانا'' پلوشہ کو اس کی جھونپڑی کے آگے چھوڑتے ہوئے اس نے ایک بار پھر تنبیہ کی تھی۔ ''میں نہیں جاتی وہ تو اماں ہی کبھی کبھی اتنی ضد کرلیتی ہے تو'' وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی سارنگ کو بے اختیار ہی اس پر ڈھیروں......

گرمیوں کی دھوپ منڈیر پر بیٹھی اس چھوٹے سے صحن میں تانک جھانک کر رہی تھی جہاں ایک ادھیڑ عمر کی عورت ناشتہ بنانے کے ساتھ ساتھ چولھے کے گرد بیٹھے بچوں سے باتیں بھی کیے جا رہی تھی۔ عام طور پر اس گھر کے مکین دھوپ سے پہلے ہی ناشتے کے علاوہ گھر کے باقی روزمرہ کے کاموں سے بھی فارغ ہو جایا کرتے تھے لیکن گرمیوں کی چھٹیاں اس روٹین پر اثر انداز ہو جایا کرتی تھیں یہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ پانچ چھ سالہ ہما جو دوسرے دونوں لڑکوں سے چھوٹی تھی اور کم گو بھی اس وقت بھی ان سب کی باتوں سے بے نیاز دکھائی دے رہی تھی ہاں البتہ غور کرنے والے کو یہ بات بڑی آسانی سے پتا چل سکتی تھی کہ اس کی توجہ ناشتے کی طرف بھی نہیں ہے بلکہ وہ خاصی بے چین ہے اور چند قدم کے فاصلے پر موجود لکڑی سے بنے بیرونی دروازے کی طرف بار بار جاتی اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ شاید کسی کی آمد کی منتظر ہے۔ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے یہ کیا! روٹی تو ختم کرو اپنی'' ناشتہ بناتی دادی نے اس کے اس طرح اٹھنے پر بے اختیار کہا تھا مگر وہ کوئی بھی جواب دیے بنا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی تو دادی رزق کی اس ناقدری پر غصے سے بڑبڑانے لگی۔ لڑکے اس بڑبڑاہٹ سے بے نیاز ناشتہ کرنے میں مگن تھے۔

''آج ہے تو جمعرات ہی پھر وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں؟'' بیرونی دروازے کے باہر گھر کے آگے بنے سیمنٹ کے چبوترے پر بیٹھی ہما آنکھوں میں الجھن لیے دل ہی دل میں خود سے ہمکلام تھی ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ گلی کے موڑ سے ایک لڑکی گلی میں آتی دکھائی دینے لگی۔ ہما کے لب مسکرانے لگے اور وہ چبوترے سے اٹھ کر گھر کے اندر چلی آئی اب وہ صحن میں بیٹھی اس لڑکی کے آنے کی منتظر تھی اس کی نظریں بیرونی دروازے پر لٹکے پردے پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی جس نے خوب کڑھائی

والا پٹھانیوں کا مخصوص فراک پہنا ہوا تھا بڑا سا چادر نما دوپٹا سر پر لیے ان کے دروازے پر آن کھڑی ہوئی، ہمیشہ کی طرح نہ تو اس نے کوئی صدا لگائی اور نہ ہی کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوئی کوشش کی، وہ نظریں جھکائے یوں کھڑی تھی جیسے کوئی مجرم عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوتا ہے

۔سرخ وسفید رنگت دلکش خدو خال اور نازک سراپے والی وہ لڑکی کہیں کی راجکماری معلوم ہوتی تھی کم از کم ہما کو تو ایسا ہی لگتا تھا جیسے وہ کہیں کی شہزادی ہے جو اپنوں سے بچھڑ کر یہاں آگئی ہے ۔بائیں کاندھے پر لٹکا کپڑے کا بڑا سا تھیلا اور دائیں ہاتھ میں تھاما کشکول اس کی شخصیت سے بالکل بھی میل نہ کھاتا تھا۔

''دادی ۔۔پٹھانی آگئی'' دادی جو ناشتہ بنانے کے بعد چولھے کی گرد پھیلا سامان سمیٹنے میں مصروف تھی ہما کی آواز پر چونکی اور پھر کچھ بھی کہے بغیر خشک آٹے کی کٹوری بھر کر ہما کی طرف بڑھا دی جیسے یہ ان کے معمولات میں شامل ہو۔ ہما نے بھی وہ کٹوری تھامی اور جا کر سارا آٹا پٹھانی کے کشکول میں پلٹ دیا۔اس لمحے میں ہما نے ہمیشہ کی طرح ایک عجیب سا دکھ اور شرمندگی کا احساس اپنے اندر اترتا محسوس کیا۔اسے لگا کہ پٹھانی کے چہرے پر چھائے حزن و ملال میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے اس کی سرخ رنگت والے گال شرم سے کچھ اور سرخ ہو گئے ہیں۔

ہما کا دل دکھ سے بھر گیا اور آنکھوں میں آنسو اترنے لگے تو وہ دروازے سے پلٹ آئی پٹھانی بھی اسی طرح نظریں جھکائے ہوئے اگلے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

''خالہ تھوڑی چائے کی پتی مل جائے گی۔ مجھے رات منگانا یاد ہی نہیں رہی اور اب بچے چائے مانگ رہے ہیں۔'' ہمسائی دروازے پر کھڑی پوچھ رہی تھی۔

''چائے کی پتی تو نہیں ہے تم تو جانتی ہو ہمارے گھر میں تو شدید سردیوں میں ہی کبھی کبھار ہی چائے پی جاتی ہے اور اب تو اتنی گرمیاں ہیں چائے کی پتی منگا کے کیا کرتی'' ہما کی دادی ناشتے کا بکھیڑا سمیٹ چکی تھی اور اب سیڑھیوں میں جا بیٹھی تھی۔ دونوں لڑکے کمرے میں جا کر کھیل میں لگ گئے تھے جبکہ ہما اسی طرح کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔

''ارے ہاں مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں رہا، گرمی تو آج ابھی سے بہت زیادہ ہے دیکھو دن کیسے گزرے گا ، پٹھانی آپ کے گھر سے ہو گئی ہے؟'' باتونی ہمسائی چائے کی پتی کو بھول بھال باتیں کرنے میں مگن ہو گئی۔

''ہاں چلی گئی ،کیسی قسمت ہے اس بیچاری کی بھی'' دادی نے افسوس اور ترحم بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''سچ کہتی ہو خالہ رُل گئی یہ بیچاری تو'' ان کے پاس کھڑی ہما کو معلوم تھا کہ اب پٹھانی کی پوری کہانی دہرائی جائے گی وہ کہانی جو وہ ہوش سنبھالنے سے سنتی چلی آرہی تھی لیکن ہر بار سننے پر وہ اپنے دل میں دکھ اور افسوس کے احساسات کو پہلے سے زیادہ اور ایک نئے سرے سے ابھرتا ہوا محسوس کرتی تھی۔آج بھی ہما خاموشی سے اپنی دادی اور ہمسائی کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے لگی۔

☆.........☆.........☆

آہٹ پر اس بچے نے تیزی سے اپنے ہاتھ میں تھامی وہ کتاب اپنے گھٹنے کے نیچے چھپا دی مگر آنے والا اس کی اس حرکت کو دیکھ چکا تھا۔

''کیا چھپایا ہے تُو نے؟'' غصیلے لہجے میں پوچھے گئے اس سوال نے بچے پر گھبراہٹ طاری کر دی۔

''کچھ بھی نہیں ابا میں نے کیا چھپانا ہے بھلا'' بچے نے بھی اپنی مادری زبان میں زبان دیا۔

''مجھ سے بکواس کرتا ہے دکھا مجھے کیا چھپایا ہے'' اس نے بازو سے پکڑ کر بچے کو اس کی جگہ پر کھڑا کر دیا۔اب کتاب اس کے سامنے تھی اور اس کی

آنکھوں سے غصے کے ساتھ ساتھ حیرت بھی جھلکنے لگی۔

''کتاب...... یہ کہاں سے لایا تو؟ یہ تو نئی لگتی ہے چوری کی ہے کیا تُو نے؟'' وہ کڑے تیوروں سے بچے کو گھورتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں ابا میں چوری نہیں کرتا۔''

''چوری نہیں کرتا تو کیا تیری ماں کے یار نے تجھے پیسے دیے نئی کتاب لانے کے لیے۔'' اس نے بنا سوچے سمجھے غصے سے بولتے ہوئے زوردار تھپڑ بچے کے دائیں گال پر مارا۔

''دیکھ ابا میں نے کہا نا میں نے چوری نہیں کی اماں مجھے جو پیسے دیتی ہے میں نے وہ جمع کر کے ان پیسوں سے یہ کتاب لی ہے اور تُو اس طرح میری ماں کو گالی مت دیا کر۔'' گال پر ہونے والی تکلیف کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جنہیں وہ بمشکل بہنے سے روکتے ہوئے گال پر ہاتھ رکھے سنجیدہ لہجے میں باپ سے مخاطب تھا۔

''اچھا تو اب میں تجھ سے پوچھ کر سب کچھ کیا کروں گا، تیری اوقات بتاتا ہوں میں تجھے'' باپ کا ہاتھ ایک بار پھر اٹھا تھا اور اس کے گالوں پر باپ کی انگلیوں کے نشان ابھر آئے تھے۔ جانے زیادہ غصہ کس بات پر تھا اس کے کتاب لینے پر یا ماں کی حمایت میں باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہونے پر۔ وہ اس کی چیخوں کی پرواہ کیے بنا اسے تھپڑ اور مکوں سے مارے جا رہا تھا۔

''ارے بس کر چھوڑ اسے مار ہی ڈالے گا کیا'' دوسری جھونپڑیوں کے لوگ آوازیں سن کر وہیں چلے آئے تھے اور اب بچے کو اس کے ہاتھوں سے چھڑاتے ہوئے اسے سمجھانے میں مصروف تھے۔ بچہ اسی طرح روتا ہوا ایک طرف بڑھتا چلا گیا اور چلتے چلتے اپنے لوگوں سے بہت دور آ گیا۔ سامنے بنے کھیتوں کے درمیان بنی چھوٹی سی پگڈنڈی اس کی جانی پہچانی تھی اور کھیتوں کے دوسری طرف لگا وہ بڑا سا درخت جس کا نام تو اسے نہیں آتا تھا مگر اتنا ضرور تھا کہ اس شہر میں آنے کے بعد وہ درخت اس کی جائے پناہ بنا ہوا تھا۔ الٹے ہاتھ سے آنسوؤں کو پونچھتا وہ پگڈنڈی پار کر کے اس درخت کی طرف بڑھ گیا جس کی باہر نکلی جڑوں پر بیٹھ کر وہ گھنٹوں اپنی سوچوں میں گم رہا کرتا تھا۔

☆......☆......☆

یہ کوٹ ادو میں ریلوے اسٹیشن کے قریب پڑے خالی میدان میں لگی خانہ بدوشوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ یہ لوگ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے جانے کہاں سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے جیسا کہ خانہ بدوشوں کی زندگی گزرتی ہے جہاں جگہ ملی وہیں پڑاؤ ڈال لیا اور پھر جب تک کوئی مجبوری یا ضرورت نہ ہوئی سالوں وہیں اسی شہر میں گزار دیے ایسے ہی اس گروہ کا فی الحال ٹھکانہ کوٹ ادو کا یہ خالی میدان تھا اور جانے کب تک انہوں نے یہیں رہنا تھا اس کے بارے میں انہیں خود بھی معلوم نہ تھا۔

بستی کے زیادہ تر لوگ بھیک مانگ کر اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرتے تھے کچھ کے پاس بکریاں بھیڑیں بھی تھیں۔ جن کے دودھ سے وہ اپنی خوراک حاصل کرتے اور کبھی کبھار ان کو بیچ کر بھی کچھ منافع حاصل کر لیا جاتا۔ سارنگ بھی اسی بستی کا حصہ تھا۔ رنگ برنگے کپڑوں سے بنی اس جھونپڑی میں جس میں جانے کتنے چھید تھے، جن میں گزر کر آنے والی ہوا سردی اور گرمی دونوں موسموں کو جھونپڑی کے اندر کھینچ لایا کرتی تھی۔ اس جھونپڑی میں سارنگ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ بستی کے زیادہ تر لوگوں کی طرح اس کے ماں باپ بھی بھیک مانگا کرتے تھے، سارنگ ان کی اکلوتی

اولاد نہ تھا اس سے بڑی ایک بیٹی بھی تھی وہ بھی ماں باپ کے ساتھ بھیک مانگنے جایا کرتی اور پوری طرح خوش اور مطمئن دکھائی دیتی تھی بس ایک سارنگ تھا جو اس ماحول میں بے چین دکھائی دیا کرتا۔ اپنی عمر سے بڑی سوچ رکھنے والا سارنگ بھیک مانگنے سے نفرت کرتا تھا اور پڑھ لکھ کر عزت والی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ اس کی اس سوچ پر اس کے گھر والے خاصے نالاں دکھائی دیتے تھے۔ ایک ہی بیٹا اور وہ بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دیتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر اپنے باپ کے عتاب کا شکار ہوتا جبکہ ماں مارتی تو نہیں تھی مگر اکثر اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کیا کرتی تھی۔ اس کے دل میں شاید یہ خوف بھی تھا کہ کہیں اپنی اس سوچ اور طرز زندگی کی بنا پر اس کا بیٹا ہمیشہ کے لیے اس سے دور نہ ہو جائے مگر ان سب باتوں سے بے نیاز سارنگ اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا۔

☆......☆......☆

سورج ابھی پوری طرح مغرب میں نہیں اترا تھا کہ فضا میں ٹھنڈک اتر آئی۔ دل میں اس بات کا یقین ہونے کے خیال سے کہ اب تک ابا کا غصہ اتر چکا ہوا سارنگ واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں وہی کتاب تھی جسے وہ مار کھاتے کھاتے بھی اٹھانا نہیں بھولا تھا کیونکہ اسے پکا یقین تھا کہ ابا کے ہاتھ لگتی تو وہ اسے پھاڑ کر پھینک دے گا اور سارنگ اس نقصان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کتاب کو بغل میں چھپائے جس وقت وہ بستی میں داخل ہوا بستی میں کئی جگہوں سے اٹھتا دھواں رات کے کھانے کی تیاری کی خبر دے رہا تھا۔ کھانے کا سوچ کر اسے شدت سے اپنے بھوکا ہونے کا احساس ستانے لگا۔ وہ دبے قدموں اپنی جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ اس کی ماں اور بہن دن بھر بھیک مانگنے کے بعد بستی لوٹ آئی تھیں اور اب تیزی سے رات کا کھانا بنانے میں لگی ہوئی تھیں۔

''کہاں تھا تو پتا ہے کتنا ڈھونڈا تجھے سب نے۔''

سارنگ پر نظر پڑتے ہی اس کی بہن شمی نے سوال کیا شمی کے بولنے پر ماں بھی اس کی طرف متوجہ ہوگئی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا اور بے تحاشہ اس کے گالوں کو چومنے لگی۔ ماں کے بوسوں سے سارنگ کو اپنی گالوں کی تکلیف کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی اور اس محبت پر سارنگ کی آنکھیں ایک بار پھر خاموشی سے آنسو برسانے لگی۔

بستی کے لوگوں نے آتے ہی اسے آج ہونے والی سارنگ کی پٹائی کی داستان نمک مرچ لگا کر سنا دی تھی۔

''بیٹے کے لاڈ ختم ہو گئے ہوں تو مجھے روٹی دے دے، آج کہیں سے گوشت کا سالن ملا ہو تو وہ بھی دے دینا'' سارنگ کا باپ جانے کب آ کھڑا ہوا تھا انہیں خبر نہ ہوئی۔ شوہر کی آواز سنتے ہی اس نے بیٹے کو چھوڑ دیا۔ سارنگ چپ چاپ جھونپڑی میں چلا آیا۔ اس کی بھوک اچانک ہی ختم ہو گئی تھی۔ نیم اندھیری جھونپڑی میں بیٹھتے ہوئے سارنگ کو اپنے جسم میں ڈھیروں تھکن اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

''اے شمی بات سن ذرا'' شمی کے ماں باپ اپنے کام پر جا چکے تھے سارنگ بھی صبح سے کہیں نکلا ہوا تھا شمی کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہ تھی اسی لیے وہ دھوپ نکلنے کے بعد گھر سے نکلی تھی تاکہ سردی کی وجہ سے اس کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے تبھی منگو کی آواز پر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''تو ابھی تک یہیں ہے گیا نہیں؟'' شمی اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھنے لگی منگو بھی شمی اور اس

کے ماں باپ کی طرح بھیک مانگا کرتا تھا اور اس کا رشتہ بہت بچپن سے ہی شمی سے طے کر دیا گیا تھا لیکن اس رشتے کی شرط بھی وہی تھی جو ان کے ہاں ہوا کرتی تھی کہ لڑکا جس لڑکی سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے لڑکی کے ماں باپ اسے اپنی مطلوبہ رقم بتا دیتے ہیں اگر لڑکا وہ رقم جمع کر کے لڑکی کے گھر والوں کو دے دے تو شادی ہو جاتی ہے۔ منگو بھی وہی مطلوبہ رقم جمع کرنے میں لگا ہوا تھا جس کے فوراً بعد اس کی شادی شمی سے کر دی جاتی۔

''مجھے پتا لگا تیری طبیعت خراب ہے تو بس تیری خیریت پوچھنے کے لیے رک گیا تھا'' منگو نے پیار بھری نظروں سے شمی کو دیکھتے ہوئے کہا تو شمی کا دل احساس تفاخر سے بھر گیا چاہے جانے کا احساس ایسا ہو خوشگوار ہوا کرتا ہے۔

''کام چور کہیں کے مجھے اچھی طرح پتا ہے تجھے میری کتنی فکر ہے، صاف کہہ کہ آج کام پہ جانے کا من نہیں'' شمی کے دل میں کچھ اور سننے کی خواہش سر اٹھانے لگی۔

''مجھے تیری کتنی فکر ہے یہ میں تجھے بتا نہیں سکتا ابھی بس اتنا سمجھ لے کہ دنیا میں ایک بس تیری ہی فکر ہے۔'' منگو نے خالص عاشقانہ سٹائل میں کہتے ہوئے شمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

''یہ کیا کرتے ہو اگر کسی نے دیکھ لیا تو ابا کو شکایت کر دے گا اور میرے ابا کو تو تُو جانتا ہی ہے چمڑی اتار دے گا میری'' شمی اس کے انداز سے گھبرا کر اب ابا سے ڈرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ایسے ہی خوامخواہ تیرا ابا کچھ کہہ کر تو دکھائے آخر منگ ہو میری۔''

''ہاں منگ ہوں تیری مگر جانے کب تک۔'' شمی یہ کہتے ہوئے اداس دکھائی دینے لگی۔

''کیا مطلب ہوا اس بات کا؟ ارادے کیا ہیں تیرے ابا کے صاف صاف بتا تو مجھے۔'' منگو اس کی بات سے پریشان ہو گیا تھا۔

''کوئی آدمی ہے دو چار دن سے ابا کا دوست بنا ہوا ہے اس نے ابا کو کہا ہے کہ وہ میرے بدلے میں ابا کو بہت اچھے پیسے دلوا سکتا ہے'' شمی آہستہ آہستہ ساری بات بتاتی چلی گئی۔

''اور تیرا ابا مان گیا؟'' منگو کا غصے سے برا حال تھا۔

''مانا نہیں تو مان جائے گا۔ تجھے پتا تو ہے ہماری برادری میں جو اچھی قیمت دے بیٹی اسی کے حوالے کر دی جاتی ہے۔'' شمی نے نظریں جھکا کر بیچارگی سے جواب دیا۔

''تُو فکر نہ کر میں آج ہی اپنے اماں ابا کو تیرے گھر بھیجتا ہوں ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہوا، آخر زبان کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے کہ نہیں۔'' منگو کو سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کسی بھی طرح ابھی اسی وقت شمی کو لے کر وہاں سے غائب ہو جائے۔

''اچھا اب تو کام پہ جا مجھے بھی دیر ہو رہی ہے'' شمی نے کوئی جواب دیئے بنا یہ کہتے ہوئے آگے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ منگو کچھ دیر وہیں کھڑا شمی کو جاتے دیکھتا رہا پھر خود بھی شہر جانے کے راستے پر چل پڑا لیکن اس کا ذہن شمی کی باتوں میں ہی الجھا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

''چلو بس آج کے لیے اتنا سبق کافی ہے باقی کل پڑھیں گے بلکہ کل نہیں کل مجھے کام سے ملتان جانا ہے ایک دو دن لگ جائیں گے'' کھلتی ہوئی گندمی رنگت والا وہ نوجوان اپنے سامنے بیٹھے سارنگ سے مخاطب تھا۔ وہ دیکھنے میں پچیس اور تیس کے درمیان کی عمر کا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا نام نعیم تھا وہ سرکاری سکول میں استاد

تھا اور کوٹ ادو کا ہی رہنے والا تھا۔ سارنگ کو اپنے لوگوں کے ساتھ کوٹ ادو آئے ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے جب ایک دن اپنے خیالوں میں گم چلتا سارنگ اچانک ہی سکول سے واپس آتے نعیم کے موٹر سائیکل سے ٹکرا گیا تھا چونکہ رفتار خاصی کم تھی اسی لیے بچت ہو گئی تھی سنہری رنگت والا خوبصورت سا سارنگ نعیم کو بہت اچھا لگا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اس سے بہت ساری باتیں پوچھ لی تھیں اور اگلے دن سارنگ سے ملنے کا وعدہ لیتا نعیم اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ گھر جا کر اس نے اپنی بیوی رابعہ کو بھی سارنگ کے بارے میں بتایا تھا۔ اس نے خانہ بدوشوں کو پہلی بار نہیں دیکھا تھا ایسے لوگ اکثر ان کے شہر میں آتے ہی رہتے تھے لیکن سارنگ میں جانے اسے کون سی ایسی بات نظر آئی تھی کہ وہ اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ لے بیٹھا تھا۔ اور دوسری ملاقات میں نعیم جان گیا تھا کہ وہ بچہ اپنی بستی کے سب لوگوں سے یکسر مختلف تھا۔ سارنگ کو پڑھنے کا شوق تھا نعیم نے اسے پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ اچھا طالب علم ثابت ہو رہا تھا محبت اور خلوص کا گہرا رشتہ ان کے درمیان پنپ رہا تھا آج بھی وہ نعیم کی بیٹھک میں پڑھنے آیا ہوا تھا یہ اور بات کہ ابھی تک سارنگ کے ماں باپ نعیم سے ناواقف تھے۔

''اتنے دن بعد آئیں گے آپ ملتان سے میں تو بہت بور ہو جاؤں گا'' سارنگ منہ بسور کر بولا تو نعیم بے اختیار ہنس پڑا۔

''اتنے دن نہیں صرف دو دن، اور بور کیوں ہو گے، پچھلے سارے سبق اچھی طرح دہرا لینا میں ٹیسٹ لوں گا واپس آ کر'' سارنگ سے بات کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر وہی مخصوص مسکراہٹ تھی جو اپنے طالب علموں سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ اس کے ہونٹوں پر دکھائی دیا کرتی تھی۔

''کیا بات ہے کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' سارنگ کو شش و پنج میں دیکھ کر نعیم نے سوال کیا جواب میں سارنگ نے پچھلے دن کے سارے واقعات کہہ سنائے۔

''میں اب اپنی کوئی کتاب اپنے ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا سر۔ کل تو بچ گئی میری کتاب لیکن آگے کبھی ابا کے ہاتھ لگی تو وہ انہیں پھاڑ دے گا یا چولھے میں ڈال دے گا۔''

''ٹھیک ہے تم اپنی کوئی کتاب ساتھ مت لے جاؤ یہیں آ کر پڑھ لیا کرو'' سارنگ کی پریشانی بھانپتے ہوئے نعیم نے تسلی بھرے انداز میں جواب دیا کچھ دیر اور بیٹھ کر سارنگ بستی آنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اسے اپنے گھر والوں کے لوٹنے سے پہلے گھر واپس پہنچنا تھا۔

☆......☆......☆

سارنگ اپنی بستی میں پہنچا تو غیر متوقع طور پر اس کا باپ بستی واپس آ چکا تھا۔

''ادھر آؤ؟ کہاں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو'' سارنگ نے کترا کر گزرنا چاہا مگر باپ اسے دیکھ چکا تھا اور اب اس کے پاس جا کر جواب دینے کے علاوہ سارنگ کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔

''کتنے پیسے ملے آج تمہیں؟'' باپ کے سوال پر سارنگ کسمسا کر رہ گیا۔

''کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے۔ بتاؤ کتنے پیسے ہیں؟'' جواب جاننے کے باوجود سوال دہرایا گیا۔

''میں بھیک نہیں مانگتا'' سارنگ کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ باپ اس پر ٹوٹ پڑا۔

''وزیراعظم کی اولاد ہے۔ بھیک نہیں مانگے گا سیدھا کرتا ہوں میں آج تجھے'' اس کے بعد وہ

اس وقت تک سارنگ پر طاقت آزمائی کرتا رہا جب تک وہ مار کھا کھا کے ادھ موا نہ ہو گیا۔

''کل سے میں یہ بکواس نہ سنوں اگر ہمارے ساتھ رہنا ہے تو کما کر لانا ہوگا ورنہ دفع ہو جا یہاں سے، تیرے جیسے نکمے نکھٹو کے لیے ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں'' ماں کے آنے تک سارنگ وہیں زمین پر بے ہوش پڑا رہا ماں واپس آئی تو ساری بات کی خبر ہوئی۔ اسے اٹھا کر جھونپڑی میں لٹایا اور ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگی جلد ہی اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں، اس رات سارنگ کے ماں باپ کے درمیان خوب لڑائی ہوئی۔ وہ چپ چاپ پڑا سب کچھ سنتا رہا اور دل ہی دل میں ہمیشہ کے لیے بستی چھوڑ دینے کے منصوبے بناتا رہا ''لیکن کیا میں اماں اور شمی کے بغیر زندہ رہ پاؤں گا؟'' اسے زندگی میں پہلی بار اندازہ ہوا کہ ان کے کام کو نا پسند کرنے کے باوجود وہ ان سے کتنی محبت کرتا ہے حتیٰ کہ اپنے باپ سے بھی۔

نیند میں جانے سے قبل وہ یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ ان سب کو چھوڑنا اس کے لیے ممکن نہیں۔

☆......☆......☆

اگلی صبح اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی لیکن جب وہ جاگا تو اپنی ماں کو اپنے پاس بیٹھے دیکھا۔

''اماں تُو آج گئی نہیں؟'' اس نے بے اختیار سوال کیا۔

''تجھے ایسی حالت میں چھوڑ کے کیسے جاتی؟ اب اٹھ جا کچھ کھا پی لے پھر میں گرم پانی سے تیرے جسم کی ٹکور کر دیتی ہوں، میں دوا بھی لے آئی ہوں دیکھنا شام تک اچھا ہو جائے گا'' وہ تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دینے لگی اس کی فکرمندی سارنگ کی آنکھوں میں آنسو لے آئی فقیر ہو یا ملکہ ماں تو بس ماں ہوتی ہے۔

''میں بھلا اس محبت کے بنا جی پاؤں گا کبھی؟'' اس نے خود سے سوال کیا تھا اور جواب میں بڑی شدت سے ''نہیں'' کا جواب ملا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دوا کھا کے پھر سو گیا تھا ماں نے جسم پر چوٹ کی دوا بھی لگا دی تھی۔ رات تک وہ کافی بہتر محسوس کر رہا تھا لیکن اب اس کا ذہن ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ اسے پیسہ کمانا ہے مگر کیسے؟ بس یہی سوال اسے الجھا رہا تھا وہ جلد از جلد نعیم سے ملنا چاہتا تھا لیکن وہ ابھی ملتان میں تھا۔

اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ جھونپڑی میں اکیلا تھا گھر کے سارے افراد اپنے کام کے لیے نکل گئے تھے اس کے سرہانے اس کا کھانا رکھا تھا، کھانا دیکھ کر اسے شدت سے بھوک کا احساس ہوا تو وہ جلدی جلدی روٹی کھانے لگا۔ ابھی وہ روٹی کھا ہی رہا تھا کہ باہر سے آتی آوازوں نے اس کی توجہ کھینچ لی وہ باہر نکلا تو دیکھا بستی کی عمر رسیدہ خواتین میں سے دو تین اس کی خالہ کی جھونپڑی کے گرد اکٹھی تھیں اسے کچھ سمجھ نہ آئی تو اٹھ کر وہیں چلا آیا۔

''کیا بات ہے ماسی کیا ہوا ہے؟'' اس نے ایک عورت سے پوچھا جو ہاتھ میں کچھ سامان اٹھائے جھونپڑی میں داخل ہو رہی تھی۔ مگر وہ اُس کی بات کا کوئی جواب دیے بنا تیزی سے اندر چلی گئی۔ وہ بے چین سا جھونپڑی کے سامنے بیٹھا رہا۔ آخر اس نے جھونپڑی سے ایک ننھے بچے کے رونے کی آواز سنی۔

''مبارک ہو چھوری آئی ہے'' اسے ایک خاتون کی آواز سنائی دی جو یقیناً اس کی خالہ سے مخاطب تھی۔ ان کے ہاں کچھ چیزیں دنیا سے ہٹ کر تھیں لوگ دعاؤں میں لڑکے مانگتے ہیں مگر ان کے ہاں بیٹی کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی تھیں کیونکہ بیٹی

کی شادی پر انہیں منہ مانگی رقم مل جاتی جبکہ بیٹے پیدا ہونے کا مطلب تھا خرچہ۔ خالہ کے پہلے چار بچے تھے لیکن بد قسمتی سے سارے کے سارے لڑکے تھے یہ پہلی بیٹی تھی۔ وہ کافی تھکن محسوس کر رہا تھا اس لیے دوبارہ آکر اپنے جھونپڑے میں لیٹ گیا پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگی۔

نیند سے جاگا تو اس کی بستی کے تقریباً سبھی لوگ واپس آچکے تھے۔ شمی روٹی پکا رہی تھی اماں خالہ کے پاس گئی ہوئی تھی اور ابا باہر دوسرے مردوں کے ساتھ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

''روٹی کھائے گا؟'' شمی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے شمی کے پاس بیٹھ گیا روٹی سامنے آئی تو خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ تبھی اسے اماں آتی دکھائی دی۔

''میں تیری منگنی کر آئی ہوں'' اس نے آتے ہی خبر سنائی سارنگ حیران نظروں سے اسے دیکھے گیا جبکہ شمی مسکرانے لگی تھی۔

''تو پلوشہ سے ملا؟'' ماں پھر سارنگ سے مخاطب تھی۔

''پلوشہ کون؟'' اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس نام کی کسی لڑکی سے وہ واقف نہیں تھا۔ اس کی بستی میں پلوشہ نام کی دو تین خواتین تھیں مگر وہ ان سے کیوں ملتا اسی لیے وہ اس سوال پر حیران ہوا تھا۔

''ارے پلوشہ تیری منگیتر کی بات کر رہی ہوں'' ماں اس کی حیرت بھانپ کر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''آ چل میں تجھے ملواتی ہوں'' وہ اس کا ہاتھ تھامے واپس مڑ گئی وہ بنا کچھ کہے ماں کے ساتھ چلتا رہا خالہ چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ بستی کی کچھ اور عورتیں بھی وہاں موجود تھیں اور ادھر اُدھر کی باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔

''یہ لے بازو پھیلا۔'' ماں کے کہنے پر اس نے بے اختیار بازو پھیلا دیے۔ ماں نے وہ ننھا وجود اس کے بازوؤں میں تھما دیا۔ بلی آنکھیں خوب گوری رنگت والی وہ ننھی پری سارنگ کو بے حد اچھی لگی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر ماں کے ہاتھوں میں تھما کر واپس اپنی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔

''سارنگ سن ذرا رک تو'' پیچھے ماں نے اسے پکارا تو وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا جو تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی طرف آرہی تھی۔

''کیسی لگی تجھے پلوشہ؟''

''بہت پیاری ہے۔'' سارنگ نے فوراً جواب دیا۔

''دیکھ بیٹا اب تو آٹھ سال کا ہو گیا ہے آج تک میں نے تجھے کچھ نہیں کہا لیکن اب تجھے ہمارے ساتھ مانگنے جانا پڑے گا کیونکہ پلوشہ کے بڑے ہونے تک تجھے پیسہ جمع کرنا ہوگا ورنہ تیری شادی پلوشہ سے نہیں ہوگی بلکہ پیسہ جمع نہ کیا تو کوئی بھی تجھے اپنی بیٹی نہیں دے گا۔'' ماں نے دوسرے انداز میں اسے اپنے ساتھ جانے کے لیے اس کا ذہن بنانے کی کوشش کی لیکن وہ بدک گیا۔

''اماں میں بھیک نہیں مانگوں گا'' وہ سخت لہجے میں کہتا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی عمر کے لڑکے کھیلنے میں مصروف تھے وہ بھی ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گیا اور پھر رات دیر تک ان کے ساتھ ہی رہا۔

☆......☆......☆

نعیم کو ملتان گئے تیسرا دن تھا اور سارنگ نے ان تین دنوں میں نعیم کے گھر کے جانے کتنے چکر

لگا لیے تھے۔ وہ دکھی تھا اور بے چین بھی۔ جانے کیوں جب سے اماں نے پلوشہ سے اس کا رشتہ طے کیا تھا وہ اتنا کم عمر ہونے کے باوجود اپنے کاندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔

تیسرے دن عصر کے وقت وہ پھر نعیم کے دروازے پر کھڑا تھا اور اس کی خوش قسمتی کہ نعیم بھی کچھ دیر پہلے ہی گھر پہنچا تھا۔ اس نے ان تین دنوں میں ہونے والی ایک ایک بات تفصیل سے نعیم کو بتا دی تھی۔

''میں کمانا چاہتا ہوں سر'' سب بتانے کے بعد اس نے کہا تھا۔

''کیا مطلب تم اپنے ماں باپ والا پیشہ اپنانا چاہتے ہو؟''

''نہیں ہرگز نہیں وہ کام میں کبھی نہیں کرسکتا، آپ مجھے کہیں کام دلوا دو۔ میں محنت مزدوری جو بھی ملے کرلوں گا'' سارنگ نے جیسے التجا کی۔

''لیکن تم تو پڑھنا چاہتے تھے کام کرو گے تو پڑھائی کس وقت کرو گے؟''

''میں پڑھائی بھی کرلوں گا بس پہلے آپ مجھے کام دلوا دو، مجھے پیسے جمع کرنے ہیں ورنہ وہ پلوشہ سے بھی بھیک منگوائیں گے۔'' دو دن پہلے دنیا میں آنے والی وہ ننھی سی معصوم گڑیا اسے جانے کیسے بے حد عزیز ہوگئی تھی۔ وہ اپنے دل میں اس کے لیے خاص جگہ محسوس کررہا تھا اگرچہ ان سب باتوں کے لیے اس کی عمر خاصی کم تھی لیکن وہ جس ماحول کا رہنے والا تھا وہاں سب سے پہلے بچپنا اور معصومیت ہی رخصت ہوتی ہے بہت سی باتیں جو دوسرے بچے نہیں سمجھ پاتے وہ اس کی بستی کے بچوں کے لیے عام سی باتیں ہوتی ہیں یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی عمر سے بڑی سوچ اور سمجھ رکھتا تھا۔

''اچھا میں کچھ کرتا ہوں تم پریشان مت ہو'' نعیم نے اسے تسلی کرا کے واپس بھیج دیا تھا۔ اس روز وہ بھی خاصا تھکا ہوا تھا اور سارنگ کی طبیعت بھی پوری طرح ٹھیک نہ ہوئی تھی اسی لیے پڑھائی کو اگلے دن پر رکھا گیا تھا۔

واپسی کے سفر میں وہ خاصا پُر امید تھا اسے یقین تھا کہ نعیم اس کے لیے کوئی نہ کوئی کام ضرور ڈھونڈ دے گا اپنی جھونپڑی پر جانے کی بجائے اس کے قدم غیر ارادی طور پر خالہ کی جھونپڑی کی طرف اٹھ رہے تھے۔ بستی کا وہی ماحول تھا کچھ بچے کھیلنے میں مگن تھے اور کچھ مرد بیٹھے گپیں لگا رہے تھے ایک ایک کرکے کام پر جانے والوں کی واپسی کے ساتھ آہستہ آہستہ بستی میں رونق بڑھ رہی تھی اور آوازوں کا شور بھی۔

''خالہ میں اسے گود میں لے لوں؟'' اس کا اشارہ پلوشہ کی جانب تھا۔

''ہاں لے لے لیکن ذرا سنبھل کے چھوٹی ہے نا ابھی۔'' خالہ نے پلوشہ کو اس کی گود میں ڈال دیا۔ وہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی کسی بچے کو گود میں نہ لیا تھا نہ ہی اس پر غور کیا تھا وہ پلوشہ کی چھوٹی سی ناک کو انگلی سے چھوتا تو وہ کسمانے لگتی اسی شغل میں کافی دیر بیت گئی خالو بھی واپس آگیا تھا اور پلوشہ کے بڑے بہن بھائی بھی تب اس نے بھی پلوشہ کو خالہ کے پاس لٹاتے ہوئے اپنی جھونپڑی میں جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔

☆......☆......☆

اگلے دن اس نے روز سے بڑھ کر نعیم کے سکول سے واپسی کا انتظار کیا تھا اور جیسے ہی نعیم کے سکول کی چھٹی کا وقت ہوا وہ اس کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا تھا، دروازہ بجانے پر نعیم نے

دروازہ کھولا اور سارنگ کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

''مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ تم ہو گے اندر آجاؤ'' سارنگ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا تھا اور سارنگ کوئی بھی جواب دیئے بنا اس کے پیچھے چلتا ہوا بیٹھک میں جا بیٹھا تھا۔

''میرے لیے کوئی کام ملا سر؟'' اس نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

''ہاں کام تو مل گیا ہے ایسا ہے کہ تم کچھ دیر بیٹھو میں ذرا کپڑے بدل لو پھر تمہیں لے چلتا ہوں کام کی جگہ'' سارنگ کا ذہن سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کام کیا تھا پیسے کتنے ملیں گے وغیرہ وغیرہ مگر اسے نعیم کی واپسی تک انتظار کرنا تھا۔ دس منٹ بعد ہی نعیم تیار ہو کر اس کے پاس آگیا اور پھر موٹر سائیکل پر اسے ساتھ لے کر شہر کے مین بازار کی طرف بڑھ گیا۔

''دیکھو سارنگ میں نہیں چاہتا کہ تم اس عمر میں مزدوری کر کے اپنی صحت برباد کر لو لیکن تمہارے لیے کام کرنا بھی بہت ضروری ہے تو بہت سوچنے کے بعد میں نے اپنے ایک دوست سے بات کی اس کا سپر سٹور ہے اور اسے دکان پر اس کی مدد کے ایک ہوشیار مگر ایماندار اور محنتی لڑکے کی ضرورت تھی۔ کام بہت محنت کا نہیں ہے مگر تمہیں صبح سے شام تک سٹور پر رہنا ہوگا، تنخواہ بھی مناسب ہے، باقی تم پر ہے دل لگا کر کام کرو گے تو تنخواہ بھی بڑھ جائے گی اور نوکری بھی پکی ہو جائے گی۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟'' نعیم نے پوری تفصیل بتاتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔

''جی سر سمجھ رہا ہوں، یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے بہت بہت شکریہ'' احساسِ تشکر سے سارنگ کی آواز بھاری ہوگئی۔

''ارے شکریہ کی ضرورت نہیں تم میرے لیے چھوٹے بھائی جیسے ہو۔ میرے حالات اس قابل ہوتے تو میں تمہیں یہ نوکری بھی نہ کرنے دیتا مگر افسوس۔'' نعیم کے لہجے میں اداسی اتر آئی۔

موٹر سائیکل ایک بڑے سے سپر سٹور کے سامنے جا رکی سلام دعا کے بعد نعیم نے سارنگ کا تعارف کروا دیا اور پھر اسے وہاں چھوڑ کر وہ واپسی کے لیے روانہ ہو گیا۔ سپر سٹور کا مالک اصغر درمیانے قد اور سفید رنگت کا مالک تھا البتہ جسم فربہی مائل تھا۔ وہ بھی شاید دکان پر مسلسل بیٹھے رہنے کی وجہ سے ہو گیا تھا۔ اس کا رویہ سارنگ کے ساتھ نہ اچھا تھا اور نہ ہی اسے برا کہہ سکتے تھے۔ اس نے پہلی بات سارنگ سے یہی کہی تھی کہ دیکھو لڑکے میں نے صرف اپنے دوست کی وجہ سے تمہیں کام پر رکھا ہے۔ مجھے کوئی ایسا موقع نہ دینا جس پر مجھے لگے کہ میں نے ایک خانہ بدوش پر بھروسہ کر کے کوئی غلطی کی ہے۔''

''میں اپنا کام محنت اور ایمانداری سے کروں گا'' سارنگ نے حرف حرف اپنے دل میں اتارتے ہوئے احسان مندی سے جواب دیا تو اصغر نے ایک لڑکے کو آواز دے کر سارنگ کو اس کے ذمے لگا دیا تا کہ وہ اسے کام سمجھا دے۔

☆......☆......☆

گھر واپس آکر سارنگ نے اپنی ماں کو اپنی نوکری کے بارے میں بتا دیا تھا جس پر اسے تو کوئی خاص اعتراض نہ ہوا تھا البتہ سارنگ کے باپ نے خاصی بڑبڑ کی تھی اس کے مطابق جتنے پیسے وہ صبح سے شام تک ایک مہینہ کام کر کے کماتا اس سے کہیں زیادہ ایک ہفتے میں چند گھنٹے مانگ کر کما سکتا تھا۔

''جیسے بھی سہی لڑکا گھر میں پیسہ تو لائے گا نا۔

بس اب اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو' سارنگ کی ماں نے یہ کہہ کر اسے چپ کروا دیا تھا مگر اس کے بعد بھی اس کی غصیلی بڑبڑاہٹ کافی دیر تک جاری رہی تھی مگر اس کے بعد اس نے واقعی سارنگ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کی ایک وجہ وہ مخصوص آمدنی بھی تھی جو سارنگ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کرتا تھا۔ سارنگ کی زندگی کا نیا باب رقم ہو رہا تھا اس کی کوشش ہوتی کہ کم از کم ہفتے میں ایک دن وہ نعیم کے پاس جا کر پڑھائی جاری رکھے لیکن کچھ ہی ہفتوں بعد اس معمول میں وقفہ آنے لگا تھا صبح سے رات دیر تک سٹور پر برق رفتاری سے کام کرنے کے بعد سارنگ اس بری طرح تھکا ہوتا کہ کچھ اور کرنے کی اس کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی، یہی وجہ تھی کہ نعیم کے پاس جا کر پڑھنا آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔

اس کی محنت اور ایمانداری نے اصغر کا دل موہ لیا تھا اور اس نے سارنگ کی تنخواہ بھی بڑھا دی تھی۔ سارنگ کا معمول تھا کہ وہ دوکان سے آتے جاتے ایک چکر خالہ کے پاس ضرور لگاتا تھا۔ پلوشہ کے ساتھ کچھ دیر کھیلنا اس کے لیے کھلونے لانا اس کے معمولات میں شامل ہو گیا تھا۔ بستی کی عورتیں اس کی ان باتوں پر اسے چھیڑتیں تو وہ مسکرا کر رہ جاتا۔

دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں ڈھل رہے تھے اور پھر ایک دن فلک پر ابھرتے سورج نے دیکھا کہ آٹھ سال کا وہ دھان پان سا لڑکا اٹھارہ سال کا کڑیل جوان بن چکا تھا۔

بستی میں آج بھی سب کچھ ویسا ہی تھا مگر سارنگ پر آگہی کے بہت سے در وا ہو چکے تھے جن میں ایک انکشاف محبت کا بھی تھا۔ اسے بہت اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ وہ پلوشہ سے شدید محبت کرتا ہے۔ اس روز سٹور پر اپنے روزمرہ کے کام کرتے ہوئے اچانک ہی اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہونے لگا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا تبھی سٹور پر کام کرنے والے دوسرے لڑکے آصف کی نظر اس پر پڑی تو وہ تیزی سے اس کے پاس آیا ٹھنڈا پانی پینے کے بعد وہ کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا مگر چکر ابھی بھی آ رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ شدید گرمی تھی اپنی بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی خاصا سخت جان تھا مگر اس روز شاید گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔

بستی کی طرف آتے ہوئے اس نے ایک سڑک پر خالہ اور پلوشہ کو دیکھا خالہ بھیک مانگ رہی تھی اور پلوشہ اس کے پاس زمین پر بیٹھی تھی۔ غصے سے اس کا برا حال ہو گیا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔

''خالہ یہ پلوشہ یہاں کیا کر رہی ہے؟'' اس کی آواز غراہٹ سے مشابہ تھی خالہ بھی اس کو دیکھ کر گڑبڑا گئی۔

''کچھ نہیں وہ تو ویسے ہی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا تو اس لیے میں نے سوچا کہ اسے بھی اپنے ساتھ لیے چلتی ہوں، بس اتنی سی بات ہے پوچھ لے پلوشہ سے'' گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے خالہ نے بات سنبھالنے کی کوشش کی اور دانستہ سرسری لہجہ اپنایا مگر سارنگ کے چہرے کے تاثرات پر کوئی فرق نہیں پڑا۔

''اٹھو پلوشہ میرے ساتھ چلو'' خالہ کو کچھ بھی کہے بنا وہ پلوشہ سے مخاطب تھا اور پھر اس کا ہاتھ سختی سے تھامے وہ بستی کی طرف بڑھ گیا تھا راستے بھر اس نے کوئی بات نہ کی تھی بس اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا تھا اس کے غصے سے

ہراساں پلوشہ اسے یہ تک نہ کہہ پا رہی تھی کہ اتنی سختی سے پکڑے جانے پر اس کی نازک کلائیاں درد کرنے لگی ہیں، وہ چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔

بستی کے قریب پہنچ کر سارنگ نے اس کی طرف دیکھا اور اسے روتا دیکھ کر اس کا سارا غصہ ہوا ہو گیا اور غصے کی جگہ پریشانی نے لے لی۔

''رو کیوں رہی ہو تم میں نے تم سے کچھ کہا ہے کیا؟'' وہ اس کا بازو چھوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہوتا انتہائی نرمی اور پیار سے پوچھ رہا تھا جیسے ہی اس نے بازو چھوڑا پلوشہ بے اختیار کلائی دبانے لگی۔

''اوہ......'' سارنگ کی نظر اس کی سرخ ہوتی کلائی پر پڑی تو پشیمانی کے احساس نے اسے گھیر لیا ''معاف کر دو مجھے خیال نہیں رہا'' وہ نرمی سے اس کی کلائی پر پڑے انگلیوں کے سرخ نشانوں کو چھوتا ہوا کہہ رہا تھا اور پھر سارنگ اپنے ہاتھوں سے اس کے گالوں پر بہتے آنسو پونچھ ڈالے۔

''چلو میں تمہیں برف کا گولا کھلاتا ہوں پسند ہے نا تمہیں؟'' وہ سب کچھ بھولے اس کا دل بہلانے میں لگ گیا اور پھر برف کا گولا کھاتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے وہ دونوں کچھ ہی دیر میں کھل کھلا کر ہنس رہے تھے۔

''آئندہ خالہ کے ساتھ مت جانا'' پلوشہ کو اس کی جھونپڑی کے آگے چھوڑتے ہوئے اس نے ایک بار پھر تنبیہ کی تھی۔

''میں نہیں جاتی وہ تو اماں ہی کبھی کبھی اتنی ضد کر لیتی ہے تو...'' وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی سارنگ کو بے اختیار ہی اس پر ڈھیروں پیار آ گیا۔

''میں بات کر لوں گا خالہ سے بھی'' وہ اس کی تسلی کراتا اپنی جھونپڑی کی طرف چل پڑا تھا لیکن اس کے دماغ میں بہت سی سوچیں ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

''اماں میری شادی کرا دے'' اس رات ماں کی واپسی پر سارنگ نے کہا تھا شمی کو کئی سال پہلے ایک اجنبی کے ساتھ رخصت کر دیا گیا تھا جس نے منگو سے کہیں زیادہ رقم دے کر اپنے آپ کو شمی کا صحیح حقدار ثابت کر دیا تھا منگو نے کافی واویلا کیا تھا جس کے جواب میں شمی کے باپ نے اسے فوراً اتنی رقم لانے کا کہا تھا جتنی وہ شخص دے رہا تھا اور ظاہر ہے یہ منگو کے لیے ممکن نہ تھا اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا۔ سارنگ نے بھی اس معاملے میں باپ کی مخالفت کی تھی مگر اس کی کون سنتا اور اس طرح شمی بستی سے چلی گئی تھی۔ جس دن سے سارنگ نے کمانا شروع کیا تھا اس نے کچھ پیسے پلوشہ کے لیے خالہ کو دینا شروع کر دیے تھے اور اس کے بدلے میں شرط صرف اتنی تھی کہ وہ پلوشہ سے کبھی بھیک نہیں منگوائے گی لیکن خالہ نے اپنا وعدہ توڑا تھا جس سے وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ آج جب سے اس نے خالہ کے ساتھ پلوشہ کو سڑک پر بیٹھے دیکھا تھا اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا بہت سوچ کر اس کو بس یہی طریقہ سمجھ میں آیا تھا کہ وہ جلد از جلد پلوشہ سے شادی کر لے تا کہ خالہ دوبارہ ایسی کوئی حرکت نہ کر سکے۔ ماں نے بڑے غور سے اپنے بیٹے کا سنجیدہ چہرہ دیکھا تھا اور پھر کچھ بھی کہے بنا اسی وقت اپنی بہن سے شادی کی بات کرنے چلی گئی تھی۔ اسی ہفتے مطلوبہ رقم پلوشہ کے گھر والوں کے حوالے کر کے وہ اسے دلہن بنا کر اپنی جھونپڑی میں لے آیا تھا وہ دن اس کی زندگی کا خوبصورت

ترین دن تھا شاید زندگی میں پہلی بار اسے کسی سے کوئی شکوہ نہیں تھا اور وہ بے پناہ خوش تھا خوش تو پلوشہ بھی اس دن بہت تھی۔ بستی میں ہر کوئی پلوشہ کو رشک سے دیکھتا تھا جسے سارنگ جیسا چاہنے والا ملا تھا۔ اس حسین اور یادگار رات میں سارنگ نے اسے بہت سی باتیں سمجھائی تھیں اور ان دونوں نے مل کر آنے والے دنوں کے حوالے سے ڈھیروں خواب دیکھے تھے۔ پلوشہ بے فکر تھی وہ جانتی تھی کہ اسے رب نے جس انسان کے ساتھ سے نوازہ ہے وہ خوابوں کے سچ کرنے کے سارے ہنر بہت اچھے سے جانتا ہے، بھی سارنگ کی باتیں سنتے اور اس کے چوڑے مضبوط سینے پر سر رکھے وہ بہت میٹھی نیند سو گئی تھی۔

☆......☆......☆

اس رات کی صبح بھی بے حد حسین تھی سارنگ پلوشہ کو اپنے ساتھ بازار لے گیا تھا جہاں دونوں نے حلوہ پوری سے ناشتہ کیا تھا سارنگ نے اسے اس کے استعمال کی کئی چیزیں بھی دلوائی تھیں یہ سب بہت انوکھا تھا ان کی بستی کی کوئی لڑکی یہ سب سوچ بھی نہیں سکتی تھی جو پلوشہ پا رہی تھی اپنے اہم ہونے کا احساس اپنے چاہے جانے کا احساس، خوشی اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی سارنگ صحیح معنوں میں اس کے لیے سائبان تھا۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے سارنگ صبح سویرے سٹور پر چلا جاتا اور شام ڈھلے واپس آتا تو واپسی پر پلوشہ کے لیے کوئی نہ کوئی چیز تحفے کے طور پر ضرور ہی لاتا، پلوشہ بھی دن بھر چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگی رہتی اور سارنگ کی واپسی کا انتظار کرتی۔ شادی کے بعد وہ ایک دن پلوشہ کو نعیم کے گھر بھی لے گیا تھا۔ پلوشہ کو وہ دونوں اچھے لگے تھے تو دوسری طرف نعیم اور اس کی بیوی کو بھی پلوشہ بہت پسند آئی تھی۔

☆......☆......☆

ایک روز سارنگ کام سے لوٹ رہا تھا تو اس نے کچھ اجنبی لڑکوں کو بستی کے گرد منڈلاتے دیکھا وہ شکل سے ہی اوباش دکھائی دے رہے تھے، قریب پہنچنے پر پلوشہ کو ان کی نظروں کا مرکز دیکھ کر سارنگ کا دماغ گھوم گیا رہی سہی کسر پلوشہ کے بارے میں ان کے فضول الفاظ نے پوری کر دی۔ سارنگ کچھ سوچے سمجھے بنا ان پر ٹوٹ پڑا۔ لڑکے بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے بھاگے لیکن جاتے جاتے بُرے انجام کی دھمکیاں بھی دیتے گئے۔ بہت پوچھنے پر بھی سارنگ نے انہیں مارنے کی وجہ کسی کو نہیں بتائی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' سارنگ آج کل جانے کن سوچوں میں ڈوبا رہتا تھا پلوشہ پہلے اسے اپنا وہم سمجھتی رہی مگر اب آخر اس نے پوچھ ہی لیا پلوشہ کے سوال پر سارنگ چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر مسکرا کر بولا۔

''سوچ رہا ہوں تمہیں یہاں سے لے جاؤں یہ بستی تمہارے لیے ٹھیک جگہ نہیں ہے'' اس نے اپنی سوچ بیان کی تو پلوشہ بھی مسکرانے لگی۔

''تو کہاں لے جاؤ گے مجھے؟'' وہ بھی دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

''گھر'' سارنگ نے یک لفظی جواب دیا ''گھر......'' پلوشہ کی آنکھوں میں حیرت اور لہجے میں عجیب سی خوشی جھلکی تھی۔

''ہاں میں سوچ رہا ہوں کوئی چھوٹا موٹا گھر کرائے پر لے کر تجھے وہاں لے جاتا ہوں مجھے تیرا اس بستی میں رہنا اچھا نہیں لگتا۔''

''لیکن اس کے لیے تو بہت پیسے چاہیے ہوں گے ناں۔'' پلوشہ نے اس کی توجہ اصل مسئلے کی

طرف کروائی۔

''اس کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اصغر صاحب کے سٹور کے اوپر ایک چھوٹا سا چوبارہ ہے میں اس کے لیے ان سے بات کرتا ہوں'' سارنگ کے جواب پر پلوشہ بھی پر جوش دکھائی دینے لگی اور پھر انہوں نے اس چھوٹے سے کمرے کو جوان کا گھر بننے جا رہا تھا اسے سجانے سنوارنے کے حوالے سے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔

''استاد ایک بات کرنی ہے'' اگلے دن ہی سارنگ کچھ جھجکتا ہوا سا اصغر سے مخاطب تھا۔

''ہاں ہاں بولو کیا کہنا ہے پیسے چاہیے ہیں کیا؟'' اصغر اس اب اس پر خاصا مہربان رہا کرتا تھا کیونکہ اتنے سالوں میں اس نے سٹور کی ساری ذمہ داری سنبھال لی تھی۔

''نہیں استاد پیسے نہیں چاہیے ہیں دراصل اوپر جو کمرہ ہے نا۔۔۔'' اور پھر وہ اپنا مدعا بیان کرتا چلا گیا۔

''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ویسے بھی وہ خالی پڑا ہے تمہارے آنے سے سٹور کی حفاظت بھی رہے گی'' اصغر نے خوشدلی سے اسے کمرے میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

''بہت بہت شکریہ اب اس کا کرایہ بھی بتا دیں'' سارنگ خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔

''ارے پاگل ہوئے ہو کیا میں تم سے کرایہ لوں گا بھلا بس یہ ہے کہ اوپر کا بجلی کا بل تمہیں خود دینا ہوگا باقی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

اصغر نے مہربانی کی انتہا کر دی سارنگ اس کا انتہائی شکر گزار تھا وہ جلد از جلد یہ خبر پلوشہ کو سنانا چاہتا تھا باقی کا وقت اس نے خاصی بے تابی سے کاٹا تھا اور پھر بستی جاتے ہوئے ایک شاپر میں مٹھائی لے کر پلوشہ کو خوشخبری سنانے چل دیا تھا۔

☆......☆......☆

سارنگ کے فیصلے پر اس کے ماں باپ کے علاوہ بستی والوں کو بھی بہت اعتراض تھا مگر وہ کسی کے اعتراض کو خاطر میں لانے والا کہاں تھا اس نے بچپن سے ہی اپنی من مانی کی تھی تو اب کسی کی کیوں سنتا لہٰذا سب کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتے ہوئے وہ اگلے ہی دن اپنے ایک ہاتھ میں مختصر ترین سامان کی گٹھڑی اور دوسرے ہاتھ سے پلوشہ کا ہاتھ تھامے اس کمرے میں شفٹ ہو گیا تھا۔ اور ان دونوں نے حسب توفیق اپنی اس خوشی کو سیلیبریٹ بھی کیا تھا۔ مگر انہیں خبر نہ تھی کہ ان کی یہ خوشی بہت چھوٹی عمر لے کر آئی تھی۔

انہیں شفٹ ہوئے مہینہ بھر ہی گزرا تھا کہ اچانک ایک دن اصغر کو ہارٹ اٹیک آیا یہ پہلا اٹیک ہی آخری ثابت ہوا اور ہنستا کھیلتا اصغر لمحوں میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اصغر کے بعد سٹور اس کے بیٹے آصف نے سنبھال لیا۔ سارنگ کو اصغر کے جانے کا دکھ تو تھا ہی ساتھ ہی وہ آصف سے بھی نالاں تھا وہ اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا ملازموں کے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ بہت ہتک آمیز، ہوتا خاص طور پر سارنگ اس کا سب سے زیادہ ٹارگٹ بنتا تھا۔ اس کی وجہ شاید سارنگ کی وہ تعریفیں تھیں جو وہ ہمیشہ اپنے باپ کے منہ سے سنتا آیا تھا جو اسے سارنگ کی طرح محنت کرنے کا درس دیا کرتا تھا یوں بے وجہ ہی سارنگ اس کی ناپسندیدہ ہستی بنتا چلا گیا مگر باپ کی زندگی میں وہ سارنگ کے خلاف کچھ کر نہ پاتا تھا لیکن اب وہ سیاہ سفید کا مالک تھا۔

اس نے پہلا کام تو یہ کیا کہ سارنگ کو چوبارے کا کرایہ دینے کا کہا اس پر بھی سارنگ کو کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر آصف نے جان بوجھ کر کرایہ اتنا زیادہ بتایا تھا کہ کرایہ دینے اور بجلی کا بل دینے کے بعد سارنگ کے پاس اتنے پیسے بھی نہ بچتے جن میں وہ اپنی اور اپنی بیوی کی ضروریات زندگی پوری کر پاتا۔ سارنگ بے حد پریشان تھا اسی پریشانی میں اسے پتا چلا کہ اس کی بستی اس شہر سے کوچ کر کے کہیں اور جانے کا ارادہ کر رہی ہے۔ اصغر کے جانے کے بعد ویسے ہی سارنگ کا دل اس سٹور سے اچاٹ ہو گیا تھا آصف کا رویہ بھی بہت خراب تھا سو اس نے بھی اپنے لوگوں کے ساتھ کوچ کرنے کی ٹھان لی اور آصف سے حساب کتاب کر کے ایک نئے شہر میں آکر آباد ہو گیا۔ فوری طور پر اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ کوئی گھر کرائے پر لے سکتا اس لیے انتہائی مجبوری میں اسے ایک بار پھر پلوشہ کو بستی میں رکھنا پڑا۔ وہ دن بھر مختلف سٹورز پر کام کی تلاش میں جاتا مگر کہیں تو ''ضرورت نہیں'' کہہ دیا جاتا اور کہیں اس کے خانہ بدوش ہونے کی وجہ سے نوکری دینے سے صاف انکار کر دیا جاتا۔

''بھلا ایسے انسان کا کیا بھروسہ جس کا نہ کوئی اتا پتا نہ کوئی ضمانتی'' اسے اسی طرح کے فقرے سننے کو ملتے اب بھلا وہ ضمانتی کہاں سے لاتا اصغر زندہ ہوتا تو اس کی ضمانت ضرور ہی دے دیتا لیکن اگر اصغر ہوتا تو اسے یہ دن ہی کیوں دیکھنا پڑتے۔ دن رات کی تھکن، مایوسی اور ماں باپ کے طعنے سن سن کر وہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔

آخر بہت سوچ کر اس نے مزدوری کرنے کی ٹھانی وہاں کسی ضمانت کی ضرورت نہ تھی پیسوں کا حساب بھی روز کی روز ہو جایا کرتا۔

کچھ ہی دنوں میں اسے ایک بلڈنگ میں مزدوری کا کام مل گیا۔ اس نے یہاں بھی جلد ہی اپنی محنت اور ایمانداری سے ٹھیکیدار کے دل میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ وہ اس کی قدر کرتا تھا، ساتھ ساتھ جب بھی اسے وقت ملتا تو وہ بچوں کی چھوٹی موٹی کھانے کی چیزیں بیچنے نکل جاتا۔ آخر اس کی دن رات کی محنت رنگ لائی اور اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ وہ پلوشہ کو لے کر ایک کمرے کے مکان میں شفٹ ہو گیا۔

زندگی ایک بار پھر مسکرانے لگی تھی، پلوشہ نے کئی بار گھروں میں کام کرنے کا سوچا مگر ہر بار ایسی بات کرنے پر اسے سارنگ کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا وہ کسی صورت پلوشہ کو ایسے کسی کام کی اجازت دینے کو تیار نہ تھا اپنے دل اور گھر کی ملکہ کو کسی کی نوکرانی کے روپ میں دیکھنے کا خیال ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ آخر پلوشہ نے بھی یہ بات کرنی چھوڑ دی اور اپنی چھوٹی سی جنت کو سجانے سنوارنے میں مگن رہنے لگی۔ ان کی شادی کو چار سال ہونے کو آئے تھے مگر ان کے ہاں ابھی تک کوئی اولاد نہ تھی پلوشہ کو ماں بننے کا بہت شوق تھا مگر سارنگ جو لکھ پڑھ تو نہیں سکا تھا لیکن باشعور ضرور تھا وہ پلوشہ کے اتنی کم عمری میں ماں بننے کے بالکل خلاف تھا، اور سارنگ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی کرنا پلوشہ نے سیکھا ہی نہ تھا سو وہ اس کی خوشی اور مرضی میں خوش تھی۔ دنیا کی سختیوں اور دکھوں سے بے خبر پلوشہ پیار کے جھولے میں جھول رہی تھی سارنگ اس کے لیے وہ گھنا شجر ثابت ہو رہا تھا جو اس کے پیدا ہونے سے لے کر آج تک اسے تیز دھوپ سے بچائے ہوئے تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پلوشہ کے حسن میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ سارنگ کی محبت

خوشیوں بھری زندگی اور اچھی خوراک نے اس کے حسن کو مزید نکھار دیا تھا اور سارنگ آج بھی اس کے عشق میں پاگل تھا۔

☆......☆......☆

''لو آج تم میرے ہاتھ سے ناشتہ کرو'' سارنگ کام پر جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا تبھی ناشتے کرتے ہوئے اچانک اس نے نوالہ بنا کر پلوشہ کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا
''میں تمہارے ہاتھ سے کھاؤں گی میں کوئی چھوٹی بچی ہوں بھلا'' پلوشہ اس کی بات پر ہنستے ہوئے کہنے لگی تو وہ بھی مسکرا دیا لیکن پلوشہ کے نہ نہ کرنے کے باوجود بھی اس نے اسے اپنے ہاتھ سے ہی ناشتہ کروایا تھا اور جب گھر سے نکلنے لگا تو جانے کیوں دروازے سے پلٹ آیا۔

''کیا ہوا کچھ بھول گئے کیا؟'' پلوشہ کی سمجھ میں یہی آیا کہ شاید وہ کچھ بھول گیا ہے۔

''پتا نہیں کیوں آج کام پر جانے کا من نہیں ہو رہا''

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا'' پلوشہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھا تو وہ ہنس دیا۔

''ارے میں بالکل ٹھیک ہوں وہ تو بس یونہی آج تمہارے پاس سے جانے کو دل نہیں کر رہا'' پلوشہ کی پریشانی دور کرنے کو اس نے دانستہ شرارت سے کہا تو شرم کی سرخی پلوشہ کے چہرے پر پھیل گئی۔

''تم بہت اچھی ہو بہت خوبصورت ہو اور میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں'' پلوشہ حیرانی سے اس کی اس بے وقت کی راگنی کو سن رہی تھی۔

''اچھا میں چلتا ہوں اپنا بہت خیال رکھنا'' پلوشہ کے ماتھے پر اپنے پیار کی مہر ثبت کرتے ہوئے اس نے تاکید کی تھی جانے کیوں اس کے اس انداز سے پلوشہ کا دل بھی کسی انہونی کے خیال سے گھبرانے لگا۔

''تم آج نہ جاؤ'' وہ بے اختیار اس کا بازو پکڑے کہہ رہی تھی۔

''اچھا جی......کام نہیں کروں گا تو کام کیسے چلے گا؟'' وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا اور پھر وہ اس کے روکنے کے باوجود اللہ حافظ کہتا گھر سے نکل آیا۔

☆......☆......☆

دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے والا تھا گرمی پورے زوروں پر تھی سبھی مستری اور مزدور کھانے کے وقفے کے شدت سے منتظر تھے۔ سارنگ سیمنٹ اور ریت ملا کر مسالا تیار کر رہا تھا جبکہ اس کے قریب ہی ایک مزدور اینٹیں اچھال رہا تھا جسے بلڈنگ کے اوپر کھڑا دوسرا مزدور کیچ کیے جا رہا تھا ساتھ ساتھ زور زور سے باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ نیچے والے مزدور نے اینٹ اوپر کی طرف اچھالی تبھی اینٹ پکڑنے والے مزدور کے ماتھے پر بہتا پسینہ اس کی آنکھوں پر آ کر مرچیں لگا گیا بے اختیار اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے پسینہ پونچھنے کے لیے بڑھا اور اینٹ پر سے اس کا دھیان ہٹ گیا اینٹ واپس نیچے کی طرف آئی اور جھک کر مسالا بناتے سارنگ کے سر کے عین درمیان میں لگی۔

اینٹ خاصی بلندی سے گری تھی اور سر کے نازک حصے پر لگی تھی۔ سارے مزدور اس کی طرف بھاگے اسے ہسپتال لے جانے کے لیے بھاگ دوڑ ہونے لگی لیکن کہیں جانے سے پہلے ہی سارنگ نے دم توڑ دیا سر کی چوٹ بہت شدید تھی۔

☆......☆......☆

جب یہ خبر پلوشہ تک پہنچی تو وہ چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی کسی نے اس کی بستی میں بھی خبر کر دی۔ سبھی بھاگے دوڑے آن پہنچے۔ پلوشہ ایک بار بھی ہوش میں نہیں آئی تھی شاید وہ اب اس دنیا میں آنکھیں کھولنا ہی نہیں چاہتی تھی جہاں اس کا سارنگ نہیں رہا تھا۔اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کی گئیں ساتھ ہی سارنگ کو اس کے آخری ٹھکانے پر لے جانے کی تیاریاں بھی کی جا رہی تھیں۔

پلوشہ کو ہوش آیا تو وہ زور زور سے سارنگ کو پکارنے لگی اس کے لیے یہ بات کسی طور ماننے کے قابل نہیں تھی کہ اس کا ہنستا مسکراتا سارنگ اسے اس ظالم دنیا میں تنہا چھوڑ گیا تھا۔ کچھ دیر روتے رہنے کے بعد اس پر دوبارہ بے ہوشی طاری ہوگئی۔اور اس کی بے ہوشی کے دوران ہی سارنگ کو اس کی آخری منزل پر پہنچا دیا گیا۔پلوشہ ایک بار پھر اپنے ماں باپ کے پاس بستی میں واپس آگئی۔اس کی حالت بہت بری تھی اس کے پاس سارنگ کے بنا زندگی کا تصور ہی نہیں تھا، وہ گھنٹوں گم صم بیٹھی آسمان کو تکا کرتی کوئی زبردستی منہ میں نوالا ڈال دیتا تو کھا لیتی ورنہ بھوکی پیاسی بیٹھی رہتی شاید اس کے اندر سے بھوک اور پیاس کا احساس ہی مٹ گیا تھا۔دھیرے دھیرے اس کے ماں باپ اور ساس سسر نے اسے احساس دلانا شروع کیا کہ زندگی اس طرح نہیں گزرے گی اور اب اسے بھی ان کے ساتھ بھیک مانگنے کے لیے جانا شروع کر دینا چاہیے ان کی اس بات پر پلوشہ تڑپ اٹھی تھی۔

''میں بھیک نہیں مانگوں گی'' اس نے ڈٹ کر کہا تھا۔

''تو اور کیا کرے گی؟''

''میں کہیں گھروں میں کام ڈھونڈ لوں گی'' اس کی اس بات پر سب ہنس دیے تھے۔

پاگل ہوئی ہے کیا بھلا خانہ بدوشوں کو بھی کوئی اپنے گھر میں گھسنے دیتا ہے کبھی اور اگر تجھے کسی نے رکھا بھی تو وہاں تیرے کام کی نہیں تیرے اس خوبصورت جسم کی ضرورت ہوگی۔''

دنیا کی سب سے بھیانک حقیقت اس کے سامنے لائی گئی مگر وہ نہ مانی۔اگلے کئی دن اس نے نوکری کی تلاش میں گزار دیے مگر کہیں اسے کام نہ ملتا اور جہاں ایک دو جگہ کام ملنے کی کچھ امید بنتی نظر آئی اس گھر کے مردوں کی آنکھوں میں ناچتی ہوس پلوشہ کو پریشان کر گئی۔کوئی راستہ نہ پا کر آخر وہ بستی والوں کی بات ماننے پر مجبور ہوگئی اب وہ ہر روز بائیں کاندھے پر کپڑے کا تھیلا لٹکائے اور دائیں ہاتھ میں کشکول تھامے اپنی ساس کے ساتھ گلی گلی گھوما کرتی مگر آج تک اس میں یہ حوصلہ نہ آیا تھا کہ وہ زبان سے بھیک مانگ سکتی اسی لیے وہ ہر دروازے پر جا کر نظریں جھکائے کھڑی رہتی جس نے جو دینا ہوتا اس کے کشکول میں ڈال دیتا اور وہ آنسو ضبط کرتی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ جایا کرتی۔آج سارنگ کو گئے کتنے سال بیت گئے تھے بستی کے کتنے لڑکوں نے پلوشہ سے شادی کرنا چاہی تھی مگر اس نے یہ بات ماننے سے سختی سے انکار کر دیا تھا اور سب نے اس کی اس ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔وہ سارنگ کی جگہ کسی اور کو کیسے دیتی جب سارنگ جیسا کوئی تھا ہی نہیں۔لکھنے والے نے شاید اس بدقسمت خانہ بدوش کی قسمت میں گھر کا سکھ نہیں لکھا تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

صائمہ راحت

آج صبح سے موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی وقفے وقفے سے جاری تھی۔ پوری فضا مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ ربیطہ نے آسمان پر نگاہ ڈالتے ہوئے اشعر سے کہا۔ ''کتنا خوبصورت موسم ہو رہا ہے ناں! آپ پلیز......

''حد ہوگئی بدتمیزی کی! سمجھتی کیا ہے وہ اپنے آپ کو؟ مہارانی بنی بیٹھی ہے۔ نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کی تمیز...... ماں باپ کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ نہ جانے کب جان چھوٹے گی اس سے......!'' کومل نے غصے سے بھرے ہوئے لہجے میں اپنی دوست نایاب کو کل کی کہانی سنائی۔

نایاب جو خاموشی سے بیٹھی کومل کی بات سن رہی تھی اس نے کومل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا چھوڑو بھی کومل! تم جیسی حسین لڑکی اور اتنا غصہ اچھا نہیں لگ رہا۔ چھوڑو جانے دو...... جو جیسا کرتا ہے اسے کرنے دو تم اپنے کام سے کام رکھو۔ ایک کان سے سن کے دوسرے کان سے نکال دو۔''

کومل نے آنسو بھری آنکھوں سے نایاب کو دیکھا اور کہا کہ میں کب تک برداشت کروں؟ آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کیا میری زندگی صرف اسی لیے ہے کہ بچپن سے جوانی تک ماں باپ اور بہن بھائیوں کی باتیں برداشت کروں اور پھر شادی کے بعد شوہر اور سسرال والوں کے طعنے برداشت کروں؟ نہیں سہا جاتا اب مجھ سے۔ میری قوتِ برداشت ختم ہوگئی ہے۔'' اتنا کہہ کے کومل نایاب کی گود میں سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اور نایاب خاموشی سے کومل کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی کہ رونے سے دل کا سارا غبار نکل جائے اور کچھ غم کے بادل چھٹ جائیں۔

☆......☆......☆

نایاب اور کومل بچپن کی سہلیاں تھیں۔ کومل کا تعلق درمیانے طبقے سے تھا۔ شروع سے ہی پیسوں کی کمی کی وجہ سے ماں باپ میں لڑائی جھگڑے ہوئے تھے۔ جس کے منفی اثرات بچوں پر پڑے تھے اور بچے عدم اعتماد اور عدم تحفظ کا شکار ہوگئے تھے۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔

کومل اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچ گئی۔ وہ شروع سے ہی مذہب سے خاصا لگاؤ

تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چھوٹی عمر سے وہ نماز پابندی سے پڑھا کرتی اور پردہ بھی کیا کرتی۔

فیشن اور تصویروں سے اسے سخت چڑ تھی۔ اس لیے اس کی دوستیں بھی کم تھیں۔ کیونکہ زیادہ تر لڑکیاں اسے فرسودہ خیالات کی پروردہ قرار دیتیں اور کچھ لڑکیوں کا خیال تھا کہ کومل کے اندر بوڑھی روح ہے جو ابھی سے مذہب اور دین کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ مگر کومل ان باتوں کا برا نہیں مناتی اور ہنس کے گزر جاتی۔

اسے اس بات پر پختہ یقین تھا کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے دینِ اسلام کے مطابق کر رہی ہے اس لیے اس دنیا میں نہ سہی آخرت میں تو اس کا بھرپور صلہ ملے گا۔ اس لیے وہ ثابت قدمی کے ساتھ ان آفاقی اصولوں پر قائم رہتی اور اس کی دوست نایاب بھی ہمیشہ اس کا ساتھ دیا کرتی۔

یہی وجہ تھی کہ پندرہ سال گزر جانے کے باوجود ان کی دوستی اور محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

☆......☆......☆

”کیا بات ہے کومل! آج تم کچھ پریشان پریشان لگ رہی ہو۔“ نایاب نے کلاس ختم ہوتے ہی کومل سے کہا۔

”آؤ چلو! کینٹین چلتے ہیں پہلے کچھ پیٹ پوجا ہوجائے پھر ما بدولت تمہارا مسئلہ بھی حل کرنے کی کوشش کریں گے۔“ نایاب نے مسکراتے ہوئے کومل سے کہا اور دونوں کینٹین کی جانب چل پڑیں۔ وہاں سے اسنیکس اور کولڈ ڈرنک لے کر

دونوں نسبتاً پُرسکون گوشے میں جاکے بیٹھ گئیں۔

''ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟'' نایاب نے کومل کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ سوجی ہوئی سرخ انگارہ آنکھیں، تھکا ہوا چہرہ، پیلی رنگت اور شکن آلود کپڑے اس بات کی عکاسی کررہے تھے کہ کومل کس قدر بے چین اور مضطرب ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ کل کچھ لوگ ہمارے گھر آئے تھے۔'' کومل نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں تو یہ بات ہے۔ گویا آپ کچھ عرصے میں پیا دیس سدھار جائیں گی تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔'' نایاب نے چہکتے ہوئے کہا۔

کومل نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ تم پہلے میری پوری بات سن لو پھر اپنا تبصرہ کرتی رہنا۔ میرا ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے ابھی میرا ایم اے مکمل نہیں ہوا ہے۔ اس کے بعد بھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے اور گھر میں ابھی سے میری شادی کی باتیں شروع ہوگئیں ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ کومل نے تمام تفصیلات نایاب کے گوش گزار کردیں۔ جن کو سن کے نایاب بھی یہ سوچنے لگی کہ واقعی کومل کے لیے تو اپنا ماسٹرز مکمل کرنا مشکل ہوجائے گا۔ تاہم نایاب نے کومل پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں کی اور مسکراتے ہوئے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں کومل! اچھے رشتے مشکل سے ملتے ہیں۔ پڑھائی تو شادی کے بعد بھی ہوسکتی ہے اگر تمہارے گھر والے تیار ہیں تو تم کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چلو اب جلدی سے اٹھ جاؤ، کلاس کا وقت ہوگیا ہے۔''

☆......☆......☆

جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق کومل کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ اور چھ ماہ بعد کومل کی رخصتی تھی۔ اسی ضمن میں اس کے گھر مہمانوں کی آمد تھی۔

شادی سے ایک ہفتہ قبل تمام دوستیں اور کزنز اس کے گھر جمع ہوگئے تھے اور خوب شور شرابہ اور ہلا گلا کررہے تھے۔ کوئی شادی کے گیت گارہا تھا تو کوئی مہندی لگارہا تھا۔ کسی کو اپنے کپڑوں کی فکر تھی تو کوئی میچنگ کی جیولری کے لیے پریشان تھا۔ ہر شخص مصروف تھا۔

کومل بظاہر تو مطمئن اور پُرسکون تھی مگر دل ہی دل میں مستقبل کے بارے میں پریشان اور فکر مند بھی تھی۔ اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے اس نے اپنا معمول بنالیا تھا کہ روزانہ دو رکعات صلوٰۃ حاجت پڑھ کر اللہ سے خوب دعائیں کیا کرتی کہ شادی کے اس فیصلے کو اس کے لیے خیر و برکت اور خوشی کا باعث بنائے اور اسے مشکلات و پریشانی سے محفوظ رکھے۔ (آمین)۔

☆......☆......☆

گہرا سرخ کامدار شرارہ، اس کی مناسبت سے خوبصورت سا جھمکوں اور گلوبند کا سیٹ اور اس کے ساتھ میچنگ کی چوڑیاں، ان تمام چیزوں نے کومل کے حسین چہرے کو مزید خوبصورت بنادیا تھا۔ جو بھی دیکھتا تعریف کیے بنا نہیں رہتا۔ ہر شخص کے لب پہ یہی دعا تھی کہ کومل جیسی خوبصورت لڑکی کے نصیب بھی اچھے ہوں۔ اسے کسی دکھ اور پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

نکاح کے بعد تمام دوستوں نے کومل کو گھیرے میں لے لیا اور اسے چھیڑنے لگیں۔ اب تو کومل پرائی ہوگئی۔ نایاب بھی کومل کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اس کے پُرسکون چہرے کو دیکھتے ہوئے اس

نے بے ساختہ کہا۔ اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں دے(آمین)۔

نایاب جہاں کومل کی شادی پہ خوش تھی وہیں افسردہ اور غمزدہ بھی تھی کہ اس کی اتنی اچھی سہیلی اس سے دور جارہی ہے۔ اس نے کومل سے کہا۔

''تم مجھ کو شادی کے بعد بھول تو نہیں جاؤ گی ناں!'' کومل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے بے وقوف ہوگئی ہو کیا اتنی اچھی دوست کو بھی کبھی بھلایا جاسکتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ تم بھی مجھ سے رابطہ رکھنا۔ ٹھیک ہے ناں۔''

☆......☆......☆

نکاح سے لے کر رخصتی تک کے تمام مراحل بخیر و خوبی طے ہوگئے اور کومل رخصت ہو کے اپنے سسرال آ گئی۔ وہاں اُس کا پُرتپاک استقبال ہوا۔ سُسر نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ آج سے تم میری بیٹی ہو۔ نندوں نے بھی خوش دلی سے خوش آمدید کہا۔ البتہ ساس نے کسی بھی قسم کا کوئی تاثر نہیں دیا اور نہ ہی کومل کو منہ دکھائی کا تحفہ دیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ کومل کی ساس کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ اپنے بڑے بیٹے کی شادی مکمل دھوم دھام سے نہ کر سکیں۔ نہ مایوں ہوا نہ مہندی، نہ تصویریں بنیں نہ مووی، اسی لیے اِن کا موڈ خراب تھا۔

اگلے دن جب صبح کومل کے گھر والے آئے اور انہوں نے پوچھا کہ بتاؤ تمہاری ساس امی نے کیا تحفہ دیا؟ تو کومل خاموشی سے سر جھکا کے بیٹھ گئی۔ جبکہ نندوں نے بہانہ بنایا کہ وہ امی کہیں رکھ کے بھول گئی ہیں مل نہیں رہا۔ یہ تھی شادی کے ابتدائی دنوں میں ساس کی طرف سے سرد جنگ کی شروعات، مگر سادہ لوح کومل کو اس بات کا احساس نہیں ہوا۔ اور وہ دل و جان سے شوہر اور گھر والوں کی خدمت میں مصروف ہوگئی۔ مگر پھر بھی اسے دن رات طعنے بھی سننے کو ملتے۔ کبھی پردے کا طعنہ کبھی نماز دیر تک پڑھتے رہنے پر اعتراض، کوئی سخت سست کہتا تو کوئی پھوہڑ کے لقب سے نوازتا۔ ایسے میں کومل سخت دلبرداشتہ ہوتی اور اکثر رات میں تنہائی کے اوقات میں اپنے رب کائنات سے شکوہ کناں ہوتی کہ میرا قصور کیا ہے؟ کیا یہ کہ میں پردہ کرتی ہوں؟ یا یہ کہ میں نماز کو اس کے عاسن کے ساتھ ادا کرتی ہوں؟ آخر میری غلطی کہاں ہے؟ میں تو سب کی غلط باتیں بھی خاموشی سے ہنس کر برداشت کرجاتی ہوں۔ پھر بھی لوگ مجھ ہی کو برا بھلا کیوں کہتے ہیں؟ کومل جتنا زیادہ سوچتی اتنا ہی اُلجھتی جاتی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسائل بھی گھمبیر ہوتے چلے گئے اور ہنسی مسکراتی کومل مرجھا کے رہ گئی۔

☆......☆......☆

ربیطہ کی تین بڑی بہنیں شادی شدہ تھیں جبکہ وہ سب سے چھوٹی تھی اور گھر والوں کی چہیتی اور لاڈلی بھی۔ یہی وجہ تھی کہ گھر میں اس کی ہر بات کو اہمیت دی جاتی۔ وہ کومل سے چھوٹی تھی مگر حاشر کے لاڈ پیار کی بناء پر یوں محسوس ہوتا جیسا کہ ربیطہ کی ہر بات ماننا کومل کے لیے لازمی ہے۔ اکثر اوقات کومل شدید کوفت کا شکار بھی ہوجاتی مگر کسی سے کچھ کہہ نہ پاتی۔

کومل نے شروع سے ہی ربیطہ سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی ہر بات اس سے ڈسکس کرتی۔ اس کے مسئلے مسائل بغور سن کر حل کرنے کی کوشش کرتی۔ پڑھائی میں اس کی مدد کرتی۔ الغرض اس کی پوری کوشش ہوتی

کہ کوئی بات ربیطہ کے مزاج کے خلاف نہ ہوتا کہ تعلقات میں خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔

ایک دن کومل کسی کام سے ربیطہ کے کمرے کی طرف جارہی تھی کہ باہر سے ہی اُس کی آوازوں نے کومل کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔ کومل کی ساس ربیطہ کو دن بھر کی روداد سنانے میں مصروف تھیں اور ربیطہ ان کو کومل کے خلاف اُکسا رہی تھی کہ امی جان! آپ نے تو خوامخواہ بھابی کو چھوٹ دے رکھی ہے۔ ہر کام میں نقص نکالا کریں تاکہ بھابی کو اندازہ ہوا کہ انہیں تو کچھ بھی درست طرح سے نہیں کرنا آتا۔ یہ اور اسی طرح کی کئی باتیں تھیں جو ربیطہ کومل کے متعلق اپنی ساس کو بتا رہی تھی۔ کومل کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی ربیطہ ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ کومل کو اس کی گفتگو سے بہت تکلیف پہنچی اور وہ دبے قدموں اپنے کمرے میں واپس آگئی اور بستر گر کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

اب اسے اندازہ ہوا کہ حاشر کا رویہ اچانک خراب کیوں ہو جاتا ہے کہ ساس اور نندیں اُس کی غیر موجودگی میں اس کی جھوٹی شکایتیں حاشر سے کر دیتے ہیں تاکہ ان کا دل خراب ہو جائے اور پھر وہ سب کا غصہ میری ذات پر ہی اتارتے ہیں۔

کومل کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ غصے کے مارے اُس کا برا حال تھا۔ آج اُس کو اپنی ساس اور نند سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ جن لوگوں سے وہ اتنی محبت کرتی ہے وہ اس کی خوشیوں کے دشمن ہیں اور شوہر کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ بہت دیر تک رونے کے بعد کومل کے دل کا غبار ہلکا ہوا۔ اور اس نے سوچا کہ فی الحال کچھ وقت کے لیے امی کے گھر چلی جاتی ہوں تاکہ دل بہل جائے۔

☆......☆......☆

شام کو حاشر جب گھر آئے تو کومل نے کہا کہ مجھے امی کے گھر جانا ہے۔ حاشر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ اچانک تمہیں امی کی یاد کیسے آگئی؟ کوئی مسئلہ ہوا ہے کیا؟ کومل نے جواباً کہا نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بس یونہی کافی دن ہوگئے امی سے ملے ہوئے اس لیے دل چاہ رہا ہے جانے کا۔ دو چار دن رہ کے واپس آجاؤں گی۔ حاشر نے کہا اچھا بابا رات میں چھوڑ دوں گا جا کے ساس سُسر سے اجازت لے لو۔ کومل نے جانے کے لیے ساس سسر سے پوچھا اور پھر سامان پیک کرنے لگی۔

☆......☆......☆

ابھی کومل کو امی کے گھر آئے دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ نایاب کا فون آگیا۔ اور سناؤ کومل کیا حال احوال ہیں؟ تم تو بڑی بے مروت نکلی پلٹ کے خبر بھی نہ لی کہ زندہ بھی ہوں یا......"

"چلو خیر میری چھوڑو تم اپنی سناؤ۔" نایاب نے حسبِ عادت ایک ہی سانس میں ساری باتیں کرتے ہوئے کہا۔ اُدھر سے کومل کی سسکیوں کی آوازیں آنے لگی تو نایاب پریشان ہوگئی۔

"ارے کومل! کیا ہوگیا تم رو رہی ہو؟ کچھ تو بتاؤ کیا بات ہے؟ حاشر سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ کیا مسئلہ ہے؟ سب خیریت تو ہے ناں۔" نایاب نے گھبراتے ہوئے کئی سوالات کر ڈالے۔ جواباً کومل نے صرف اتنا کہا کہ نایاب تم صبح میرے گھر آجاؤ پھر تفصیل سے بیٹھ کے بات کریں گے۔

☆......☆......☆

"ہاں اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟" نایاب صبح سویرے کومل کے گھر پہنچ گئی اور بے تابی سے اُس

کے گلے لگتے ہوئے فوراً ہی سوال کر ڈالا۔

''ارے بابا! رُکو تو سہی، چائے ناشتہ تو کرلو پھر مسئلہ بھی بتادوں گی۔'' کومل نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا اور نایاب کو کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی۔ پھر ناشتہ کرنے کے بعد کومل نے ایک ایک بات تفصیل سے نایاب کے گوش گزار کردی اور کہا۔

''اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ ایسے لوگوں کے ساتھ کس طرح گزارہ کروں؟ جو میری خوشیوں کے قاتل ہیں؟ میرے شوہر کو مجھ سے متنفر کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ وہ تو حاشر کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ اپنی بہنوں کی باتوں پر کان نہیں دھرتے ورنہ تو میرا گھر کب کا تباہ ہو چکا ہوتا۔'' اتنا کہہ کے کومل پھر رونے لگی۔

نایاب اس کو چپ کرواتے ہوئے بولی۔

''ارے پگلی! رونے سے بھی بھی مسائل حل ہوتے ہیں۔ تم اللہ پر بھروسہ کرو۔ اسی سے مدد طلب کرو اور صبر کرو۔ انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے جو جیسا کرے گا وہ ویسا بھرے گا۔ تم کثرت سے استغفار کیا کرو اور تلاوت قرآن کو اپنا معمول بنالو۔ رب کائنات سے اپنا تعلق مضبوط بناؤ تاکہ لوگوں کی باتوں پر تمہارا دل رنجیدہ نہ ہو۔'' نایاب نے کومل کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ گریجویشن مکمل کرنے کے بعد ربیطہ کی شادی ہوگئی۔ وہ بیاہ کر اپنے سسرال چلی گئی اور کومل نے سکون کا سانس لیا۔

ربیطہ کے سسرال میں دو جٹھانیاں، 3 نندیں، ساس، سسر، دیور، جیٹھ...... سب کو ملا کر کل 15 افراد تھے۔ ہر کام ساس سسر کی مرضی کے مطابق ہوتا اس میں کسی کو بھی دخل اندازی کی اجازت نہ تھی۔ جبکہ شادی سے قبل ربیطہ کو ہر کام اپنی مرضی سے کرنے کی عادت تھی۔ اس لیے وہ بہت پریشان ہوتی۔ کیونکہ وہ جتنی بھی کوشش کرتی کہ کام اچھا ہوجائے اور کسی کو بھی اس سے شکایت نہ ہو۔ اتنا ہی کام خراب ہو جاتا اور ہر فرد ربیطہ سے نالاں رہتا کہ نہ جانے کیسی لڑکی ہے کوئی بھی کام ڈھنگ سے اور سلیقے سے کرنا نہیں آتا۔ بے چاری ربیطہ روزانہ سب کے طنز اور طعنے ہنس کے برداشت کرتی۔ وہ اندر ہی اندر جلتی کڑھتی رہتی مگر زبان سے کچھ نہ کہتی۔ کیونکہ وہ چھوٹی تھی اس لیے کوئی اس کی بات سنتا بھی نہیں تھا بلکہ اس کو تمام لوگوں کی باتیں سننی اور ماننی پڑتیں۔

☆......☆......☆

آج صبح سے موسم بہت خوشگوار ہورہا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی وقفے وقفے سے جاری تھی۔ پوری فضا مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ ربیطہ نے آسمان پر نگاہ ڈالتے ہوئے اشعر سے کہا۔

''کتنا خوبصورت موسم ہورہا ہے ناں! آپ پلیز مجھ کو امی کے گھر چھوڑ دیں۔'' اشعر جو آفس جانے کے لیے تیار ہورہے تھے انہوں نے ربیطہ کو بغور دیکھا اور کہا۔

''ابھی مجھے دیر ہورہی ہے پھر کبھی چلی جانا۔'' اور ربیطہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے وہ خاموشی سے کچن میں چائے بنانے چلی گئی۔

☆......☆......☆

کافی عرصے بعد جب ربیطہ اپنے میکے گئی تو اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ان دنوں کومل کی طبیعت خراب تھی۔ مگر ساس سسر کا حکم تھا کہ ربیطہ

کے پسند کے کھانے بنائے جائیں۔ اس طرح کومل نے اکیلے آٹھ دس ڈشیں (مثلاً شامی کباب، بریانی، چکن نہاری، کوفتے، چائنیز، کھیر وغیرہ) تیار کیں اور ساتھ ساتھ گھر کے دیگر کام بھی نمٹاتی گئی۔ جبکہ ساس صاحبہ اطمینان سے ربیطہ سے کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئیں۔

اچانک کومل کو کوئی کام یاد آ گیا۔ وہ امی کے کمرے کی طرف گئی تاکہ امی سے اس کے متعلق پوچھ سکے۔ مگر جونہی وہ کمرے کے قریب پہنچی تو اس کو ربیطہ کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کومل بہت حیران ہوئی کہ ربیطہ کو کیا ہوگیا ہے؟ ابھی تو اُس کی شادی کو سال بھی نہیں ہوا ہے اور پھر ربیطہ کے سسرال والوں کا شمار شہر کے پڑھے لکھے اور معزز لوگوں میں ہوتا ہے۔ بہرحال کومل خاموشی سے وہاں سے پلٹ آئی۔

☆☆......☆☆

ربیطہ تقریباً ایک ہفتے تک ٹھہری۔ اس دوران اس نے کومل سے بہت اچھی طرح بات چیت کی۔ اکثر کاموں میں کومل کا ہاتھ بٹا دیا کرتی۔ کبھی سبزی بنا دیتی کبھی برتن دھو دیتی اور کبھی کپڑے استری کر دیا کرتی۔ کومل اس کی اس تبدیلی پر حیران بھی تھی اور خوش بھی کہ چلو اب ربیطہ کو عقل تو آ گئی۔

آج شام ربیطہ واپس سسرال جا رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک کومل کے گلے لگ کے روتی رہی کہ بھابی مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ آج اسی کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑ رہا ہے کہ میرے سسرال میں کوئی مجھ سے درست طریقے سے بات نہیں کرتا۔ ہر کوئی مجھ پر یہ حکم چلانا فرض اولین سمجھتا ہے۔ میرے ہر کام میں نقص نکالتا ہے تو مجھ کو شدت سے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے۔ آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

کومل نے مسکراتے ہوئے ربیطہ کے سر پر ایک چپت لگاتے ہوئے کہا۔

”بے وقوف لڑکی! اس میں معافی مانگنے کی کون سی بات ہے؟ تم چھوٹی تھی اور تمہیں ان باتوں کی سمجھ بھی نہیں تھی اس لیے میں تو تمہاری سب باتوں کو بھول بھی گئی۔ جو ہوا سو ہوا...... اب زیادہ رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو جلدی سے چپ ہو جاؤ۔ اور جا کے تیار ہو اب آپ کے شوہر صاحب کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ انہوں نے تم کو اس حال میں دیکھ لیا تو کیا سوچیں گے؟“

”چلو شاباش! اب اٹھ جاؤ۔ اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ سسرال والوں کے رویے سے مایوس اور دلبرداشتہ ہونے کے بجائے تم خدمت اور حسن سلوک جاری رکھو۔ اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کے ذریعے مدد طلب کرتی رہو۔ انشاء اللہ جلد ہی تمہاری تمام مشکلات دور ہو جائیں گی۔

اچھا پیاری بھابی جان! میں آپ کی باتوں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔ یہ کہتے ہوئے ربیطہ ایک نئے عزم کے ساتھ تیار ہونے کے لیے چل دی۔

اور کومل اس کو مسکراتے ہوئے جاتے ہوئے دیکھنے لگی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ واقعی صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ انسان کو ہر کام کی جلدی ہوتی ہے۔ مگر کوئی بھی کام اپنے مقررہ وقت سے پہلے نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

فصیحہ آصف خان

مقتل

دو دن اور گزرے جب ایک وردی والا تھانیدار کا پیغام لے کر آیا کہ لڑکی کو بیان کے لیے حاضر کیا جائے۔ ''وڈے تھانیدار آ گئے ہیں۔'' بختو اس کے جاتے ہی ماں سے لپٹ گئی اور تڑپ کر رو دی۔ ''نہ میری دھی، جو قسمت میں لکھا تھا وہ مل گیا۔ اب چل......

''بختواری او بختو خاں، آج تو نے دیر کیوں کر دی؟ موسم کا کچھ پتہ نہیں، لکڑی بھیگ گئی تو ...... کھانا کیسے پکے گا؟ جلدی کر جا اب، لکڑی لے، میں ذرا لیٹ جاؤں، سبزی بھی لے آنا، تو میں کھانا پکاؤں؟''

شریفاں اپنی لاڈلی، اکلوتی، نوخیز بیٹی کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ جو ابھی صحن کی لپائی کر کے ہاتھ دھو کے دوپٹے سے صاف کر رہی تھی۔

''جاتی ہوں اماں...... ذرا سانس تو لے لوں۔'' بختو نے بھی جواباً اماں کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کا ایک دوسرے کے سوا تھا ہی کون، ایک کچے کمرے کا کچا پکا گھر، ایک کونے میں گھاس پھونس اور لکڑی کا چھپر ڈال کر کھانا پکانے کی جگہ بنا رکھی تھی۔ چھوٹا سا صحن لپائی کے بعد اب چمک رہا تھا۔

''اچھا اماں میں گئی اور آئی۔'' بختو کپڑا کندھے پر رکھ کر باہر نکلی۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ شروع سردیوں کے دن تھے۔ اس بستی سلطان وال میں چند سو ہی گنے چنے گھر تھے۔ وہ بھی کافی کافی فاصلوں پر......

گندم، گنا اور کپاس کے کھیتوں سے یہ بستی آباد تھی۔ ذریعہ معاش بھی، اوڑھنی کو اچھی طرح لپیٹ کر بختو حسبِ معمول تیز تیز چلنے لگی۔

جوانی کی الھڑ مستیاں تھیں۔ بختو کو اپنی بھرپور جوانی کا پورا احساس تھا۔ پھر ماں کی تاکید کہ اوڑھنی اچھی طرح لپیٹ کر جایا کر۔

ابھرتے ہوئے جسمانی نشیب و فراز دیکھنے والوں کی آنکھوں میں لگاؤ ڈال دیتے۔ یوں بھی بختو کو چند دنوں سے ادراک ہوا تھا کہ سامنے اکثر آتے جاتے زمیندار کا بیٹا اسے دیکھ کر ٹھٹھک کر رک جاتا تھا اور اسے غلیظ نظروں سے گھورتا، بختو اس کی شریر نظروں سے گھبرا کر تیز تیز چلنے لگتی۔

حق نواز کی شہرت ویسے بھی اچھی نہ تھی۔ بختو دوڑتے ہوئے گھر آ گئی اور شریفاں سے بات چھپا گئی۔ بختو کی کوئی ہمراز سہیلی بھی نہ تھی۔

جو تھی وہ پہلے برس بیاہی گئی۔ اب کس کو راز دار بناتی، خود میں ہی سمٹ کر رہ گئی، کبھی لکڑیاں کبھی گنے تو کبھی سبزی توڑنے میں وہ ماہر ہو گئی تھی۔

شریفاں کو جب سے گھٹنوں کا درد زیادہ تنگ کرنے لگا تھا۔ وہ بختو ہی کو بھیج دیتی تھی۔ بختو کا باپ فضل بخش پانچ سال پہلے شہر میں مزدوری کرتے ہوئے جاں بحق ہو گیا تھا۔ شریفاں، بختو کو اپنے پروں میں چھپائے ہوئے تھی۔ مگر زمانے کی نظروں سے بچا نہ سکی۔

☆......☆......☆

لکڑیوں کا ڈھیر جمع کر کے وہ بینگن اور ہری مرچ توڑ کر اپنے ساتھ لائے کپڑے میں باندھنے لگی۔ آج اسے خاصی دیر بھی ہو گئی تھی۔ عصر کا وقت تھا۔

ہو کا عالم، مرد صبح تڑکے کام شروع کرتے لہٰذا اب اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ عورتیں چولہا چکی میں لگی تھیں، پرندوں کی آوازیں تھیں۔ کوئل کی کوک بھی وقفے وقفے سے سنائی دیتی۔ دور سے آتی چکی کی آواز ماحول میں ارتعاش سا پیدا کر دیتی۔

قریب سے یکدم آہٹ پر بختو کا دل لرزا، اُس نے جلدی سے اوڑھنی میں خود کو سمیٹا۔ اٹھنے لگی کہ پیچھے سے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر گرا دیا۔ حق نواز اور اُس کا یار کرامت ......

بختو چیخنے کی کوشش میں ناکام ہو رہی تھی۔ حق نواز کی آنکھوں میں پوری طرح شیطانیت اور خباثت موجود تھی، اور ہاتھ میں پستول......

بختو خود کو چھڑانے لگی۔ اوڑھنی پھٹنے لگی تھی اس کے منہ سے اوں آں کی آوازیں نکلنے اور دم توڑنے لگیں۔ حق نواز اس سے زبردستی کرتا اُسے گھسیٹتا ہوا گنے کے کھیتوں میں لے گیا۔ زمین پر گرا کر اُس پر سوار ہو گیا۔

بختو کی چیخیں اندر ہی اندر دم توڑ گئیں۔ حق نواز کا پہرہ دار موجود تھا۔ اُس کا کوئی پہرہ دار نہ تھا۔ وہ لٹتی رہی۔

حق نواز کے بعد کرامت نے بھی اپنا حصہ وصول کیا۔ پھر اُسے دھمکاتے، فتح مندی سے پستول لہراتے، قہقہے لگاتے، اس نیم مردہ بختو کے وجود کو تڑپتے چھوڑ غائب ہو گئے۔

ولی محمد کسان شام ڈھلے زمین پر چکر لگاتے ہوئے بختو کو بے ہوش پا کر چکرا گیا۔ اُس کی حالت دیکھ کر اُس نے اپنے صافے سے بختو کا عریاں جسم ڈھانپا اور شور مچا دیا کافی لوگ جمع ہو گئے۔

جس نے سنا اس نے منہ میں انگلی داب لی۔ سولہ، سترہ سالہ بختو عزت جیسا آبدار موتی گنوا چکی تھی اور بیہوش و خر سے بیگانہ تھی۔ لٹی پٹی بختو کو قریبی میڈیکل سینٹر لایا گیا تو ڈاکٹر غائب تھی۔ سینے پر دو ہتڑ مارتی شریفاں اپنی جمع پونجی لٹنے پر نہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں۔

بختو کو ذرا سا ہوش آتا پھر غافل ہو جاتی۔

☆......☆......☆

اگلے دن بختو کو قدرے ہوش آیا، تو وہ چیخنے چلانے لگی۔ رو رو کر اُس کی آنکھیں سوج گئیں تھیں۔ وہ کیا بتاتی۔

''تھانے چلو رپورٹ کراؤ۔'' ماما اسلم نے مشورہ دیا تو وہ شریفاں اور بختو کو لے کر تھانے پہنچ گیا۔

تھانیدار حسب معمول چھٹی پر تھا۔ بس دو وردیوں والے بیٹھے گپیں مار رہے تھے۔

سرخ سرخ آنکھوں اور بڑی توند والا حمید اللہ کرسی پر فٹ تھا، مکمل بات سن کر بمشکل اُٹھ کر وہ تھرتھر کانپتی بختو کے پاس آیا اور بولا۔

''تو یہ ہے وہ لڑکی...... ہوں......'' وہ سرتاپا اُس کا جائزہ لینے لگا۔

''جی صاحب!'' ماما اسلم سر جھکا کر آہستگی سے بولا۔

بختو مسلسل کانپ رہی تھی۔ شریفاں اُسے سنبھالتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں سے حمید اللہ کو دیکھ رہی تھی۔

''لڑکی سے کچھ سوال و جواب کرنے پڑیں گے۔ تاکہ رپورٹ تیار کی جاسکے۔'' حمید نے اپنے محرر کو بلایا اور بیان لکھنے کو کہا۔

''ہاں تو لڑکی بولو، وقوعہ کے دن کیا ہوا تھا۔'' حمید کے نزدیک یہ بے حد چسکے دار سوال تھا۔ مگر بختو کے لب سل چکے تھے۔ وہ مارے دکھ اور صدمے کے بول ہی نہ پا رہی تھی۔ جبکہ حمید مسلسل سوال کر رہا تھا۔

آخر کار محرر زچ ہو کر بولا۔

''بی بی جب تک بیان نہ دو، رپورٹ درج نہ ہوگی۔'' وہ کاغذ سنبھالتے ہوئے بولا اور حمید اللہ کو دیکھنے لگا۔

''وہ جی بتایا تو ہے آپ کو...... زمیندار کے بیٹے حق نواز اور اُس کے یار نے زبردستی کی ہے۔'' ماما اسلم تڑپ کر بولا۔

''او...... بابا...... زبردستی و زیادتی تیرے

ساتھ ہوئی ہے یا اس کے ساتھ، بیچ میں مت کود......'' حمید اللہ انتہائی درشتی سے بولا۔ شریفاں کانپتی بختو کو ساتھ لگائے بینچ پر بیٹھی تھی۔

''ہاں تو لڑکی بول...... اس نے کیا کیا کیا تھا۔ پہلے دوپٹہ کھینچا، پھر کپڑے اُتارے ہاں باری باری بولتی جا۔'' حمید اللہ نے مزے لیتے ہوئے کہا تو بختو کے پسینے چھوٹنے لگے۔ رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ شریفاں بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔

''پہلے حق نواز نے ہاتھ لگایا تھا یا اس کے یار نے۔'' حمید اللہ دل و جگر چیرنے والے سوال کر رہا تھا۔ بختو گنگ بیٹھی تھی۔ زبان تالو سے جا لگی تھی۔ بس اپنے ہی آنسوؤں کے ساتھ پانی پانی ہو رہی تھی۔

''او مائی تیری بیٹی تو ابھی تک عزت لٹنے کا ماتم کر رہی ہے۔ جب بیان دینے پر آئے پھر آنا۔ ٹیم برباد نہ کرو ہمارا، جاؤ اب......''

حمید اللہ نے غصے سے کہا اور کرسی پر جا بیٹھا۔ ماما اسلم نے دونوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور تینوں جانے لگے۔

محرر، حمید اللہ اور باقیوں نے فلک شگاف قہقہوں کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔

☆......☆......☆

بختو رات دن رو رو کر گزار رہی تھی۔ اس دن بھی بستی کی عورتیں ماسی رحمتے کے تندور پر اکٹھی تھیں اور اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں۔ پروین، شمیم اور کئی عورتیں بیٹھی تھیں۔ بختو کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے، اس سے بڑھ کر اور کرنے کو کوئی بات تھی ہی کہاں۔

''ہائے نی کیا پتہ حق نواز کے ساتھ آنکھ مٹکا نہ ہووے اُس کا۔''

''آہو نی...... آج کل کی کڑیوں کا کیا پتہ؟''

''الزام حق نواز پہ لگا دیا ہو، جوانی منہ زور ہووے ہے۔''

''ایسا نہ کہو...... بختو بڑی معصوم سی ہے۔ اسے کیا پتا ان باتوں کا، ہمارے سامنے وڈی ہوئی۔ بچپن سے سامنے ہے۔'' پروین نے آخر کار اُس کی طرف داری کی تو سبھی اونہہ کر کے رہ گئیں بختو ایک زندہ لاش کی مانند تھی۔

زمیندار نے تھانیدار کا منہ بند کرنے کے لیے ہزاروں روپے دے ڈالے اور حق نواز کو شہر بھجوا دیا۔ شریفاں انصاف کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگی۔ مارے حیا کے ماما اسلم اب ان کے گھر نہ آتا۔ بلکہ کوئی بھی نہ آتا تھا۔ دونوں ماں بیٹی سسکتی ایک دوسرے کو نمناک نظروں سے دیکھتی بیٹھی رہتیں۔

دو دن اور گزرے جب ایک وردی والا تھانیدار کا پیغام لے کر آیا کہ لڑکی کو بیان کے لیے حاضر کیا جائے۔ ''وڈے تھانیدار آ گئے ہیں۔'' بختو اس کے جاتے ہی ماں سے لپٹ گئی اور تڑپ کر رو دی۔

''نہ میری دھی، جو قسمت میں لکھا تھا وہ مل گیا۔ اب چل انصاف تو لے آئیں لٹی عزت کے بدلے۔'' شریفاں نے اُسے الگ کر کے پیار سے سمجھایا۔ اور منہ دھلا کر اُسے اوڑھنی میں چھپایا۔ گویا وہ بے جان مورتی ہو۔

بختو سسکتی لرزتی ماں کے ساتھ تھانے میں پہنچ گئی۔ کمرے میں محرر اور دو سپاہیوں کے ساتھ وڈا تھانیدار بیٹھے تھے۔ حمید انہیں دیکھتے ہی چمک کر بولا چسکا لیتے ہوئے۔

''آ جا...... مائی......'' ساتھ ہی وہ بختو کو مسکرا کر دیکھنے لگا۔ بختو ماں کے پیچھے چھپنے لگی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''سلام جی ......'' شریفاں نگاہیں جھکا کر بولی۔ تھانیدار کے ساتھ سب کی نظروں میں تمسخر تھا۔

''ہوں تو یہ ہے چھوری......'' وڈا تھانیدار بے ہودگی سے بولتا ہوا بختو کے پاس آیا بختو لرزہ براندام تھی۔

''کیا ہوا تھا...... وقوعہ کے وقت۔'' وہ رعونت سے بولا۔

تب شریفاں کے بولنے سے قبل ہی تھانیدار جلال بھرے انداز میں بولا۔

''تو خاموش رہ مائی...... اس کو بولنے دے۔'' بختو ابھی تک عدم تحفظ کا شکار تھی۔

''کتنی بار بتائے ...... کیا کیا بتائے ...... بتا بتا کے یہ میرے آنسوؤں سے داستانِ غم جان کیوں نہیں لیتے۔ کیوں میری لٹی عزت و ناموس کو اچھال رہے ہیں۔ میری بے چارگی ان کو دکھائی کیوں نہیں دیتی۔

''میڈیکل کرایا اس کا؟'' تھانیدار تیز نظروں سے بختو کا جائزہ لیتا ہوا اس کے چہرے پر معصومیت اور آنکھوں میں خوف کے سائے تھے۔ ایسی ہرنی کی مانند تھی جو شکاریوں میں بے بسی سے گھری تھی۔

''نہ جی...... ڈاکٹرنی چھٹی پر ہے۔'' شریفاں بے چارگی سے بولی۔

''اس کا مطلب ہے کہ رپورٹ نہیں آئی، جس سے پتہ چلے کہ زیادتی ہوئی ہے کہ نہیں۔'' وڈا تھانیدار تمسخرانہ انداز میں بولا تھا۔

''کیوں نہیں ہوئی زیادتی...... میری بیٹی داغدار ہوئی ہے۔ ہم لٹ گئے، برباد ہوگئے۔ زمیندار کے بیٹے حق نواز نے جرم کیا ہے۔ اور تسی کہہ رہے او کہ پتہ نہیں ابھی تک۔''

شریفاں صبر کا دامن چھوڑ بیٹھی تھی۔ اب غصے میں بول رہی تھی۔

''او مائی زیادہ بک بک نہ کر......لڑکی سے پوچھ گچھ کرنے دے رپورٹ آگے بھیجنی ہے۔'' تھانیدار کہتا ہوا بختو سے سختی سے بولا۔

''ہاں لڑکی بول کون تھا، کیا ہوا تھا؟''

بختو کے لب سل چکے تھے۔ آنکھیں رو رو کر لال ہو کر سوج گئی تھیں۔ اس سے بڑا ثبوت کیا تھا۔ پھر بھی وہ ہمت جمع کر کے بول پڑی۔

''وہ جی......حق نواز اور اس کے یار نے مجھے برباد کر دیا۔'' بختو اتنا کہہ کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ شریفاں نے اسے ساتھ لگالیا۔ کمرے میں سسکیاں تھیں۔

''کیسے برباد کیا، کہاں کہاں ہاتھ لگایا۔ کیا کیا، کیا کس نے؟'' بختو کے آس پاس سوالوں کے نیزے اُسے زخمی کر رہے تھے۔ شریفاں نے اِک تیز گھورتی نگاہ ان سب پر ڈالی اور حقارت سے بولی۔

''تم سب شیطان ہو، سب ایک ہو۔'' وہ بختو کو مضبوطی سے تھام کر احتیاط سے گھر لے آئی۔

☆☆......☆☆......☆☆

شام کو شریفاں کے گھر دو لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے تیار تھیں۔ ایک شریفاں کی اور ایک بختو کی......

جس نے انصاف نہ ملنے پر گندم میں رکھنے والی دوا خود بھی کھالی تھی اور بختو کو بھی کھلا دی تھی۔ دونوں اب ابدی نیند سو رہی تھیں اس یقین کے ساتھ کہ قدم قدم پر مرنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی بار مرا جائے اور انصاف تو روزِ قیامت ہی ملے گا۔

☆☆......☆☆......☆☆

ناولٹ

نعمان اسحٰق

اِک فسانہ ہے زندگی

''لوہار کا بیٹا اب انیس گریڈ کے افسر کی بیٹی سے محبت کرے گا۔ بیٹا چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔'' والد صاحب تو رشتہ لے جانے سے انکاری ہو گئے۔ تازو بھی اپنی بات کا ایک تھا۔ خود ہی افسر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ چھٹی کا دن تھا۔ افسر صاحب گھر پر ہی......

وہ شہر جو اولیاء کا شہر مانا جاتا تھا۔ جس کی گرمی ضرب المثل کے طور پر مشہور تھی۔ جہاں گرم ہوائیں شہر کو لپیٹ میں لیے رکھتیں۔ جہاں کے آم دنیا بھر میں مشہور تھے۔ جہاں کا سوہن حلوہ ہر دل عزیز تھا۔ شہرِ ملتان...... اور اس شہر کا باسی شاہ زیب، ہمارا شاہ زیب۔

سیدھی سڑک تھی جو یوں محسوس ہوتا کہ دور افق پر زمین سے نکل کر کسی دوسرے سیارے تک جاتی ہے۔ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ معمول کے خلاف موسم میں خوشگواریت گھل چکی تھی۔ بادلوں کے ٹکڑے خورشید کو چھپا چکے تھے۔

ٹھنڈی ہوائیں پیغام لا رہی تھیں کہ بس چند لمحوں میں بارش ہوا چاہتی ہے۔ کسی نئے گانے کی دھن پر سیٹی بجاتا شاہ زیب۔ تیز قدموں سے چلا جاتا تھا۔ یہ موسم کی خوشگواریت ہی تو تھی جس کی وجہ سے اس نے پوائنٹ مس کر دی تھی اور یونہی چہل قدمی کرتا گھر کی طرف ہولیا۔

راستے میں سموسہ کارنر پر باہر سڑک کنارے رکھی بڑی سی کڑاہی میں پکوڑے تلتے نظر آئے۔ ایک سوندھی سی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تو شاہ زیب کے دل میں بھی پکوڑے کھانے کی خواہش جاگی۔ خود کو پکوڑے خرید کر کھانے سے روکتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا گھر جا کر افشاں سے کہے گا کہ پکوڑے تلے۔

برسات کے موسم میں پکوڑے کھانے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ افشاں سے نہیں امی سے کہوں گا کوئی ذائقہ ہی نہیں افشاں کے ہاتھ میں۔ پکوڑوں کے نام پر دہی بھلوں کے بھلے کھانے کو ملیں گے۔ اپنی سوچوں میں غلطاں و پیچاں وہ چلا جاتا تھا کہ موبائل کی بیپ نے ایک نیا پیغام وصول ہونے کا اعلان کیا۔

''برسات کی پہلی بارش مبارک ہو۔'' صدف کا پیغام موبائل کی اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔ ایک مسکراہٹ اس کے چہرے کا احاطہ کر گئی۔ یقیناً شہر کے اس حصے میں بارش ہو گئی ہو گی جہاں

صدف کا گھر تھا۔ پیاری سی صدف آن کی آن میں ایک الھڑ سی لڑکی تخیل میں آن سمائی شہد آگیں رنگت۔ ستواں ناک' غزالی آنکھیں۔ ایسے جیسے کانچ کی ہوں۔ براؤن کھلے بال جو شاذونادر ہی جوڑے کی شکل میں باندھ لیتی۔

عموماً لمبی قمیض اور چوڑی دار شلوار میں ملبوس ہوتی۔ کبھی کبھار وہ ٹخنوں تک لمبا سکرٹ بھی پہن لیتی۔ جوتی تو ہمیشہ سوٹ سے ہم رنگ ہوتی۔ اور کس قدر خوبصورت لڑکی تھی اور اس سے بھی زیادہ دل کے قریب تھی۔

خیالوں کا سلسلہ شاید نہ رکتا اگر بارش کی پھوار شاہ زیب کو متوجہ نہ کرتی۔

بارش کے قطرے ہتھیلیوں میں اکٹھا کرتے۔ قدموں کی رفتار مزید تیز کرتے شاہ زیب چلا جاتا تھا اور جب تک وہ گھر کے دروازے تک پہنچا تب تک بارش موسلا دھار ہو چکی تھی اور اپنے جوبن دکھا رہی تھی۔ چہرے پر ایک شریر سی مسکراہٹ لیے وہ گھر میں داخل ہوا۔

گھر جو اپنا تھا۔ اور اس کرۂ ارض پر سب سے زیادہ پرسکون جگہ محسوس ہوتا تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ آپ دنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں جو سکون آپ اپنے گھر میں محسوس کرتے ہیں وہ کہیں اور محسوس نہیں کریں گے۔

گھر کا سیاہ دروازہ دھکیلتا وہ اندر داخل ہوا۔ آنگن میں موسلا دھار بارش برستی کتنی اچھی لگتی تھی۔ بارش میں بھیگتا۔ آنگن پار کرتا وہ اندر داخل ہوا۔ افشاں کچن کے دروازے کی چوکھٹ میں ایستادہ یہ چائے کا بڑا مگ ہاتھ میں لیے نظریں برستی بارش پر جمائے گھونٹ گھونٹ چائے پی رہی تھی۔

''اوہ بی سیانی ساون کی بارش میں بھی کوئی چائے پیتا ہے۔ یہ بارش تو پودینے کی چٹنی کے ساتھ پکوڑے کھانے کی دعوت دیتی ہے۔ مگر تم تکلیف مت کرنا۔ پکوڑوں کے نام پر دہی بھلوں کے بھلے کھانے کا ہرگز دل نہیں۔ امی کو کہتا ہوں وہ پکوڑے بنا دیتی ہیں۔ وہ ہیں کہاں؟ کیا اندر ہیں؟ کس قدر حسین موسم ہے۔ وہ اندر کیا کر رہی ہیں۔ امی امی......''

افشاں یونہی گھونٹ گھونٹ چائے اندر اتارتی رہی ایسے جیسے شاہ زیب کی بات سنی ہی نہ ہو۔ ساون کی پہلی بارش نے شاہ زیب کو کچھ ایسا باؤلا کر دیا تھا کہ وہ افشاں کے چہرے پر کندی سنجیدگی دیکھ ہی نہ پایا۔

اس سے قبل وہ اندر جا کر ماں کو پکارتا۔ ایک تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور اس کے قدم وہیں تھم گئے۔

''نا ہنجار عورت۔ کوئی ایک فائدہ بھی ہے تمہارا۔ میرا سر درد ایک تم اور دوسری تمہاری نکمی اولاد۔

پال پال کر تم لوگوں کو تھک گیا ہوں۔ یہ بال سفید ہو گئے ہیں۔ مگر آج بھی تم لوگوں کا پیٹ بھرنا میری ذمہ داری ہے۔ یہ بیٹا کیا بس سڑکیں ناپنے کے لیے جوان کیا تھا۔ اور بیٹی چائے کے نام پر اچھا جوشاندہ بنا لیتی ہے۔ ساری بات تربیت کی ہے۔ اور اچھی تربیت وہی ماں کر سکتی ہے جو اچھے خاندان سے ہو۔ اور لوہاروں کے گھر سے آئی عورت کہاں جانتی ہے کہ تربیت کس چیز کا نام ہے......''

ساون کی بارش ویسی ہی موسلا دار تھی۔ پر شاہ زیب کے چہرے کی مسکراہٹ بوڑھی ہو چکی تھی۔ تبھی امتیاز احمد کمرے کا دروازہ پار کرتے آئے۔ شاہ زیب کو وہاں کھڑا دیکھ کر ان کے چہرے کے

تاثرات مزید بگڑے تھے۔

''آ گئے جوتیاں چٹخا کر۔ مجھے بتاؤ یہ یونیورسٹی کی پڑھائی تمہیں کیا فائدہ دے رہی ہے۔ ہاں البتہ ذمہ داری سے جان چھوٹی ہوئی ہے۔ اڑالو اڑالو پھر ے، اور یہ موئی بارش۔ کیا بے وقت کی بارش ہے۔

کاروبار ہی بند کرا دیا۔ آج کتنی اہم ڈیلنگ طے کرنی تھی، افسوس......''

امتیاز احمد کا غصہ اب موسم پر آ کر ٹوٹا تھا۔ افشاں بغیر متوجہ ہوئے چائے کے نام پر تیار شدہ جوشاندہ گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارتی رہی۔ وہ کچھ ایسی انجان کھڑی تھی کہ لگتا تھا کہ منظر کا حصہ ہی نہیں۔

اور شاہ زیب......

باپ کی بات نے دل آج ایک بار پھر توڑ دیا تھا۔ وہ دل جو آج کل کسی اور کے لیے دھڑکتا تھا ،صدف کے لیے۔

☆......☆......☆

انسان کی پہلی انسپائریشن اس کے والدین ہی ہوتے ہیں۔ بیٹی کے لیے ماں اور بیٹے کے لیے اس کا باپ۔ مگر شاید ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کم از کم شاہ زیب تو اپنے باپ کو اس معاملے میں کم نصیب پاتا۔ کم نصیب یا بد نصیب۔ دونوں الفاظ ہم معنی تو نہیں۔

بچپن کے قصے تو بس اپنی شرارتوں تک ہی یاد تھے۔ ان قصوں میں بھی والد محترم کا کردار غصہ کرنے تک محدود تھا۔

مگر جیسے جیسے شعور کی منزلیں طے ہوتی گئیں اور حالات و واقعات جزئیات کے ساتھ سمجھ آنے لگے تب معلوم ہوا کہ والد صاحب اس پر کیا احسان کر رہے ہیں۔

''اسے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔''

''اسے کھلا پلا رہے ہیں۔''

''اس کے جملہ اخراجات اٹھا رہے ہیں۔''

کس قدر عظیم احسانات تھے۔ اور ایسے تھے وہ چاہ کر بھی ساری زندگی نہ اتار سکتا تھا۔

کبھی کبھی زندگی گھٹن زدہ لگتی اور وہ سوچنے لگتا کہ کیا تمام باپ ایسے ہوتے ہیں۔

جواب ہمیشہ نہ ملتا، بلکہ اس کے دوست فسانہ عجب ہی سناتے۔

''ابو ہیوی بائیک کے لیے کہاں ماننے والے تھے اور میں بھی تو ان کا بیٹا ہوں منوا کر ہی رہا۔'' زاہد مسکراتا ہی جاتا اور بائیک کی چابی لہراتا جاتا۔

''ہم مری جا رہے ہیں۔ سیر کے لیے، ابو نے بھی دفتر سے چھٹیاں لے لی ہیں۔ ساری فیملی اکٹھی ہو گی تو کتنا مزہ آئے گا۔'' عبداللہ مزے سے بتاتا۔

''یار میرے گھر کے حالات تم سے ڈھکے چھپے ہرگز نہیں۔ اس بار تو سمسٹر کی فیس اکٹھی ہی نہ ہو رہی تھی۔ ابو نے اپنے دوست سے ادھار لیے۔'' راحیل کے چہرے پر پریشانی کے آثار گزشتہ دنوں سے کم ہوئے۔

دوست' ہمسائے رشتہ دار باپ کے ساتھ منسلک ایسے قصے سناتے کہ باپ کبھی مہربان دوست محسوس ہوتے تو کبھی غم گسار ساتھی۔ اور اس کے والد صاحب۔ امتیاز احمد۔

''دنیا کس قدر مشکل ہے۔ تمہیں کیا اندازہ، تم تو مزے سے پڑھنے جاتے ہو اور گھر پر گرم گرم روٹی کھاتے ہو۔ جب کماؤ گے تو پتہ چلے گا۔'' شاہ زیب یک ٹک ان کا چہرہ دیکھے جاتا۔

''شکر کرو خدا کا کہ اس نے تمہیں میرے گھر پیدا کیا۔ کسی موچی' بھنگی کے گھر پیدا کیا ہوتا تو

بچپن ننگا گھوم کر گزرتا اور اس عمر میں باپ کے ساتھ بیٹھ کر جوتیاں گانٹھتے یا پھر گلی گلی گھوم کر نالیاں صاف کرتے۔''

کیا کوئی باپ اپنے بیٹے وہ بھی اکلوتے بیٹے سے یہ سب کچھ کہتا ہے۔

ہاں کہتا ہے۔

امتیاز احمد تو کہتے تھے۔

پچھلے مہینے کی بات تھی۔ گھریلو ناول پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ افشاں اپنی کسی دوست سے لے آئی تھی۔ اس نے تو چند صفحے ہی پڑھ کر ایک طرف ڈال دیا۔

''ہونہہ یہ خواتین رائٹر بھی۔ بس ایک ہی موضوع کو مختلف قالب میں ڈھالتی رہتی ہیں۔''

افشاں جناتی، بد روحوں اور خلائی مخلوق کے بارے میں پڑھنا پسند کرتی تھی۔ یہ نہیں تو عالمی مسائل۔ گھریلو مسائل کے بارے میں اس کی رائے تھی۔

''اپنے گھر میں نہ ہوتے ہوئے ایسے مسئلے ہیں کہ کم از کم کہانیوں میں مسئلے نہیں پڑھے جاتے۔''

شاہ زیب نے ناول پڑھا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ یہ ایک باپ کی اپنے بیٹے سے محبت کہ کہانی تھی۔ بیٹے کے دل میں سوراخ ہوتا ہے اور باپ اپنی ساری جائیداد بیٹے کے علاج پر لگا دیتا ہے۔ اور اس کا لگایا ضائع بھی نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر بیٹے کو نئی زندگی دیتے ہیں۔

اور چند سال بعد بیٹا باپ کو دنیا جہاں کی خوشیاں لا دیتا ہے۔ اور مرتے وقت بیٹے کو دنیا جہاں کی دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ کہانی کے آخری مناظر میں بیٹا اپنے بچوں کو باپ کہ محبت و شفقت کے قصے سناتے ہوئے نم آنکھوں سے بچوں کو بتاتا ہے کہ اس کی محبت تو ان کے دادا کی محبت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

عام سی دوہرائی کہانی تھی۔ مگر چونکہ شاہ زیب کے اپنے والد صاحب کے ساتھ کچھ ایسے دیرینہ تعلقات نہ تھے۔

اس لیے ناول پڑھتے ہوئے ہر جذباتی سین پر اس کی آنکھیں نم ہوئیں اور ناول کے اختتام تک اس کے ذہن میں سوچ تھی۔

''بس میں جذباتی ہوں۔ تو جوانی میں شاید انسان ایسے ہی الٹ پلٹ سوچتا رہتا ہے۔ ابو بس اپنی محنت اور لگن کا بتاتے ہیں۔ اور مجھے سمجھانے کے لیے کچھ سخت مثالیں دیتے ہیں۔ ورنہ وہ مجھ سے بے حد انس رکھتے ہیں۔'' وہ ان سے ڈھیر ساری باتیں کرے گا۔

شومئی قسمت۔ وہ جون کا تیسرا اتوار تھا۔ اور رائج انگریزی اصولوں کے مطابق جون کا تیسرا اتوار۔

فادر ڈے کے طور پر منایا جاتا ہے۔ فیس بک پر اس کے چچازاد کزن پلس دوست احمد نے اسٹیٹس اپ لوڈ کیا ہوا تھا۔

''پیارے ابو۔ آپ کو بچھڑے بیس سال ہو چکے ہیں۔ جب آپ ہم سے بچھڑے میں چھ ماہ کا تھا کہ میں نے آپ کو دیکھا ہوگا۔ محسوس کیا ہوگا۔ آپ کی گود میں کھیلا ہوں گا۔ مگر مجھے کوئی بات یاد نہیں۔

مگر آپ سے کہنا چاہتا ہوں میں نے زندگی کے ہر موڑ پر آپ کو یاد کیا ہے۔ آپ کو مس کیا اسکول کے ہر فنکشن پر۔

تب جب میں سائیکل سے گرتا تھا۔ اور تب بھی جب مخالف سمت موٹر سائیکل چلانے پر ٹریفک وارڈن نے میرا چالان کیا تھا۔ اور تب

بھی کروں گا جب میں یونیورسٹی سے آؤٹ ہوں گا۔ آئی لو یو ابو۔ آئی مس یو ابو۔'' اسٹیٹس کے ساتھ ساتھ چچا کی تصویر بھی لگی تھی۔ جس میں وہ کسی ہیرو سے کم نہیں لگ رہے تھے۔

افتخار احمد۔ شاہ زیب کے چچا۔ امتیاز احمد کے چھوٹے بھائی۔

جوانی میں ہی ایک ٹریفک حادثے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اور فادرز ڈے پر ان کا بیٹا احمد ان کو یاد کر رہا تھا۔ اسٹیٹس کو لائک کرتے ہوئے اس نے تصویر اپنے موبائل کی فوٹو گیلری میں محفوظ کر لی اور شام کو جب والد صاحب آئے تو اس نے بات کی ابتداء کی غرض سے موبائل امتیاز احمد کی طرف بڑھایا۔

''ابو دیکھیں کس کی تصویر ہے۔'' امتیاز احمد نے موبائل پکڑ لیا۔ دو سیکنڈ تصویر پر دیکھ کر موبائل بیٹے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

''میں تھکا ہوا آیا ہوں۔ ہم کاروباری لوگوں کی زندگی میں کہاں کا سنڈے۔ یہ تو تم جیسے فارغ لوگوں کو عیاشی ہے۔ اب تھکے ہوئے بندے کو تم کیوں کسی پرانے ٹی وی آرٹسٹ کی تصویر دکھاتے ہو۔''

امتیاز احمد اپنے مرحوم بھائی کو نہ پہچان پائے تھے۔ اور اسے پرانا ٹی وی آرٹسٹ کہہ رہے تھے۔ شاہ زیب کے دل پر کچھ ایسی گزری کہ کئی لمحے بول نہ پایا۔

''ابو یہ چچا افتخار کی تصویر تھی۔ احمد نے فیس بک پر لگائی تو میں نے موبائل میں سیو کر لی۔'' امتیاز احمد نے دوبارہ تصویر دیکھنے کے لیے موبائل نہ مانگا۔

''اب بیس پچیس سال پہلے والی تصویریں کہاں پہچانی جاتی ہیں۔ میں اپنی تصویر نہ پہچان پاؤں۔'' تبھی والدہ صاحبہ ہاٹ پاٹ لے آئیں اور امتیاز احمد بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھانے لگے۔

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔ وہ اپنی تصویر بھی پہچاننے سے قاصر تھے۔

شاہ زیب ان کی تصویر ہی تو تھا۔ مگر وہ آج تک پہچان نہ پائے تھے۔

باپ کی عدم دلچسپی سے شاہ زیب کے دل پر کچھ ایسا گزر پڑا کہ باپ بیٹے کی محبت کے قصے سناتا ناول اور فادرز ڈے اس کے ذہن و خیال سے جاتے رہے۔ اور کئی دن باپ سے مخاطب نہ ہوا۔ امتیاز احمد نے بھی کوئی خاص ضرورت محسوس نہ کی۔ بلکہ ان کو تو پتہ بھی نہ چلا کہ شاہ زیب جان بوجھ کو ان سے بات نہیں کر رہا۔

بس یہ امتیاز احمد اور شاہ زیب کے تعلقات کی کہانی تھی۔ جن میں عدم دلچسپی تھی، سرد مہری تھی۔ احسان شامل تھا۔ اور اگر کچھ شامل نہ تھا تو شاید جذبہ محبت تھا۔

تو آ جذبہ محبت کے بغیر جی کر دیکھیں۔
کہ زندگی کے رنگ خریدے
بازار سے ہیں نے
خود اعتمادی سے
لگن سے اور دھن دولت سے......

☆......☆......☆

یوں تو تاجدار بھی گردیزیوں کے خاندان سے تھی۔ مگر وہ گردیزوں کے خاندان کا وہ حصہ تھا جن پر پیسے جن نعمت روٹھی ہوئی تھی۔ روپیہ پیسہ ان کو محتاج بنا کر پیش کرتا۔ تاجدار کے دادا اور پھر اس کے باپ لوہار کا کام کرتے رہے۔

اور وہ گردیزی جن کی زمینیں، جائیدادیں اور آموں کے باغات تھے۔ گردیزی ہی رہے۔ مگر تاجدار کے باپ دادا لوہار مشہور ہو گئے۔ اور وہ

اس قدر مشہور ہوئے کہ لوگ بھول ہی گئے کہ وہ گردیزی بھی ہیں۔ بس اب وہ لوہار ہی جانے جاتے اور پہچانے جاتے۔

اور یہی کہانی امتیاز احمد کی تھی۔ کیونکہ تاجدار اور امتیاز کے دادا ایک ہی تھے اور وہ دونوں چچا زاد تھے۔

مگر شادی کے بعد جیسے جیسے پیسے کی نعمت ان کے گھر عام ہوتی گئی ویسے ویسے امتیاز احمد بھی گردیزی مشہور ہوتے گئے۔ امتیاز احمد کی نسبت سے تاجدار کی ترقی ہوئی۔ مگر صرف دنیا کے لیے امتیاز احمد کے لیے نہیں۔ اور امتیاز احمد کے لیے وہ لوہاروں کی لڑکی بن گئی۔ اور اکثر تاجدار کو طعنہ دیتے۔

''ہونہہ، لوہاروں کے گھر سے آئی ہوئی۔'' یہ کہتے ہوئے امتیاز بھول جاتے کہ اس کے مرحوم والد بھی لوہار تھے۔ اور انہوں نے اور تاجدار نے ایک ہی محلے میں بچپن گزارا تھا۔

بھولنا بھی ایک نعمت ہے۔ اور اس نعمت کی وجہ سے انسان جو کچھ اناب شناپ چاہے بول سکتا ہے۔

اگلے دن کی صبح میں تازگی تھی۔ دھوپ دیواروں پر براجمان تھی۔ اور کچھ دیر تک آنگن میں بھی قبضہ جما لیتی۔ بارش کے بعد والا دن بھرپور تازگی لیے سب کو خوش آمدید کہہ چکا تھا۔ امتیاز احمد کام پر جا چکے تھے۔ اور چونکہ یونیورسٹی میں کلاسز نو بجے شروع ہوتی ہیں۔ اس لیے شاہ زیب گھر پر نظر آ رہا تھا۔ کالر والی ٹی شرٹ پہنے بالوں کا سائیڈ سے پف بنائے چہرے پر نوجوانی کی رعنائیاں لیے وہ حسین دکھتا تھا۔ گو کہ چہرے پر یاسیت اور سنجیدگی تھی۔ مگر یہی یاسیت اس کے نقوش پر بھلی سی لگتی۔

''امی'' تاجدار ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

''ہوں''

شاہ زیب چند لمحے خاموش رہا۔ اور کپ میں موجود چائے کو دیکھتا رہا۔

''آپ نے ابو کے ساتھ ساری زندگی کیسے گزار لی۔'' منہ تک جاتا چائے کا کپ کیسے چھلکا پتہ ہی نہ چلا اور چائے پاؤں پر گری۔

''سی'' تاجدار کے منہ سے آہ نکلی تھی۔

پاس بیٹھی افشاں حسب معمول یونہی بیٹھی رہی جیسے اسے اس منظر سے سروکار ہے اور نہ وہ اس منظر کا حصہ ہے۔

''امی آپ کا تو پاؤں جل گیا۔'' شاہ زیب کے لہجے میں افسوس آن ٹھہرا۔

''نہ بیٹا خیر ہے چائے کچھ ایسی گرم نہ تھی۔''

''میں کریم لاتا ہوں۔'' شاہ زیب اٹھ کھڑا ہوا فریج میں جلے زخموں کی کریم موجود تھی۔

''نہیں بالکل ضرورت نہیں۔ میں کہہ تو رہی ہوں چائے زیادہ گرم نہ تھی۔ اور یہ کچھ اتنی زیادہ گری بھی نہیں۔ تم بیٹھو۔'' تاجدار نے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔ شاہ زیب ماں کو دیکھتا رہ گیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد تاجدار گویا ہوئیں۔

''تمہارے ابو اچھے انسان ہیں۔ سیلف میڈ آدمی ہیں اسی لیے پیسوں سے متعلق زیادہ حساس ہیں۔ انہوں نے رانی کی طرح مجھے عیش کرائے ہیں۔''

تاجدار نے پوری کوشش کی کہ مسکراہٹ میں رنگ بھر پائیں پر مسکراہٹ کا یہ پھیکا پن رنگوں سے کم ہونے والا نہ تھا۔

جواباً شاہ زیب کچھ نہ کہہ سکا۔ جانے اس کی ماں عظمت کے انتہائی درجے پر تھیں کہ باپ کے معاملے وہ ہی تصویر کا غلط رخ دیکھے جاتا تھا۔

مزید کچھ کہے بنا وہ ادھر سے اٹھ آیا۔

☆......☆......☆

وسیع و عریض رقبے پر پھیلی یونیورسٹی کی پر شکوہ عمارت۔ یوں لگتا شہر سے دور ایک اور شہر آباد ہے۔ اور وہ شہر جہاں معلم، مدرس، طلبا یا پھر ان کی خدمت پر مامور ملازم ہی آ سکتے تھے۔ کیا عجب احساس تھا۔ جو یونیورسٹی کی سرزمین پر قدم رکھنے پر دل کو چھو جاتا۔ یونیورسٹیاں کسی ملک کی ترقی کے لیے کس قدر ضروری ہیں۔ ان کی اہمیت سے ترقی یافتہ ممالک خوب واقف ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں ابھی بھی ایسے لوگ ہیں جو بکثرت یہ کہتے پائے جاتے ہیں۔

''بے روزگار نوجوان پیدا کرنے کی فیکٹری لگی ہے۔ نوجوان اپنی زندگی کے تین چار سال بھی یونیورسٹی کو دیتے ہیں اور صلے میں بے روز گاری پاتے ہیں۔ اگر نوکری مل بھی جائے تو کئی جوتیاں ٹوٹنے کے بعد۔ اور وہ بھی محض دو ٹکے کی۔ اس کے علاوہ (آواز قدرے دھیمی ہو جاتی) معاشقے چلانے کے لیے بڑی اچھی جگہ ہے۔

''کسی نے خوب ہی کہا ہے اگر کسی قوم کو مغلوب اور ترقی پذیر ہی رکھنا ہر تو ان کی سوچ کو آلودہ مفلوج اور مغلوب رکھو۔ قوم ہمیشہ مغلوب ہی رہے گی۔''

بہر حال شہر ملتان کی یونیورسٹی باہیں پھیلائے اپنے طلباء کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ نئے داخلوں کا موسم تھا۔ چہرے پر سوالیہ نشان لیے اور دلوں میں داخلے کی خواہش لیے کئی نوجوان لڑکے لڑکیاں ایڈمنسٹریٹو ڈیپارٹمنٹ اور دوسرے ڈیپارٹمنٹ کا چکر لگاتے نظر آتے۔

''ملتان شہر میں زندگی آسان نہیں۔ یار روزے رکھ کر تو میری جان ہی نکل گئی۔ بے شک اللہ توفیق نہ دیتا تو میں کبھی روزے نہ رکھ پاتا۔''

روزوں اور عید کو گزرے ابھی زیادہ دن نہ ہوئے تھے۔ اور یہ کہنے والا احسن تھا۔ احسن ملکہ کوہسار کے پہاڑوں کے میدان کسی وادی کا باشندہ تھا۔ اور پڑھنے کی لگن اسے یونیورٹی لائی تھی۔ ہمارے شاہ زیب نے جو کالر والی ٹی شرٹ پہنے اور بالوں کا پف بنائے اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اسے احسن کے فقروں نے متوجہ کیا۔

''نہیں احسن ایسا بھی نہیں۔ کیا ملتان کی پچاس لاکھ عوام نہیں رہ رہی؟ دراصل میں ہم جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں کے موسم ہمیں راس آجاتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ سردی برداشت نہیں ہوتی۔ میں کبھی ٹھنڈے علاقے میں جا کر رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ گو کہ ملتان کا موسم بڑا سخت ہوتا ہے۔ مگر ملتان کو اللہ نے کیسی نعمتوں سے نوازا ہے۔ کیا پورے ملک میں کوئی ایسا خطہ ہے جو اولیا کی سرزمین مانا جاتا ہو۔ کیا ملک کے کسے خطے کے آم ملتان کے آموں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اب تو ملتان کے آموں نے عالمی شہرت حاصل کر لی۔

بھارت میں فروٹ فلائی کے حملے نے جہاں آموں کو خراب کیا ہی۔ وہاں پاکستان خاص کر ملتان کے آم دنیا بھر میں مزید شہرت کے حامل ہو گئے ہیں۔''

اور ملتان کا سوہن حلوہ۔۔۔'' شاہ زیب ابھی کچھ بولتا کہ احسن نے اس کی بات ہنستے ہوئے کاٹی۔

''یار تم تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔ میں تو بس ویسے ہی کہہ دیا۔ ملتان جتنا تمہارا ہے اتنا ہی میرا ہے اور مجھے ملتان سے محبت ہے۔ یہ شہر تو مستقبل میں میرے لیے فینٹسی بن جائے گا اور میں وادی جا کر لوگوں کو شہر ملتان میں گزرے وقت اور یونیورسٹی

میں کی گئی شرارتوں کے قصے سنایا کروں گا۔'' احسن جو کہہ رہا تھا سچ کہہ رہا تھا۔ شاہ زیب کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ موبائل کی بیپ بجی۔

جینز کی جیب سے موبائل نکال کر دیکھا تو صدف کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

''میں کوریڈور میں کھڑی ہوں۔'' صدف ہمیشہ ایسے ہی پیغامات بھیجتی کہ اشارہ ہوتا مکمل پیغام نہ ہوتا۔ موبائل جینز کی جیب میں رکھتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں آتا ہوں۔'' شاہ زیب نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تھے کہ احسن کی شوخ سی آواز سنائی دی۔

''متوقع بھابھی کو میرا سلام دینا۔''

شاہ زیب نے گھور کر احسن کو دیکھا۔

''باز آجا'' کہتا اندر ڈیپارٹمنٹ میں چلا گیا۔

سامنے کوریڈور میں آسمانی رنگ کے لباس میں ملبوس کھڑی صدف کس قدر حسین لگ رہی تھی۔ بار بار پیشانی رگڑتی۔ انداز اضطراری تھے۔ مگر حسن سوگوار سا تھا۔ اور آج اس نے خلاف معمول بالوں کو موباف میں لپیٹا ہوا تھا۔ سوٹ کے ہم رنگ موباف جو یقیناً سوٹ سے کپڑا بچا کر بنایا گیا تھا۔

''کیسی ہو؟'' شاہ زیب صدف کے قریب رک گیا۔ صدف نے جواب نہ دیا بس چپ چاپ شاہ زیب کو تکے گئی۔ صدف کی سنجیدگی شاہ زیب سے مخفی نہ رہی مگر پھر بھی اس نے ماحول کا بوجھل پن دور کرنا چاہا۔ کرنے کے لیے کچھ کہنا چاہا۔ اس سے قبل وہ کچھ کہتا صدف بول پڑی۔

''کل شعیب اور اس کے گھر والے ہمارے گھر آئے تھے۔ مٹھائی کا ٹوکرا لیے۔ چچی کہہ کر گئی ہیں کہ اگلی بار ہاں سن کر ہی جائیں گی۔ امی اور بھائی بھی ہامی بھرنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔'' شعیب صدف کا کزن یونیورسٹی فیلو ہی تھا اور دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں پڑھتا تھا۔

شاہ زیب کے مسکراتے لب لمحے میں سکڑ گئے۔ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ کہہ پایا۔ اور جب کافی دیر کچھ نہ بولا تو صدف ہی مخاطب ہوئی۔

''دیکھو شاہ زیب میں تمہارے گھریلو حالات سے واقف ہوں۔ تمہارے والدین ابھی تمہارے رشتے کے لیے راضی نہ ہوں۔ مگر تم معاملے کی گھمبیرتا کو سمجھو۔ اگر ابھی تم کچھ نہ کر سکے تو شاید ہم دونوں۔۔۔۔'' آواز میں نمی اتر آئی تھی۔ اور آنکھوں میں بھی اپنی سرشت کے مطابق آدھی بات سے مطلب سمجھانے والی صدف آنسو پونچھتی وہ رکی نہیں۔ کوریڈور پار کرتی دوسری طرف چلی گئی۔

اور شاہ زیب اسے آواز دے کر روک بھی نہ پایا۔

☆......☆......☆

صدف۔ پیاری صدف۔ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے سر کے نیچے ہاتھ رکھے شاہ زیب چھت کو گھورتا جاتا اور صدف کو سوچے جاتا۔

ان دونوں کی پہلی ملاقات۔ کیا عجب رنگ لیے ہوئے تھی۔ ایک مسکراہٹ شاہ زیب کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

یونیورسٹی کے ابتدائی دن تھے۔ فولنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ فریشر چہرے پر بدحواسی لیے۔ دل میں سینئرز سے بچنے کی دعائیں مانگتے کونے کھدرے میں چھپتے نظر آتے تھے۔ ڈیپارٹمنٹ کے داہنی طرف گھاس کے قطعے پر ایک سنگی بنچ پر

بیٹھا شاہ زیب پوری آستین والی شرٹ۔ بالوں کا پف اور چہرے پر مونچھیں سجائے (ان دنوں اس نے مونچھیں رکھی ہوئی تھیں) چہرے پر تھوڑی ہوائیاں تھیں۔ ابھی ابھی سینئرز کا ایک ٹولہ اس سے اپنا دل خوش کر کے گیا تھا۔ اور سینئرز کا دل خوش کرنے کے لیے شاہ زیب کو محض بندر کی طرح درخت پر لٹکنا پڑا تھا۔ مرغ کی طرح بانگ دینی پڑی تھی۔ اور ہاں کنواری دوشیزہ کی طرح کمر بھی مٹکانی پڑی تھی۔ اس سستے میں جان چھوٹ گئی تھی مگر شاہ زیب کو یہ سب ہی کافی مہنگا پڑا تھا۔

سنگی بنچ پر بیٹھا وہ اپنی غیر متوازن سانس ٹھیک کر رہا تھا۔ دور جاتے سینئرز کے ٹولے کی آوازیں مدھم پڑی تھیں۔ تبھی ایک لڑکی پاس سے گزری۔ گلابی آنچل لیے۔ کھلے بال اور چہرے پر وہی بدحواسی جو فریشر کی پہچان دور سے کراتی۔ مگر وہ لڑکی ساتھ سے گزر کر چلی نہ گئی۔ بلکہ بنچ پر بیٹھ گئی۔

''آہ'' بیٹھنے سے پہلے وہ کراہی تھی۔

شاہ زیب نے اچنبھے سے محترمہ کو دیکھا تھا۔ اگر وہ سینئر تھی پھر بھی یہ قابل ہضم بات نہ تھی کہ اکیلے لڑکے کی فولنگ کے لیے آئی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہو گیا۔ اور لڑکی کے چہرے پر اڑتی ہوئیں ہوائیاں اسے باور کرا گئیں کہ وہ اس وقت مشکل میں گرفتار ہے۔

''محترمہ کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟''

محترمہ نے نگاہ بھر کر شاہ زیب کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے محترمہ کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبریز تھے۔

''میرا جوتا ٹوٹ گیا۔ فون کی بیٹری بھی ڈیڈ ہو گئی۔ یہاں کوئی جاننے والا بھی نہیں۔'' محترمہ نے ایک پاؤں آگے کیا۔ انگوٹھے والی چپل کا انگوٹھا نکل چکا تھا۔ اور محترمہ کی پریشانی انتہا نہ تھی۔ آنکھوں سے آنسو روانی سے بہتے تھے۔ باوجود کوشش کے شاہ زیب اپنی مسکراہٹ نہ چھپا پایا۔

چند لمحوں کی تلاش بسیار کے بعد شاہ زیب ایک کیل کہیں سے ڈھونڈ لایا۔ اور ایک پتھر سے محترمہ کے جوتے پر گاڑ دیا۔ جوتا مرمت ہو گیا اور محترمہ کی آنکھوں سے جاری سیلاب تھما۔

''میری بہن افشاں کہتی ہے انگوٹھے والی چپل ایسی استعمال کریں جس کے بارے میں آپ کو سو فیصد یقین ہو کہ راستے میں اس کا انگوٹھا نکل کر دغا نہ دے گا۔'' افشاں کا نادر قول محترمہ کے گوش گزار کیا اور محترمہ تھینک یو کہتی چلی گئی۔ اور پیچھے بیٹھا شاہ زیب گلابی آنچل پر نظریں جمائے سوچتا ہی رہ گیا۔

''کیسی خوبصورت لڑکی ہے۔ اور جب گلابی آنچل نظروں سے اوجھل ہوا تو کف افسوس سے ہاتھ ملنے لگا۔

''نام تو پوچھ لیتا۔''

پہلی ملاقات تو بس پہلی ملاقات تھی اور شاید کبھی نہ بھولنے والی تھی۔ اب اپنے بستر پر بازوؤں کا تکیہ بنائے۔ لیٹے ہوئے شاہ زیب کے مسکرانے کی وجہ پہلی ملاقات کی یاداشتیں ہی تو تھیں۔

اور پھر وہ والی ملاقات جس میں دونوں کی ٹکر ہو گئی تھی۔ کیسی بولی وڈ اسٹائل کی فلمی ٹکر تھی۔ شاہ زیب جیسا لڑکا پانی پانی ہو گیا۔ یوں لڑکی سے ٹکرانا اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ روایات کہاں اجازت دیتی ہیں۔ حالانکہ اس کی غلطی بھی نہیں تھی مگر وہ شرمندہ شرمندہ کھڑا سوری کہہ رہا تھا۔

''اٹس او کے'' تاثرات اٹس او کے والے نہ تھے۔مگر صدف اٹس او کے کہہ کر چلی گئی۔تب تک شاہ زیب محترمہ کے نام سے واقف ہو چکا تھا۔

اور ویلکم پارٹی والے دن جب صدف ہاتھ میں آئسکریم کا کپ لیے اِدھر نظر دوڑاتی اور پھر اُدھر نظر دوڑاتی۔ذرا دھیان دینے پر شاہ زیب کو پتا چل گیا اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے کی وجہ چمچ کی عدم دستیابی ہے۔شاہ زیب کا دل لمحے بھر بلیوں اچھلا مگر اپنے آپ کو سرزنش کرتا اور یہ باور کراتا کہ وہ ایک کلاس فیلو ہے، ایک چمچ ڈھونڈتا اس کے سامنے آن حاضر ہوا۔ایسے جیسے الہ دین کا جن ہو۔

''مس یہ لیں'' تب تک صدف کہنا عجیب لگتا تھا۔

اور مس نے تھینک یو کہہ کر چمچ لے لیا اور پیٹھ موڑ کر آئسکریم کھانے لگی۔

اور وہ وقت جب شاہ زیب نے اسے فون کیا تھا۔فون نمبر بھی مشکلوں سے ملا تھا۔کتنے بندوں کے ترلے کرنے پڑے تھے۔تب تک شاہ زیب سوچتا تھا کہ زمانہ ایڈوانس ہے لڑکا اور لڑکی محض دوست بھی ہو سکتے ہیں۔اب کلاس فیلو بھی ایک دوسرے کو فون نہیں کر سکتے۔

اور اس فون کے نتیجے میں جب صدف نے اسے نوٹس لا کر دیے۔نوٹس لیتے وقت شاہ زیب نے صدف کو دھیان سے دیکھا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ صدف دنیا کی حسین ترین لڑکی ہے۔

اور جب دوسرا سمسٹر اختتام کو پہنچا تھا۔اور گھر بیٹھا شاہ زیب یونیورسٹی کو خوب یاد کرتا۔یونیورسٹی کو یا یونیورسٹی میں نظر آنے والی پری کو؟ اور وہ خواب جو اس نے ان دنوں دیکھا تھا۔

زمانہ قدیم تھا۔اور اس زمانہ قدیم میں شہزادی بنی لڑکی تمکنت سے بیٹھی تھی۔ملازمائیں جھالر والا پنکھا جھلتی تھیں۔تبھی زمانہ قدیم میں ایک شہزادہ ظاہر ہوا۔وہ شہزادہ شاہ زیب ہی تو تھا۔شہزادہ شان سے چلتا آیا اور ایک گھٹنا ٹکائے شہزادی کے سامنے بیٹھ گیا۔ہوا میں ایک ہاتھ یوں معلق تھا جیسے چاہتا ہو کہ شہزادی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دے۔

''مجھ سے شادی کرو گی؟''

اور جب آنکھ کھلی تو شہزادہ حیران ہی رہ گیا۔یہ کیسا خواب تھا اور کس چیز کی طرف اشارہ تھا۔

اور اگلے سمسٹر کے ابتدائی دنوں میں ایک دن یونہی اکیلے میں شاہ زیب نے صدف سے پوچھ لیا۔

''مجھ سے شادی کرو گی؟'' اب جو خواب دیکھا تھا اس کو تعبیر سے بھی تو ہمکنار کرنا تھا۔

صدف نے کوئی جواب نہ دیا۔نہ سامنے اور نہ فون پر۔۔۔ہاں البتہ پہلے سے زیادہ اپنے انداز میں ملنے لگی۔اور یہی اپنا اپنا انداز ہی صدف کی ہاں تھی۔

زندگی حسین تھی۔

زندگی دلربا تھی۔

زندگی انعام تھی۔

زندگی زندگی تھی۔

شاہ زیب ہاتھوں کا تکیہ سر کے نیچے رکھے مسکرائے جاتا اور پھر آج کی ملاقات ذہن میں بھری۔

''چچی کہہ کر گئی ہیں اگلی بار ہاں سن کر ہی جائیں گی۔امی ابو بھی ہامی کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' صدف کی آواز تخیل میں گونجی۔۔اور مسکراہٹ بند ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔

''دیکھو صاحبزادے پہلے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانا اور پھر ہی کہنا شادی کرنا چاہتا ہوں۔تمہیں پال لیا اب تمہارے بیوی بچوں کو تو نہ پالوں۔شادی کے اخراجات کے لیے کچھ پیسے دو گے تو ہی تو تمہاری شادی کروں گا۔'' باپ کی آواز تخیل میں ابھری۔ایسی باتیں امتیاز احمد کتنی بار کر چکے تھے۔

ہاتھوں کا تکیہ ہنوز سر کے نیچے تھا۔بس چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے تفکر کی پر چھائیاں تھیں۔زندگی کا حسن' دلربائی اور انعام پھیکے سے لگنے لگے۔

☆......☆......☆

اک کچہری سی لگی تھی۔ سیاہ گیٹ کے پار آنگن تھا۔آنگن کے دوسرے رخ ڈرائنگ روم'ڈائنگ روم'بیڈ رومز'لاؤنج اور لاؤنج میں کچن بالترتیب تھے۔کچہری ڈرائنگ روم میں لگی تھی۔امتیاز احمد چائے کے گھونٹ پیتے ماتھے پر دو گہرے بل تھے۔

''مت پھلنے پھولنے دینا مجھے۔پتا تو ہے۔سردیوں میں خریدے گئے بنگلے نے کتنا بڑا مالی نقصان پہنچایا اور اب صاحبزادے کو شادی کا شوق چڑھا ہے۔''

''شادی نہیں ابو بس رشتہ۔۔۔'' شاہ زیب نے قطع کلامی کی تھی۔ چہرے پہ یاسیت تھی۔ بالوں کا پف بکھرا سا تھا۔بکھرے بال چہرے کو چھپاتے تھے۔چائے کا کپ ڈائنگ ٹیبل کے گرد بیٹھے باقی تین افراد کے سامنے بھی دھرا تھا۔گوافشاں نے ایک گھونٹ بھرا تھا۔البتہ ماں بیٹے کے کپ ان چھوئے تھے۔

''ہونہہ۔بس دائیں کان کی جگہ بائیں کان کو پکڑنے کا کہتے ہو۔'' نخوت سے سر جھٹکتے ہوئے امتیاز احمد نے کہا تھا اور شاہ زیب ایک گھونٹ بھر کر رہ گیا تھا۔چائے کا نہیں صبر کا۔

''کیا کرتا ہے اس کا باپ؟''

''انتقال ہو چکا ہے۔''

''تو پھر گھر کیسے چلتا ہے؟ دیکھنا صاحبزادے ایسے گھر میں نہ لے جانا جو زکوٰۃ خیرات لے کر گزارا کرتے ہوں۔''

''باپ کی پنشن آتی ہے۔بھائی ایک سکول میں کمپیوٹر آپریٹر ہے۔اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔''

''گھر کہاں ہے؟''

''دہلی گیٹ سے اندر۔''

''قدیم گلیوں میں؟''

''جی ادھر ہی۔''

''پھر تو پکے ٹٹ پونجیے ہوں گے۔اندرون شہر کے لوگوں کے پاس پیسے آجائیں تو وہ کھلی جگہ پر نہ منتقل ہونے کا سوچیں۔''

شاہ زیب کی آنکھوں میں شکوہ اترا۔پر امتیاز احمد بیٹے کی آنکھوں میں اترتے شکوے کی پرچھائی تک بھی رسائی نہ پاسکے۔کیسی قسمت تھی ان کی۔

''اگر ہمارے معیار کے لوگ ہیں تو پھر ہی کہنا۔ورنہ میری طرف سے انکار ہے۔میں اپنے دوست کی کسی بیٹی کو دیکھوں گا۔''

''ابو ایک بار مل تو لیں۔میں اس لڑکی کو پسند کرتا ہوں۔''

قابلِ قبول بنانے کے لیے شاہ زیب نے محبت کی جگہ پسند کا لفظ استعمال کیا تھا۔

''بیٹے نوجوانی کی پسندیں اتنی اہم ہوتیں تو آج تمہاری ماں یہ نہ ہوتی۔'' ابرو سے تاجدار کی طرف اشارہ کیا۔تاجدار سر جھکائے مجرم سی بنی بیٹھی تھی۔

''ابو پلیز۔۔۔'' شاہ زیب کے لہجے میں

دنیا بھر کی منت شامل تھی۔ امتیاز احمد کچھ دیر خاموش رہے۔

''یوں تو تم جس طرح کے احوال بتاتے ہو۔ میری طرف سے ناں ہی سمجھو۔ بیوی پینڈو لایا تھا اب بہو کوئی ایری غیری غریب نہ لاؤں گا۔ لیکن تمہاری تسلی کے لیے ایک چکر لگاتے ہیں ادھر بھی۔'' چائے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ کچہری بھی ختم ہوئی اور امتیاز احمد فیصلہ سناتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

امتیاز احمد کے جانے کے بعد ڈائنگ ٹیبل پر خاموشی چھائی رہی۔ اور اس خاموشی کو افشاں کی آواز نے توڑا۔

''شاہ زیب تمہاری باتوں میں اُلجھ کر آج ابو نے چائے کو جو شاندہ نہیں کہا۔'' افشاں بے جوڑ بات کرتی چائے پیتی رہی۔

''خانساماں ہم نہیں رکھ سکتے کہ فضول اخراجات ہیں مجھے سمجھ نہیں آتی ابو کما کس لیے رہے ہیں۔ ہمیں تو کھلا کر وہ ہم پر احسان بلکہ ہماری ہونے والی نسلوں پر بھی احسان کر رہے ہیں۔ کیا صرف اپنے لیے کماتے ہیں؟'' کوئی انسان اتنا مطلبی کیسے ہوسکتا ہے۔ جسے اپنی بیوی اور اولاد سے بھی محبت نہ ہو۔''

''افشاں'' تاجدار کی آواز میں تنبیہ تھی اور اگر تاجدار افشاں کو نہ ٹوکتی تو وہ ابھی اور بھی بہت کچھ کہتی۔

''ہونہہ'' افشاں چائے کا کپ ختم کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ابو نہ مانیں تو بھاگ کر کوٹ میرج کر لینا۔'' کچن کی طرف جاتے ہوئے وہ اپنا نادر مشورہ دیتی گئی۔ تاجدار کی تیز نظروں کو بھی خاطر میں نہ لائی۔

''میرے بیٹے کی وہیں شادی ہوگی جہاں وہ چاہے گا۔ بس دلہن خوبصورت ہونی چاہیے۔ میرے بیٹے کے ساتھ کھڑی ہو کر جچے تو سہی۔''
تاجدار ایسی باتیں امتیاز احمد کے جانے کے بعد ہی کر سکتی تھی۔

تاجدار اور شاہ زیب ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ آگے بڑھ کر تاجدار نے بیٹے کے ماتھے پر بوسہ بھی دیا تھا۔

اور شاہ زیب ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا تھا۔

ان کے گھر کا ماحول ایسا تھا جیسے امتیاز احمد بادشاہ ہوں اور وہ سب رعایا۔

بادشاہ کے فیصلے کی منتظر رعایا۔

بادشاہ سے رحم کی امید رکھنے والی رعایا۔

کیا سب گھروں میں ایسا ہوتا ہے؟

مرد کماتا ہے اس لیے وہ گھر کا بادشاہ ہوتا ہے اور باقی سب ادنیٰ طبقے کی رعایا۔

نہیں سب گھروں میں ایسے نہیں ہوتا۔ صرف وہ مرد اپنے گھر میں ایسا ماحول رائج کرتے ہیں۔ جنہیں عشق کی حد تک محبت ہوتی ہے۔

گھر اور گھر والوں سے نہیں۔

بلکہ دولت سے۔

☆......☆......☆

یہ تب کی بات ہے جب امتیاز تازہ ہوا کرتے تھے۔ اور گردیزی صاحب کی جگہ لوہار کا بیٹا کہہ کر پکارے جاتے تھے۔

آج تو وہ دہلی گیٹ کے رہنے والوں کو ٹٹ پونجیے کہہ رہے تھے تب وہ خود اندرون بوہڑ گیٹ کے رہنے والے تھے۔ تنگ گلیاں اور وہ بھی بازار کا حصہ۔

باپ کی دکان گھر سے ملحق تھی۔ اور وہ ہمہ وقت لوہا کاٹنے میں مصروف رہتے۔ قمیض

اتارے پسینہ پسینہ ہوتے۔ لوہے کا بڑا سا ہتھوڑا اٹھائے یہ لوہے پر ضربیں لگاتے کبھی کبھار وہ باپ کو لوہا کاٹتے دیکھتے رہتے۔ ورنہ زیادہ وقت گلی میں کنچے اور گولیاں کھیلنے میں گزارتے۔ سکول میں جیسے تیسے آٹھویں تک پڑھا اور پھر خیر آباد کہہ دیا۔ باپ نے تو خوب سمجھایا کہ دکان پر ہاتھ بٹاؤ پر تازو نے کان نہ دھرے۔ تب ہی باپ کے ساتھ گلگت میں شادی پر جانے کا اتفاق ہوا والد صاحب کے بچپن کے دوست اور کزن تھے۔ بیٹے کی شادی کر رہے تھے۔ تو بچپن کے دوست کو بھی دعوت نامہ بھجا۔ والد صاحب بھی ہنسی خوشی بیوی بچوں سمیت شادی پر پہنچ گئے۔ وہاں تازو نے صاحبہ کو دیکھا اور دل و جان سے فریفتہ ہو گئے۔ صاحبہ اپنے نام کا عکس۔ شان تمکنت۔ ادائے بے نیازی۔ حسن معطر ایسے الفاظ صاحبہ کے شایان شان تھے۔ مگر۔۔۔۔۔۔

''لوہار کا بیٹا اب انیس گریڈ کے افسر کی بیٹی سے محبت کرے گا۔ بیٹا چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔'' والد صاحب تو رشتہ لے جانے سے انکاری ہو گئے۔ تازو بھی اپنی بات کا ایک تھا۔

خود ہی افسر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ چھٹی کا دن تھا۔ افسر صاحب گھر پر ہی موجود تھے۔ تازو کی بات دھیان سے سنی۔ آخر آنے والا لڑکا ان کے دوست کا دور کا رشتہ دار تھا۔ اور جب تازو میاں سب کہہ چکے تو افسر صاحب نے انٹر کام پر کسی کو کہا۔

''ڈرائیور کو اندر ڈرائنگ روم میں بھجو۔''

تازو کی عمر سے دو تین سال بڑا ڈرائیور ڈرائنگ روم میں جھجکتا ہوا آیا۔ افسر صاحب نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور تازو سے مخاطب ہوئے۔

''دیکھو امتیاز میاں۔ یہ ہمارا ڈرائیور ہے۔ تم خود دیکھ لو تمہاری حالت اس سے بھی خستہ ہے۔ کیا میں بیٹی تمہیں دے سکتا ہوں؟''

افسر صاحب ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہے تھے۔ اور تازو شرم کے سمندر میں ڈوب کر ایک بار پھر سطح پر ابھرا تھا۔

''سونار کی اور ایک لوہار کی کے محاورہ کا مطلب یہ نہیں کہ لوہار کو سنار پر فوقیت حاصل ہے۔ میری باتیں بری تو لگی ہوں گی۔ مگر آج کی سچائی تمہیں ساری زندگی روشنی دکھائے گی۔'' افسر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے یہ نشست برخاست ہونے کا اشارہ تھا۔

اور اس محبت (کیا یہ واقعی محبت تھی؟) کے انجام نے تازو کو سکھایا کہ دولت کی کتنی اہمیت ہے۔

دنیا کی سب سے اہم چیز دولت ہے۔ روپیہ پیسہ ہے۔ جس سے آپ سب کچھ خرید سکتے ہیں۔ محبت بھی۔

تب تازو نے امیر ہونے کا' بے تحاشا دولت اکٹھی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

قسمت مہربان تھی۔ پراپرٹی کے کام میں ہاتھ ڈالا اور محاورتاً نہیں حقیقتاً پیسوں میں کھیلنے لگے۔ مگر جب تک پیسہ ہاتھ میں آیا۔ ماں باپ ان کے سہرے کے پھول کھلا چکے تھے۔ اور وہ لوہارن تاجداران کی بیوی بن چکی تھی۔

کہاں وہ حسن معطر سی صاحبہ اور کہاں یہ شہر میں رہتے ہوئے بھی پینڈو تاجدار، اور بس پھر صاحبائیں ہمیشہ متوجہ کرتی رہیں۔

محبت کے انجام نے انہیں دولت مند بنانے کی لگن دی اور یہ لگن ایسی لگن بنی کہ وہ اس دنیا میں صرف دولت کے ہو کر رہ گئے۔ اور انہیں یاد بھی

نہ رہا وہ ہمیشہ سے امتیاز احمد گردیزی صاحب نہ پکارے جاتے تھے۔ کسی زمانے میں تازو بھی ہوا کرتے تھے۔

ہمیشہ سے گلگشت میں ان کی کوٹھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ کسی زمانے اندرون بوہڑ گیٹ کے سیلن زدہ گھر میں بھی رہتے تھے۔

دولت روپے پیسے سے محبت کچھ ایسی تھی ۔ بیوی بیٹی اور بیٹے کی بھی اس دولت کے سامنے کوئی حیثیت نہ تھی۔

اور یہ انسان ہے۔
جو محبت کرتا ہے تو
بھول جاتا ہے
کہ وہ انسان ہے

روپے پیسے سے محبت نے امتیاز احمد کو بھی بھلا دیا تھا۔

☆......☆......☆

جولائی کی رخصتی کا وقت تھا۔ جانے موسم کی شدت میں کمی آ گئی تھی یا گرمی کے مسلسل مہینے گزارنے کے بعد لوگ عادی ہو گئے تھے۔ اور اب گرمی کا احساس کم لگتا تھا۔ ساون نے بھی تو بارشوں کے ساتھ ٹھنڈی ہواؤں کا تحفہ دیا تھا۔ اس وقت بھی اپنی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں کے سنگ شاہ زیب اور صدف ڈیپارٹمنٹ کے دوسرے رخ والے باغیچے میں سنگی بنچ پر بیٹھے تھے۔

وہ یاسیت اور اضطراب جو پچھلے دنوں دونوں کے چہرے مہرے سے واضح تھا قدرے کم تھا۔

''چچی کا کل فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں چودہ اگست والے دن آئیں گی۔ اور ہاں سنے بغیر نہ جائیں گی۔'' صدف کی نگاہیں گود میں دھرے اپنے ہاتھوں پر تھیں۔

ان شاءاللہ پرسوں تمہارے گھر آئیں گے۔ تم پریشان نہ ہو۔'' شاہ زیب نے یقین دلایا تھا۔

''تم نے پھر سے وہ آسمانی سوٹ نہیں پہنا جس کا ہم رنگ بینڈ تم بالوں میں لپیٹ کر آتی تھی۔''

جواباً صدف مسکرادی۔

''پرسوں پہنوں گی۔ وہ میرا بہترین سوٹ جو ہے۔''

''اوہ ہو تو سسرالیوں کو متاثر کرنے کی پوری تیاریاں ہیں۔''

شاہ زیب کی بات نے صدف کے چہرے پر گلابوں کا رنگ مل دیا۔ اس گلابی پن کو چھپاتی صدف اپنے ہینڈ بیگ سے کچھ نکالنے لگی ہاتھ باہر آیا تو ٹشو میں لپٹی کچھ چیزیں تھیں۔

''کیا ہے۔'' شاہ زیب نے کھول کر دیکھا تو سوہن حلوہ کی ٹکیہ تھی۔

''کل آرڈر آیا تھا۔ عموماً گرمیوں میں آرڈر نہیں آتے۔ مگر بڑا آرڈر تھا امی نے واپس نہ لوٹایا ۔تمہارے لیے تھوڑا سا لائی ہوں۔''

''بے شک صدف تمہاری امی لاجواب سوہن حلوہ بناتی ہیں۔'' شاہ زیب مزے لے کر کھانے لگا۔ کھاتے کھاتے ایک خیال نے اسے چونکایا۔

''ابو کیا سوچیں گے کہ ایک عرصہ صدف لوگوں کا ذریعہ معاش سوہن حلوہ بیچنا تھا۔ کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے۔۔۔۔'' اپنی سوچ سے کچھ ایسا خائف ہوا کہ جھرجھری سی آ گئی۔ اسی وجہ سے اس نے باپ سے صرف بھائی کے کمپیوٹر آپریٹر اور باپ کی پنشن کا ذکر کیا تھا۔ سوہن حلوے کا ذکر گول کر گیا تھا۔

''یا اللہ مہربانی فرما۔'' اس کے پاس خدا سے مدد کی التجا ہی سب سے بڑا ہتھیار تھی۔

☆......☆......☆

سرکاری دفتر کے نائب قاصد کی تنخواہ کتنی ہوتی ہے۔ کجا کہ اس بیوہ کو شوہر کے انتقال کے بعد ملنے والی پنشن میں ملنے والی رقم۔ پنشن کی قلیل رقم سے ہرگز گزارا نہیں ہوتا تھا۔ بیٹا اور بیٹی دونوں زیر تعلیم تھے۔ یوں بھی رابعہ بچوں کو پڑھانا چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے ہمت سے کام لیا۔ خاندان والے ان کے ہاتھ کے بنائے سوہن حلوے کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ایک دیگچی بھر دودھ سے سوہن حلوہ تیار کر کے ٹکیہ بناتیں۔ تنویر کی مدد سے ایک پرانا شیشے والا شوکیس وہ پہلے ہی بیٹھک میں رکھ چکی تھیں۔

سوہن حلوے کی ٹکیہ تھال میں سجا کر شوکیس کے طاق میں سجا دیں اور اپنی مدد آپ کے تحت ایک چارٹ پر خوشخط انداز میں لکھ کر ''یہاں سوہن حلوہ دستیاب ہے۔ قیمت فی ٹکیہ پانچ روپے۔'' بیٹھک کی بیرونی دیوار پر چپکا دیا۔ بیٹی اور بیٹا اس وقت ہائی سکول کے طالب علم تھے۔ ماں سے انہوں نے کوئی اعتراض کیا بھی تو رابعہ خاطر میں نہ لائیں کہ بچے کہاں زندگی کے نشیب وفراز سمجھتے ہیں۔

سوہن حلوہ کی ٹکیاں پہلے دن ہی ساری بک گئیں۔ اور رابعہ خاتون کے بنائے سوہن حلوے کی دھوم اندرون دہلی گیٹ کی گلیوں میں گونجنے لگی۔ کئی سال سوہن حلوے کی کمائی سے انہوں نے فائدہ حاصل کیا یہاں تک کہ صدف اب یونیورسٹی کے آخری سال میں تھی اور تنویر ایک سکول میں کمپیوٹر آپریٹر کے فرائض انجام دینے لگا تھا۔ اور اب وہ ماں سے کہتا رہتا تھا کہ بس کریں اب آرام کریں۔ میری تنخواہ تین آدمیوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ناکافی نہیں۔

اور تنویر کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ اس کے پاس کمپیوٹر کے ایک اچھا کورس کا سرٹیفکیٹ تھا اور وہ ضلع بھر میں پھیلے ہوئے سکول سسٹم کی ایک برانچ میں ایک پرکشش معاوضے پر پانچ سالہ کنٹریکٹ پر جاب کر رہا تھا۔ ماں بھی مطمئن تھیں۔ اسی لیے پہلے کی طرح باقاعدہ ٹکیاں بنا کر بیچنے کی بجائے اگر کہیں سے بڑا آرڈر آجاتا تو قبول کر لیتیں۔ کبھی کبھار پرانے شیڈول کی طرح ٹکیاں بنا کر اسی پرانے شیڈول میں سجا دیتیں۔ ایک گھنٹے کے اندر شوکیس خالی ہو جاتا۔ وہ ٹکیہ جو دس سال پہلے پانچ روپے کی تھی اب پچیس روپے کی بکتی تھی۔

شاہ زیب کو جب پہلی بار صدف نے سوہن حلوہ کھلایا تو بے ساختہ وہ انگلیاں چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ بلاشبہ وہ بے مثال ذائقے کا سوہن حلوہ تھا۔ اگر وہ دہلی گیٹ کی اندرون گلیوں میں مشہور تھا تو کم ہی تھا۔ اسے ملک گیر شہرت حاصل ہونی چاہیے تھی۔

☆......☆......☆

جب امتیاز احمد پوری فیملی سمیت صدف کے گھر پہنچے تو گاڑی پارک کرنے کے لیے کوئی موزوں جگہ نہ ملی۔ مجبوراً شاہ زیب کو گاڑی کی چابی پکڑا کر دور پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنے کا کہہ آئے۔ جب شاہ زیب گاڑی پارک کر کے آیا تو اہل خانہ اسی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ شوکیس میں سوہن حلوے کی ٹکیاں سجی پڑی تھیں اور ایک خریدار بچہ سوہن حلوے کی ٹکیہ لینے آیا تھا۔

اور امتیاز احمد کے چہرے کے تاثرات کچھ ایسے تھے کہ الفاظ میں اظہار ممکن نہیں۔

''یہ آپ کیا کام کرتی ہیں؟'' امتیاز احمد کے لہجے کی نخوت عیاں تھی۔

''بس شکور احمد کی اچانک وفات کے بعد اللہ نے وسیلہ بنایا۔ وہ سرکاری دفتر میں نائب قاصد تھے۔ پنشن کی رقم قلیل تھی یہ تو اللہ نے برکت ڈالی کہ اس کاروبار سے گھر کی دال روٹی چلتی اور پنشن کی رقم سے میں بچوں کی فیسیں بھرتی۔''

امتیاز احمد نے کچھ اور سوال جو شاید اتنے سخت نہ ہوتے مگر امتیاز احمد کا لہجہ انہیں سخت بنا گیا۔ رابعہ نے تحمل سے تمام باتیں سنیں۔ تاجدار جو گھر میں خاوند کی منتیں کر آئی تھیں کہ رائے کا اظہار گھر آ کر ہی کیجیے گا۔ بس خاوند کی لن ترانیاں سنتی رہیں اور پریشان ہوتی رہیں۔

''میری صدف کے لیے اس کے چچا کے بیٹے کا رشتہ آیا ہوا۔ لڑکا اسی کی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ پڑھائی مکمل ہوتے ہی ان شاءاللہ میرے تنویر کی طرح برسر روزگار ہو ہی جائے گا یہ تو صدف کی پسند کی بات تھے اسی لیے میں نے ہامی نہ بھری۔'' رابعہ نے انہیں حقیقت عیاں کر دی کہ وہ ایسی گئی گزری اور بیٹی کے رشتے کے لیے پریشان نہیں۔

''تو خاتون ایسا ہے کہ میرے خیال میں آپ اپنی بیٹی کے لیے اپنے دیور کے بیٹے کو ہی سوچیں۔'' چائے لاتی صدف دروازے پر تھم گئی۔ تاجدار حیران نظروں سے شوہر کو دیکھنے لگیں۔ شاہ زیب کے جسم سے تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ اور رابعہ جو چہرے پر جبری مسکراہٹ سجائے بیٹھی تھیں اب انہیں اس کی ضرورت نہ رہی تھی۔

''ہم چلتے ہیں۔'' امتیاز احمد اٹھ کھڑے ہو گئے۔

اور افشاں جو بھائی کے منہ سے اس سوہن حلوے کے بے مثال ذائقے کے متعلق سن چکی تھی۔ شوکیس میں سجی ٹکیہ پر نظر جمائے سوچ رہی تھی۔

''رشتہ ہو جاتا تو شاید یہ لوگ سوہن حلوے سے ہی منہ میٹھا کرواتے۔''

☆......☆......☆

''دروازے پر لٹکا پردہ' میز پر بچھا میز پوش اور خاتون نے جو دوپٹا اوڑھا ہوا تھا۔ تینوں ایک ہی کپڑا تھا۔ ایسے جیسے ایک ہی تھان خرید کر گھر بھر کی جملہ ضروریات پوری کر دی گئی ہوں۔'' امتیاز احمد اپنی بات پر قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

سب گھر والے ان کا چہرہ دیکھتے رہے۔

''بیٹھک کو ان لوگوں نے دکان بنا لیا اور ہمیں دکان میں ہی بٹھایا۔ اندرون شہر لوگوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔'' امتیاز احمد کا تمسخر ختم نہ ہو رہا تھا۔

''ابو میں اس لڑکی سے ہی شادی کروں گا۔'' شاہ زیب کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''حلوائن کی بیٹی سے شادی۔ میری بہو حلوائن کی بیٹی۔ سارا گلگشت میرا واقف ہے۔ ہنسیں گے مجھ پر سب۔ تمہیں پوری یونیورسٹی میں ایک حلوائی کی بیٹی ہی ملی تھی۔ محبت ہمیشہ سٹینڈرڈ دیکھ کر ہی کی جاتی ہے صاحبزادے۔ اگلی بار محبت نہ ہی کرنا اور اگر پھر بھی خون جوش مارے تو دیکھ لینا کہ لڑکی حلوائی خاندان سے نہ ہو۔'' بات کے اختتام پر امتیاز احمد ایک بار پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

''ابو آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' ضبط کے مارے شاہ زیب کی آنکھیں بھرنے لگیں۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' اب کی بار امتیاز احمد کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''یوں مت کریں ابو۔'' شاہ زیب کا لہجہ بھیگتا ہی جا رہا تھا۔

''دیکھو شاہ زیب تمہیں کھلا پلا اور پڑھا کر

اس لیے نہیں بڑا کیا کہ جب تم میرے قد تک آؤ تو حلوائن کی بیٹی کو بہو بنا لاؤ۔ میرے احسانات مانو اور چپ کر کے بیٹھو۔ پہلے ہی تمہاری بلاوجہ کی ضد کی وجہ سے آج کا دن ضائع ہو گیا۔'' امتیاز احمد کا لہجہ اب سخت ہو چکا تھا۔

''احسانات'' یہ لفظ امتیاز احمد نے پہلی بار استعمال نہیں کیا تھا۔ مگر شاہ زیب کو پہلے کبھی اتنا نہ چبھا تھا۔

''ہاں احسانات۔ یہ جو تم چھ فٹے گھوم رہے ہو اور صبح بن ٹھن کر یونیورسٹی جاتے ہو صرف میری وجہ سے۔ اس دولت کی مرہون منت یہ زندگی تمہیں ملی ہوئی ہے۔''

سرخ انگارہ آنکھیں لیے شاہ زیب باپ کو احسانات گنواتے دیکھتا رہا۔

اور جب بولا تو جیسے چیخا تھا۔

''ساری زندگی آپ احسان احسان کرتے رہے ہیں۔ کیا سارے باپ بچوں کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ اپنے گھر میں پالتے ہیں تو احسان جتاتے رہتے ہیں۔ مجھ سے بہتر تو آپ کے مرحوم بھائی کا بیٹا علی ہے۔ وہ بھی چھ فٹ کا ہے۔ وہ بھی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ اور مجھ سے بہتر اور پر سکون زندگی گزار رہا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی میں احسان گنوانے والا باپ نہیں ہے۔'' شاہ زیب رو رہا تھا۔

امتیاز احمد نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے شاہ زیب کو دیکھا تھا۔ چند لمحوں بعد ان کے ساکت وجود میں حرکت آئی۔ آگے بڑھ کر ایک زناٹے دار تھپڑ انہوں نے شاہ زیب کے دائیں گال پر رکھا۔ تھپڑ ایسا شدید تھا کہ ہونٹ کا کونہ پھٹ گیا۔ اور خون بہنے لگا۔

''نکل جاؤ میرے گھر سے احسان فراموش۔ ایسا بیٹا ہونے سے بہتر ہے میرا کوئی بیٹا نہ ہوتا۔''

شاہ زیب بے یقینی سے باپ کو دیکھے گیا اور اگلے ہی لمحے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اور ایسے باپ ہونے سے بہتر تھا میں یتیم ہی ہوتا۔''

''اگلے ایک منٹ میں تم ادھر نظر آئے تو میں تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکالوں گا۔'' امتیاز احمد کی آواز غصے کی شدت سے کانپتی تھی۔

''جانے دیں۔ نوجوان بیٹا ہے۔'' آنکھوں سے پانی بہاتی تاجدار آگے بڑھی اور شوہر کی منتیں کرنے لگی۔

''تم چپ رہو گنوار عورت۔ یہ تمہاری ہی تربیت ہی ہے جو آج وہ یہ بکواس کر رہا ہے۔''

''جا رہا ہوں میں۔ نہیں رہنا مجھے ادھر۔ موت سے بدتر زندگی۔ آپ کے احسانات کے بوجھ تلے دبی۔'' شاہ زیب رکا نہیں اگلے لمحے وہ گھر کا سیاہ گیٹ پار کر کے چلا گیا۔

تاجدار پھٹی پھٹی آنکھوں سے اکلوتے بیٹے کو گھر سے بے سروسامان جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ اور افشاں جو گھر کے ہر جھگڑے میں خود کو الگ تھلگ رکھتی تھی۔ آج اس کی آنکھیں بھی آنسو بہائے جا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

کسی زمانے میں شہر کھلا کھلا اور کشادہ کشادہ سا لگتا تھا مگر پچھلی حکومت میں چونکہ وزیراعظم اسی شہر کا تھا، اس نے شہر کے ترقیاتی کاموں پر خصوصی توجہ دی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ترقیاتی کام سڑکوں کا روٹ بدلنے، فلائی اوورز پر فلائی اوورز تعمیر کرنے تک محدود تھے۔ اسی لیے سڑکیں اب پہلے سی کشادہ نہ لگتیں اور شہر کچھ کچھ فلائی اوورز کے جال میں جکڑا نظر آتا۔ اور شاہ زیب ان سڑکوں

اور فلائی اوورز کے نیچے بنے پتھاروں پر رک رک کر چلتا رہا اور چل چل کر رکتا رہا۔ جب ٹانگیں شل ہو گئیں تو ایک پبلک پارک میں چلا آیا۔

رات شاہ زیب نے اسی پبلک پارک کے بنچ پر لیٹ کر گزاری تھی۔ پارک کی حفاظت پر مامور نگران نے اسے دو تین بار کہا کہ دس بجے پارک بند ہو جاتا ہے، اس لیے آپ کو جانا ہوگا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ نگران بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اور شاہ زیب بنچ پر آڑھا ترچھا لیٹا جاگتا ہی رہا۔ وہ اس قدر کڑیل تھا کہ بنچ پر آدھا بھی نہ سماتا تھا اور اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ یہ سب اس کے والد کے طفیل تھا۔ خدا نے امتیاز احمد کو ہی اس تک رزق پہنچانے کا زریعہ بنایا تھا مگر امتیاز احمد کی باتیں۔۔۔

''احسان، احسان، احسان۔۔۔''

آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو گرنے لگے۔

''حلوائن کی بیٹی''

''ایک ہی تھان خرید کر گھر کی جملہ ضروریات پوری کی گئی ہیں۔''

''ابو ایک بار اپنے بیٹے کا دل ٹٹولتے، وہ اس حلوائن کی بیٹی کے لیے دھڑکتا ہے اور اس حلوائن کی بیٹی کے نہ ملنے کے خیال سے ہی رکنے لگتا ہے۔'' اب وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

یونہی روتے چپ کرتے صبح ہو گئی۔ صبح کی اذان کے وقت پارک کے نگران نے اسے نماز کے لیے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ عام دنوں میں نماز کا پابند شاہ زیب آج اللہ سے ناراض تھا اور نماز نہ پڑھ کر اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

سورج چڑھ آیا۔ پارک میں دھوپ پھیلتی گئی۔ اور وہ بنچ بھی دھوپ کے قبضے میں آ گیا جس پر وہ کل شام سے لیٹا تھا۔ مجبوراً اٹھنا پڑا۔

پیٹ میں بھوک کا درد اٹھ رہا تھا، جیب میں پیسے بھی تھے مگر شاہ زیب ڈھیٹ بنا درد برداشت کرتا رہا، جاگنگ کے لیے بنائی پتھریلی روش کے کنارے بیٹھ کر گھاس نوچتا رہا۔

موسم آج پھر سخت تھا۔ حبس نے چاروں اور پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ پسینے کی دھاریں خشک نہ ہوتی تھی۔ اور یہ ساڑھے دس بجے کا وقت تھا جب جیب میں موجود موبائل بجنے لگا۔ صدف کی کال نہ ہو، اس نے موبائل نکال کر دیکھا۔ موبائل سکرین پر افشاں کا نام جگمگا رہا تھا۔ گھر کے کسی بندے سے فی الحال بات کرنے کا دل نہ تھا۔ چنانچہ اس نے موبائل سائلنٹ پہ لگا کر جیب میں ڈال دیا۔ پندرہ منٹ بعد دوبارہ نکال کر دیکھا تب بھی افشاں کی کال آ رہی تھی۔ کال ڈس کنیکٹ کر کے وہ موبائل پاور آف کرنے ہی والا تھا کہ ایک بار پھر افشاں کی کال آنے لگی۔ نا چاہتے ہوئے بھی اس نے کال ریسیو کی۔

دوسری طرف افشاں بے تحاشا روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''شاہ زیب میرے بھائی کہاں ہو، گھر آ جاؤ۔ ابو کا کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا ہے۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ گھر آؤ میرے بھائی۔۔۔''

افشاں روتے ہوئے مزید کچھ کہہ رہی تھی۔ شاہ زیب کو اپنے کانوں سنے پر یقین نہ آیا۔ موبائل اس کے ہاتھ سے پھسل کر گھاس پر جا گرا۔ اور وہ وحشت بھری نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔

اک فسانہ ہے زندگی لیکن
کتنے عنوان ہیں فسانے کے
چاک داماں کی خیر ہو یارب

ہاتھ گستاخ ہیں زمانے کے

☆......☆☆

چار دیواری کے اندر داخل ہونے کے لیے لکڑی کا پھاٹک تھا۔ پھاٹک سے اندر قبریں ہی قبریں تھیں۔ تاحدِ نظر قبریں ۔ ایک طرف ستونوں کے سہارے چھت تعمیر کی گئی تھی۔ اس چھت کے ایک کونے میں وضو کے لیے نل لگے تھے۔ اور زمین پر سرخ رنگ سے صفوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔

یہ قبرستان کی جنازہ گاہ تھی۔ جنازہ گاہ سے مشرق کی طرف چالیس قدم کے فاصلے پر ایک قبر کے ساتھ دوزانو شاہ زیب بیٹھا تھا۔ سفید ململ کا کرتا۔ سر پر ٹوپی۔ جب سے اگست شروع ہوا تھا گرمی ویسی نہ رہی تھی۔

''ابو آپ گھر کے سربراہ تھے۔ کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ نجانے وہ کون سا کمزور لمحہ تھا کہ میں غصے کی زد میں آگیا اور آپ سے بدتمیزی کر بیٹھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ آپ سے آخری بار کلام کر رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دیں ابو۔ آپ کا بیٹا اچھا بیٹا بن کر نہ دکھا سکا۔''

شاہ زیب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور سورۃ الفاتحہ پڑھ کر باپ کے لیے دعا مانگی۔ کتنی دیر دعا مانگتا رہا۔ دعا کے اختتام کے بعد بھی وہ یونہی باپ کی قبر کے سرہانے بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا یہ دھیان کرتا کہ کسی قبر پر پاؤں نہ پڑے قبرستان سے باہر آیا۔ باہر گاڑی کھڑی تھی۔ وہی گاڑی جس میں امتیاز احمد کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور وہ فانی دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ گاڑی تو مرمت شدہ ہوگئی۔ مگر گاڑی کے مالک جان سے گئے اور اب مالک کا بیٹا مالک تھا۔ اور جنہیں کھلا پلا کر امتیاز احمد سمجھتے تھے کہ احسان کر رہے ہیں۔ وہ ان کے چھوڑے کل ترکے کا وارث تھے۔

گاڑی کچے راستے سے پکی سڑک کی طرف رواں دواں تھی۔ اور شاہ زیب فون پر نمبر ڈائل کرنے کے بعد بات کر رہا تھا۔

''صدف میری پشیمانی کم ہی نہیں ہوتی ۔ یہ میں نے ابو سے کیا کہہ دیا۔ شاید اللہ کو میرے الفاظ پسند نہ آئے اسی لیے۔'' آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

''شاہ زیب اللہ غفور ہے تم اپنے سخت الفاظ پر شرمندہ نہ ہو۔ اور توبہ کے طلب گار رہو۔ اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

صدف نے خاطر خواہ تسلی دی۔ صدف سے بات کر کے دل کا بوجھ کچھ نہ کچھ کم ضرور ہوا۔ اور صدف ہی تو تھی جس نے شاہ زیب کو سنبھلنے کے لیے سہارا دیا۔ باپ کے جانے کے بعد وہ جس شکست وریخت کے عمل سے گزر رہا تھا تو صدف نے ہی اسے مکمل طور پر بکھرنے سے بچایا۔

فون بند کر کے آنکھوں میں آئی نمی صاف کر کے وہ ڈرائیونگ پر دھیان دینے لگا۔ گاڑی مین سڑک پر آچکی تھی ۔ گاڑیوں' موٹر سائیکلوں اور بسوں کے ہجوم میں اپنا راستہ بناتی نظروں سے اوجھل ہوتی گئی۔

بے شک زندگی کی حقیقت ایک فسانے سے زیادہ ہرگز نہیں۔ جب تک رواں ہے انسان اپنے زعم میں مبتلا کیا کچھ نہیں کہتا' کیا کچھ نہیں کرتا۔ مگر جب زندگی کا کارواں رکتا ہے اور سفر تمام ہوتا ہے تو معاشرے میں انسان کو قبرستان میں ایک قبر سے زیادہ جگہ نہیں ملتی۔ جن پر اس کے پیارے کبھی کبھار فاتحہ پڑھنے آجاتے ہیں۔

☆☆......☆☆

افسانہ

''میں جانتی ہوں چھایا...... یہ سرکاری اسپتال ہے یہاں بھی غریب کی غربت کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہاں ہماری مصیبتوں اور مجبوریوں کو دور کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر تو پریشان مت ہو۔ مجھے پتا ہے۔ تُو اپنی ماں کو اتنی آسانی سے موت کے......

آج گرمی انتہا کی تھی۔ چاروں طرف جیسے دوزخ کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ جس کے اندر بھڑکتے ہوئے شعلوں کی جھلسا کر راکھ کر دینے والی تپش سے اُس کا پورا وجود جل رہا تھا اور جلاتی جھلساتی آگ کی تپش سے وہ سر سے پاؤں تک پگھل کر گرم سیال بن رہی تھی۔ اوپر سر پر جلتا ہوا آگ کا گولا جیسے اُس کے سارے جسم میں نوکیلی جلتی سوئیاں چبھا رہا تھا۔ حلق میں پیاس کی شدت سے دم جیسے اٹک رہا تھا۔ سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھی۔ گرمی نے سڑک پر روزِ حشر جیسا سماں باندھ رکھا تھا۔ جیسے ضد باندھ لی تھی کہ قیامت آج ہی فلک سے دھرتی پر اُتر آئے گی۔

وہ چمڑے کا سیاہ سستا سا گھسا ہوا بیگ بغل میں دبائے دو پٹی والی گھسی ہوئی چپل میں سیاہ تارکول کی سڑک پر چلتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے موت کے راستے پر زندگی کی بقاء کے لیے دوڑ رہی ہو۔ اور موسم کی تلخی بھی اُس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکی تھی۔ سیاہ بیگ پر اُس کے ہاتھ کی گرفت مضبوطی سے جمی تھی۔ جس کے اندر سرسوتی کے آپریشن کی رقم نہیں بلکہ سرسوتی کی قیمتی جان چھپی ہو۔ جس کی حفاظت وہ راستے بھر کرتی آئی تھی۔ اور اب اُس کا رخ شہر کے مضافاتی علاقے کے سرکاری اسپتال کی جانب تھا۔ جہاں ایک تڑپتی، سسکتی زندگی غربت و مصائب کے خونی پنجوں میں جکڑی جان اپنی ڈوبتی سانسوں سے قضائے اجل کو شکست دینے کی تگ و دو میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

سرسوتی کو زندگی سے پیار نہیں تھا۔ مگر وہ بے رحم موت کے ہاتھوں ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے ابھی اور جینا تھا۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اُن تین زندگیوں کے لیے جن کا وہ آخری سہارا تھی۔ گوپال کے مرنے کے بعد اب وہ ہی اپنے تینوں بچوں کے لیے ٹھنڈی چھایا تھی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ زندگی، موت سے زیادہ بے رحم ہوتی ہے جب تک رگوں میں لہو کے ساتھ دوڑتی سانسیں لیتی ہے۔ تب تک انسان کو جانکاہی کے آخری

لمحے تک آزمائشوں کی سولی پر لٹکائے رکھتی ہے۔

سرسوتی بھی اسی سولی پر لٹکی تھی۔ جس کے دونوں جانب صرف اذیت تھی، کرب تھا اور زندگی کی بے رحمی! وہ صحیح اندازہ نہیں کرپاتی تھی کہ زندگی اُن کے لیے زیادہ کٹھور تھی یا پھر بے رحم حالات......! اور اس کڑی آزمائش میں اُس کے وجود کا حصہ اُس کی سترہ سالہ بیٹی چھایا، سرسوتی اور اُس کے ساتھ جڑی دو مزید زندگیوں کے لیے ڈھال بن گئی۔

چھایا نے بہت کم عمری میں گھر اور گھر میں پلتے تینوں نفوس کی ذمے داری اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھالی تھی۔ اور ساتھ ہی یہ عزم بھی کرلیا تھا کہ یہ بوجھ اُسے اپنی آخری سانسوں تک اٹھائے رکھنا ہے یا جب تک شنکر کم از کم جوان ہو کر اُس کے حصے کا بوجھ نہ بانٹ لیتا۔ سو وہ اُن سب کی کفیل بن گئی۔

آج سرسوتی ماں کا آپریشن تھا۔ وہ جگر کے عارضے میں مبتلا تھی۔ اُس کے جگر میں پس پڑ چکے تھے۔ علاج چل رہا تھا مگر اب آپریشن ناگزیر ہو چکا تھا۔ لہٰذا سرسوتی کو ایڈمٹ کرلیا گیا تھا۔ اس لیے چھایا کو صبح جلدی اسپتال پہنچنا تھا۔ ڈاکٹر نے سرسوتی کے آپریشن کی تاریخ دیدی تھی اور وہ آج کا دن کسی طور بھی ضائع ہونے دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے گھر سے قریب اسٹاپ پر اسپتال جانے کے لیے بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ کیونکہ رکشہ کر کے جلدی اسپتال پہنچنے کی اُس کی جیب اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اُس نے آپریشن کی فیس کی رقم ہی بڑی مشکل سے اکٹھا کی تھی۔ پھر آپریشن کے بعد دواؤں اور پرہیز کے لیے سرسوتی کی غذا کے لیے بھی رقم درکار تھی۔ لہٰذا چھایا کسی پکی گرہستن کی طرح ایک ایک پیسہ دانت سے پکڑ کے خرچ کر رہی تھی۔

آج اُس نے اپنے کام سے پورے دن کی چھٹی لی تھی۔ اور اب بس آنے کا بے چینی سے

انتظار کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اُس کے روٹ کی مطلوبہ بس آتی دور سے دکھائی دی تھی۔ چھایا جلدی سے بس اسٹینڈ سے باہر سڑک کے کنارے آ کر کھڑی ہوگئی تا کہ ہاتھ کے اشارے سے بس کو روک سکے۔ مگر سڑک پر آتے ہی آگ کے گولے کی نوکیلی جلتی سوئیاں اُس کے سارے جسم میں چبھنے لگیں۔ بس لحہ لحہ اُس سے قریب آتی جا رہی تھی مگر بس کے کنڈیکٹر اور ڈرائیور نے اُس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کی پروا کیے بغیر زن سے بس آگے بڑھا دی تھی۔ جو پہلے ہی مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ بس کی چھت پر بھی مسافر بیٹھے تھے۔ سرکاری اور پرائیویٹ ہر بس کا یہی حال تھا۔ اوپر سے اس آگ برساتی گرمی کے موسم میں بھی انسانی سروں سے بھری پرائیویٹ و سرکاری بسیں جن میں گنجائش سے زیادہ سفر کرتے نفوس بس کے پائیدان تک مکھیوں کی طرح چپکے ہوتے اور اس خطرناک صورتحال میں، میں کسی بھی وقت کوئی بھی حادثہ ہوسکتا تھا۔ لہٰذا اسپتال کے روٹ کی بس کے کنڈیکٹر نے بھی عقل کے ناخن لیتے ہوئے مزید کسی سواری کو بس اسٹاپ پر رُک کر چڑھانے سے گریز کیا تھا۔ لہٰذا چھایا کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو بس کے پائیدان سے لٹکتے ہوئے کنڈیکٹر نے بے پروائی سے ایسے نظر انداز کیا جیسے کوئی مفلسی کے مارے پھیلے ہاتھ کو نخوت سے جھڑکتا ہے اور بس چھایا کی بے بسی کا مذاق اڑاتے ہوئے اُس کے چہرے پر اپنا گاڑھا سیاہ دھواں چھوڑتی دوڑتی بھاگتی زن سے نکل گئی۔ اور چھایا صرف اذیت سے ہی بس کو جاتے ہوئے دیکھتے کھڑی رہ گئی۔

اُسے بروقت اسپتال پہنچنا تھا۔ لہٰذا وہ مایوس ہو کر پیدل ہی اپنی منزل کی جانب تیز قدموں سے بڑھنے لگی۔

اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اگرچہ سرکاری اسپتال اُس کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ بس یہی کوئی تین چار اسٹاپ کا ہی فاصلہ تھا۔ وہ کوٹھی میں کام کرنے روز پیدل ہی جایا کرتی تھی مگر کوٹھی اُس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اُسے عادت بھی تھی پیدل چلنے کی لیکن آج غضب کی پڑتی گرمی میں گھر سے اسپتال تک کا راستہ اُسے کسی پل صراط سے بھی زیادہ طویل اور کٹھن لگ رہا تھا۔ جلتی سڑک کے کنارے چلتے چلتے کئی بار رُک کر بیگ کی سائیڈ پاکٹ میں رکھی پانی کی بوتل سے پانی پیا تھا۔ جو اب گھر سے اسپتال تک کے آدھے راستے میں ہی خالی ہو چکی تھی۔

پیاس شدت سے اُس کا برا حال تھا۔ اوپر سے گرمی اور جلتی دھوپ کی شدت سے پگھلتے جسم سے پسینہ اُس کی گدی سے بہتا پاؤں کی ایڑی تک بہہ رہا تھا۔ دوپٹے کے نیچے لان کی پرانی شرٹ بھیگ کر جسم سے چپکی تھی۔ ایک لمحے تو چھایا کو اپنے ارادے کے ساتھ حوصلہ بھی ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ مزید آگے بڑھنے کی اُس میں طاقت جیسے نہ رہی تھی۔ صبح ناشتے کے نام پر دو پاپوں اور چائے کی توانائی بھی اتنے طویل پیدل سفر میں اپنے آخری دموں پر تھی۔ وہ رُک کر کسی دوسری بس کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ اور دس پندرہ روپے کے کرائے کی بچت کو بھی اُس نے پس پشت ڈال دیا۔ مگر اگلے ہی لمحے سرسوتی ماں کی تکلیف اور درد کی اذیت کا سوچ کر اُس نے اپنے حوصلے کو سمیٹ کر مضبوط کیا۔ وہ مزید وقت ضائع نہیں کرسکتی تھی۔ سو بس کا مزید رُک کر انتظار کرنے کے بجائے ایک بار پھر اُس نے پیدل ہی اپنے

پیروں کی بچی کچھی طاقت کو آزمانے کی ٹھانی۔ اور بالآخر اُس کے حوصلے نے بس اسٹاپ پر رُک کر کسی دوسری بس کا انتظار کرنے کے بجائے پیدل ہی اپنے پیروں کی طاقت کو آزمانے کی ٹھانی تھی۔ اور بالآخر اُس کے حوصلے نے پوری جان لگا کر چار اسٹاپ کا فاصلہ اپنے قدموں پر عبور کرتے اسپتال کی دہلیز تک پہنچ گئی۔ کیا ہوا جو پاؤں کی ایڑیاں جگہ جگہ چھالوں کے پھٹنے سے جلنے لگیں تھیں۔ وہ وقت پر پہنچ گئی۔

استقبالیہ پر پہنچ کر اُس نے کرخت منہ والی خرانٹ سی عورت کو مخاطب کیا۔

''میڈم...... وارڈ نمبر چار کی مریضہ کو کب تک آپریشن کے لیے لے جایا جائے گا۔ مجھے آپریشن کی فیس جمع کرانی ہے۔ آج اُس کا آپریشن ہونا ہے۔''

چھایا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ اور جواباً کاؤنٹر کے پار بیٹھی عورت کوئی جواب دیے بغیر بس ایک اچٹتی نگاہ اُس پر ڈالتے ہوئے سامنے رکھی کمپیوٹر ایل سی ڈی کے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اسکرین کو گھورنے لگی۔ پھر چھایا کی طرف دیکھ کر بے تاثر پروفیشنل لہجے میں جواباً بولی۔

''وہ جو لیور کی پیشنٹ ہے؟''

''جی میڈم...... میں سرسوتی گوپال کی بات کر رہی ہوں۔ آج اُن کا آپریشن ہونا ہے۔''

چھایا نے جلدی سے کہا تھا۔

''اُس کا آپریشن تو ملتوی ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایمرجنسی چھٹی پر چلے گئے ہیں ایک ہفتے کے لیے۔'' کاؤنٹر کے پار بیٹھی کرخت منہ والی عورت نے بے تاثر خشک لہجے میں اطلاع دی تو چھایا نے ایک تھکی ہوئی لمبی سانس خارج کی تھی۔

اتنی مشقت جھیل کر اسپتال پہنچنے پر اُسے اس جواب کی توقع نہ تھی۔ اُس نے تو آج کام سے پورے دن کی چھٹی لی تھی۔ اسی لیے کاؤنٹر کے پار بیٹھی عورت کا جواب سن کر اُس کا صبر جواب دے گیا۔ اور وہ بے ساختہ شکایتی لہجے میں بولی۔

''کیا......! تو اب یہ آپریشن کب ہوگا۔ آپ لوگوں کو اندازہ بھی ہے۔ میری مریضہ کتنی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اور اس کے وجود سے جڑے لوگ اُس سے کہیں زیادہ اذیت کا شکار ہیں۔ مگر آپ لوگوں کو کسی کی مجبوری اور مصیبت سے کیا غرض ہوگی۔ آپ تو......''

چھایا کے شکوہ کرتے لہجے میں چھپی ملامت پر عورت نے کڑی نگاہوں سے اُسے گھورا تھا۔ جواباً چھایا کو اپنا لہجہ ملتجی بنانا پڑا اور اس بار وہ لجاجت سے بولی تھی۔ شاید اس لیے کہ غریب کو کسی شکایت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔

''کیا ایمرجنسی میں بھی کوئی دوسرا ڈاکٹر آپریشن نہیں کرسکتا میڈم جی......! میری ماں بڑی تکلیف میں مبتلا ہے۔''

چھایا کے لہجے کے ساتھ آنکھوں میں بھی نمی اُتر آئی تھی۔ جس کوکھ سے اُس نے جنم لیا تھا۔ آج اُس کی اذیت کا اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ اور وہ ریسپشن پر بیٹھی عورت جس کے سامنے روز اسی طرح مصیبتوں کے مارے ہزاروں لوگ اسپتال آتے جاتے تھے۔ زندگی کو بازوؤں میں سمیٹ کر لانے والے ہاتھوں کو اکثر موت کو کاندھوں پر لاد کر لے جانا پڑتا تھا۔ یوں زندگی اور موت کے بیچ ہونے والا تماشا روز اُس کے سامنے ہوتا تھا۔ لہٰذا قصور اُس عورت کا بھی نہیں تھا۔ یہاں تو جیسے ہر شخص نے اپنی ذمے اور فرض کی طرف سے غیر ذمے داری اور بے حسی کی چادر

اوڑھ رکھی تھی۔ اس لیے اس سرکاری ملازمہ کو بھی چھایا اور اُس جیسے مصیبت کے مارے بے بس لوگوں کی مشکلات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لہٰذا چھایا کے شکوے پر پکے منہ والی عورت نروٹھے پن سے بولی۔

''او بی بی...... یہ سرکاری اسپتال ہے۔ یہاں ڈاکٹر دوسروں کی مجبوری پر نہیں اپنی مرضی کے اوقات کار کے مطابق ڈیوٹی دینے آتے ہیں۔ تمہیں زیادہ جلدی ہے تو اپنی مریضہ کو کسی پرائیویٹ اسپتال لے کر چلی جاؤ۔ یہاں تو سرکاری نوکری کرنے والے 'سرکار' کی مرضی چلتی ہے۔''

عورت اپنے کرخت لہجے کی سختی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر کے کاؤنٹر کے پار کھڑے دوسرے شخص کی جانب متوجہ ہوگئی تھی۔ اور چھایا بے بسی سے جھک کر اپنی جلتی ایڑیوں کو دیکھنے لگی۔ اُس کی ایڑیوں میں بننے والے چھالے اب پھوٹ کر جلن میں مبتلا کر رہے تھے۔ اور یہ ساری اذیت اُس نے اسپتال جلدی پہنچنے کے لیے جھیلی تھی۔ مگر چھایا کو یہ اذیت اُس اذیت سے زیادہ نہ لگ رہی تھی۔ جو جنرل وارڈ کے بستر پر لیٹی اُس کی بیمار، ناتواں ماں کو سہنی پڑ رہی تھی۔

اُسے ماں کی تکلیف اور درد کا اندازہ تھا۔ زندہ رہ کر بھی موت سی اذیت جھیلنا آسان نہ تھا۔

بس اب آپریشن کے بعد ہی اُسے اس اذیت سے نجات مل سکتی تھی۔ سرسوتی اور چھایا کو بس اسی امید نے حوصلہ دے رکھا تھا اور اب آپریشن پھر ملتوی ہوگیا تھا۔ یہ سن کر وہ بہت مایوس ہوئی تھی مگر اب اُسے ماں کے پاس جا کر نئے سرے سے تسلی دینی تھی۔ وہ جلتی ایڑیوں کی جلن کو نظر انداز کر کے چپل گھسیٹتے ہوئے جنرل وارڈ کی طرف بڑھ گئی۔

جہاں اُس کی ماں پچھلے ایک ہفتے سے جگر کے آپریشن کے لیے داخل تھی اور آج یہ انتظار جو جان لیوا تھا ختم ہونے جا رہا تھا مگر ڈاکٹر جو پہلے ہی صرف تاریخ پر تاریخ دے رہے تھے۔ آج پھر اُسے نئی تاریخ کے لیے ٹرخا دیا جانا تھا۔

☆......☆......☆

تھوڑی دیر بعد وہ سرسوتی کے پاس بیٹھی تسلی دے رہی تھی۔ کیونکہ اب یہی اُس کے بس میں رہا تھا۔ اپنی معمولی سی نوکری کے تمام تر وسائل جمع کر کے اُس نے سرسوتی کے آپریشن کے لیے فیس کی رقم اکٹھا کی تھی۔ اگرچہ اس آزمائش کے کڑے وقت میں سگے رشتے داروں اور قریبی ملنے والوں نے ہمدردی کے طور پر اُسے صرف دلاسے اور کچھ مالی مدد کرنے کے وعدے ہی دیے تھے۔ مگر سرسوتی کے آپریشن کی تاریخ آنے تک وہ وعدے حالات اور مجبوریوں کی نذر ہوتے چلے گئے۔ سب نے معذرت کر لی تھی۔ کیونکہ رشتے دار بھی اُس کی طرح حالات اور تقدیر کی مفلسی کا شکار تھے۔ لہٰذا اُس نے کسی سے کوئی شکوہ کیے بغیر خود ہی اپنی مدد آپ کوشش کی۔ اب بس آپریشن ہونے کا انتظار تھا۔ جس کے ملتوی ہونے کی خبر دے کر ماں کو مایوسی سے بچانے کے لیے چھایا کو جھوٹا بہانہ بنانا پڑا۔ تاکہ سرسوتی ماں کے دل اور چہرے پر امید کے دیے کی ٹمٹماتی لو مدھم نہ پڑے۔

''اماں تو فکر مت کر...... میں نے خود ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ کسی دوسرے ڈاکٹر کی ڈیوٹی لگا دیں گے۔ تیرا آپریشن جلدی ہو جائے گا۔ تو پریشان مت ہو۔'' چھایا نے سرسوتی کے نحیف و نزار کلائیوں کو اپنے ہاتھوں

میں تھامتے ہوئے جیسے دلاسہ دیا تھا۔ لیکن سرسوتی بیٹی کے چہرے پر پھیلی مایوسی کو پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ معصوم کتنی بے بس ہے۔ اُس نے چھایا کے چہرے پر پھیلی دھوپ کی جلن کو جیسے اپنے اندر گرم سیال کی طرح حلق میں اُتارا تھا۔

باپ کی موت کے بعد چھایا نے چھوٹی عمر سے ہی گھر اور گھر کے اندر پیچھے بچ جانے والی زندگیوں کا بوجھ اپنے نازک کاندھوں پر اٹھانے کے لیے سرسوتی کا ہر ممکن ساتھ دیا تھا۔ اور اب سرسوتی اس موذی مرض کا شکار ہوئی تو چھایا کو ہی ماں کے ساتھ چھوٹے بہن بھائی کو بھی سنبھالنا پڑا۔ اس لیے وہ بیٹی کی مایوسیوں کو دیکھ کر خود ہی اُسے دلاسہ دینے لگی۔

''میں جانتی ہوں چھایا...... یہ سرکاری اسپتال ہے یہاں بھی غریب کی غربت کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہاں ہماری مصیبتوں اور مجبوریوں کو دور کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر تو پریشان مت ہو۔ مجھے پتا ہے۔ تُو اپنی ماں کو اتنی آسانی سے موت کے خونی پنجوں میں جکڑنے نہیں دے گی۔ اور میں بھی تو تیرے لیے، شنکر اور جوتی کے لیے جینا چاہتی ہوں۔ میں بھی موت کو آسانی سے جیتنے نہیں دوں گی۔ مگر ڈرتی ہوں اگر موت میرے اور تیرے حوصلے سے زیادہ طاقتور نکلی تو کہیں میں یہ بازی ہار نہ جاؤں۔ میرے بعد تیرا اور جوتی کا کیا ہوگا۔ شنکر تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ کاش......!''

چھایا نے دیکھا۔ اُسے حوصلہ دیتی ماں کی ہمت بھی کانپنے لگی ہے۔ اس سے پہلے کہ سرسوتی کے کانپتے لبوں سے اگلا جملہ باہر آتا۔ چھایا نے جلدی سے ماں کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تو ایسی باتیں کیوں کر رہی ہے ماں۔ تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھ پر بھروسہ رکھ ماں...... میں تجھے کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ بس ایک بار آپریشن ہو جائے۔ پھر تُو بالکل اچھی ہو جائے گی۔'' چھایا نے ماں کو حوصلہ دیتے ہوئے ماں کے ہاتھوں کو محبت سے اپنے لبوں سے لگالیا تھا۔ اور سرسوں کے پھول کی طرح پیلی پڑتی سرسوتی کی بھیگی آنکھوں نے عقیدت سے بیٹی کی تھکن زدہ پیشانی کو چوما تھا۔ اُس کے حوصلے کو سراہا تھا۔

''ہاں...... اگر بھولے ناتھ کی کرپا ہو جائے تو...... پر تیری جگہ اگر شنکر کمانے جوگا ہوتا تو آج تجھے یوں میرے لیے پریشان ہونا نہ پڑتا۔ تجھے نہیں پتا...... جوان لڑکی کے لیے اپنے گھر سے زیادہ محفوظ کوئی اور جگہ نہیں ہوتی...... اور یہ تو سرکاری اسپتال ہے۔ تُو رات ہونے سے پہلے گھر چلی جانا۔''

اچانک ہی کسی اندیشے نے سرسوتی کے دل کو ہولایا تھا۔ چھایا تو بہت معصوم تھی۔ ابھی صرف سترہ برس کی تھی۔ اُسے جوان بیٹی کا رات کو اپنے ساتھ یہاں ٹھہرنا منظور نہ تھا۔ اور چھایا زمانے کی اونچ نیچ کو کہاں سمجھتی تھی۔

''لیکن اماں...... تُو رات کو یہاں اکیلی رہے گی۔'' چھایا نے بے ساختہ کہا تھا۔ اُسے ماں کی بہت فکر تھی۔

''تُو میری فکر مت کر...... یہاں میں اکیلی نہیں ہوں۔ دوسرے نصیب کے مارے بھی اپنے پیاروں کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ تُو میری فکر مت کر۔ بس شام تک گھر چلی جانا۔''

وہ ماں کو کام سے اپنے پورے دن کی چھٹی کا بتا چکی تھی۔ اس لیے یہ سوچ کر اُس کے پاس سے اُٹھ کھڑی ہوئی کہ جاکر پتا کرے۔ ڈاکٹر چھٹی

سے کب آئے گا۔ اب آپریشن کب ہوگا۔

''اماں...... میں ذرا میڈم کے پاس آپریشن کی نئی تاریخ لینے جارہی ہوں۔ تو پریشان مت ہو۔ میں رات سے پہلے گھر چلی جاؤں گی۔ تجھے تو پتا ہے، جوتی اندھیرے سے کتنا ڈرتی ہے۔ پھر کیا پتا، تجھے بھی اسپتال سے چھٹی مل جائے۔'' چھایا شاید جہاندیدہ ماں کی بات کو کسی حد تک سمجھ گئی تھی۔ اسی لیے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر وارڈ سے باہر کی جانب بڑھ گئی۔

سرسوتی اُسے تھکن زدہ قدموں سے باہر جاتے دیکھ رہی تھی اور اتنی دیر سے بھری آنکھوں کے بندھے بند ٹوٹ کر کناروں سے بہنے لگے تھے۔ اُسے اپنی بے بسی سے زیادہ چھایا کی معصومیت پر رونا آرہا تھا۔ جو اتنی کم عمری میں بے رحم زندگی کے تلخ حالات کا اکیلے سامنا کررہی تھی۔ اور سرسوتی بے بس تھی۔ اس لیے اس کڑی آزمائش کے جلد ختم ہوجانے کی دعا کرنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

گوپال اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتا تھا۔ وہیں پر خالی پلاٹ میں اُس کی جھگی بنی تھی۔ جس میں وہ اپنی بیوی سرسوتی اور تین بچوں، چھایا، جوتی اور شنکر کے ساتھ رہتا تھا۔ سرسوتی سے اُس کی پسند کی شادی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور غربت و مفلسی میں بھی وہ ہنسی خوشی ایک دوسرے کی سنگت میں زندگی گزار رہے تھے۔ گوپال دن بھر بجری، سیمنٹ کے گارے سے ڈھیروں، ڈھیر اینٹیں بناتا تھا۔ اُس کے محنت کش ہاتھوں میں بڑا ہنر تھا۔ بھٹے کا مالک اُس کے کام سے بہت خوش تھا۔ جواب میں گوپال کی دن بھر کی مزدوری کی رقم اچھی معقول تھی۔ جس سے دو وقت کا چولہا با آسانی جل جاتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے مالک کا شکر گزار تھا۔ جو بھوکا اٹھاتا تو تھا مگر بھوکا سُلاتا نہیں تھا۔ لہذا وہ شام میں تھک کر گھر لوٹتا تو سرسوتی کی سانولی سلونی پُرکشش صورت دیکھ کر اُس کی ساری تھکن دور ہوجاتی۔

سرسوتی بھی اُس کے گھر آنے پر سارے کام کاج چھوڑ کے گوپال کے آس پاس ہی رہتی۔ اُسے کڑک چائے کا پیالہ بنا کر دینے کے بعد وہیں جھگی سے باہر پڑے پلنگ پر گوپال کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ گرم چائے کی چسکیاں لے کر پیتا۔ اور میٹھی نظروں سے سرسوتی کو دیکھا کرتا۔ اور سرسوتی جو اُس کے چائے ختم ہونے کی منتظر ہوتی۔ گوپال چائے ختم کر کے پلنگ پر کمر سیدھی کرنے لگتا تو وہ بنا بولے ہی اُس کے پاؤں دبانے بیٹھ جاتی۔ گوپال اُسے روکتا۔ مگر وہ مانتی کب تھی۔

وہ سارا دن اُس کے اور اپنے بچوں کے لیے کڑی دھوپ میں جلتے گولے کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں محنت کرتا تھا۔ پھر سرسوتی اپنے فرض اور ذمے داری کو کیسے بھول سکتی تھی۔ جلتی دھوپ میں اینٹوں کے بھٹے پر ڈھیروں ڈھیر اینٹیں تیار کرنا آسان کب تھا۔ جسم کی ساری توانائی منٹوں میں جلتے گولے کی آگ میں کھارے پانی کی طرح بہہ کر گوپال کو اَدھ مُوا کردیتی اور سرسوتی کو اس بات کا پورا احساس تھا۔ کیا کرتی، گوپال کو صرف یہی ہنر ہی آتا تھا اور پھر گوپال کے منع کرنے کے باوجود وہ تب تک گوپال کے پاؤں دباتی رہتی جب تک وہ ہلکی غنودگی میں نہ چلا جاتا۔ گوپال کی شام کی نیند بس اتنی ہی ہوتی تھی کہ مغرب کے قریب اندھیرا ہوتے ہی وہ اُٹھ بیٹھتا تھا۔

چھایا ابھی صرف گیارہ برس کی تھی۔ اور جوتی آٹھ برس کی۔ شنکر اُن دونوں سے چھوٹا تھا اور

سارا دن کھیل کود میں لگا رہتا تھا۔ چھایا اتنی سی عمر میں بھی ماں کا گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ مگر ہانڈی روٹی سرسوتی خود ہی کیا کرتی تھی۔ اس لیے گوپال کے نیند کی جھپکی لگتے ہی وہ جھگی سے باہر بنی رسوئی میں آ کر روٹیاں پکانے بیٹھ جاتی۔ گوپال کی نیند ہوا کے جھونکے کی طرح تھی۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد کچھ دیر میں ہی اُس کی آنکھ کھل جاتی۔ تب سرسوتی گرم گرم روٹیوں کے ساتھ جو بھی ساگ سبزی یا دال بناتی ہوتی۔ گوپال کے سامنے رکھ دیتی اور وہ بلاں چوں چراں کے کھانے لگتا۔

سرسوتی کو اُس کی یہ ادا بہت بھاتی تھی۔ وہ کھانے میں نقص نہیں نکالتا تھا۔ وہ جو پکا کر سامنے رکھتی سکون سے کھالیتا۔ حالانکہ گوپال کتنا کہتا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ ہی روٹی کھالیا کرے۔ تاکہ اُسے اطمینان رہے کہ سرسوتی سب کو کھلا کر خود بھوکی تو نہیں سوئی ہے۔

مگر یہاں سرسوتی ہمیشہ اپنی ہی منواتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گوپال اپنے حصے کی آدھی بھوک اُس کی خاطر اگلے دن کے لیے بچا کے رکھ چھوڑے۔ اسی لیے وہ اُس کے اور بچوں کے کھانے کے بعد کھانا کھاتی تھی۔ اور یہاں گوپال اُس کی ضد کے سامنے ہمیشہ ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ کچھ تو سرسوتی کو اُس سے اپنی بات منوانی آتی تھی۔ دوسرے وہ دوسرے عام مردوں کی طرح اُتھرے مزاج کا آدمی نہیں تھا۔ جو بات، بات پر غصہ کر کے بیوی پر زندگی تنگ کر دیتے ہیں۔

سرسوتی کو اُس کی محنت و مشقت کا پورا احساس تھا۔ اس لیے اُس نے تو کئی بار گوپال سے کہا بھی تھا کہ وہ بھی علاقے کی دوسری عورتوں کی طرح چھایا کو لے کر قریبی فلیٹوں اور بنگلوں میں جا کر جھاڑو پونچھے کا کام کر لیتی ہے۔ تاکہ گوپال کو اُن کے لیے اتنی زیادہ محنت کرنی نہ پڑے لیکن گوپال نے صاف منع کر دیا تھا۔ وہ دو وقت کی روکھی سوکھی اُن کے ساتھ کھالے گا۔ مگر بیوی اور بیٹی سے لوگوں کے گھروں کی چاکری نہیں کرائے گا۔ تب سرسوتی خود کو بہت خوش نصیب عورت سمجھنے لگی تھی۔ گوپال عام مردوں کی طرح اپنی بیویوں سے بے پروائی برتنے والا بندہ نہیں ہے۔ اسی لیے وقت گزرنے کے ساتھ گوپال کے لیے اُس کی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن اب تو وہ دل سے اُس کی پہلے سے زیادہ قدر کرنے لگی تھی۔

وہ ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ مگر جانے اس خوشنما اور کسی حد تک آسودہ منظر کو کسی کی بری نظر لگی تھی۔

مئی، جون کی جھلساتی گرمی کا ایک گرم دن تھا جب گوپال اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتے ہوئے یکدم بے ہوش ہو گیا۔ ساتھ کام کرنے والے مزدور اُسے لے کر اسپتال بھاگے تھے۔ اُسے تیز گرم تاپ چڑھی تھی۔ اگر وہ بے ہوش نہ ہوتا تو ساتھ کام کرنے والے مزدور اُسے عام بخار ہی سمجھتے مگر شاید کچھ برس پہلے 'ہیٹ اسٹروک' کی اصطلاح پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اتنی عام نہیں ہوئی تھی۔ یا پھر اس سے بچنے کے لیے کئے گئے اقدامات کی اویئرنیس آج کل کی طرح نہیں دی گئی تھی کہ کس طرح لوگ جان لیوا قہر برساتی آگ جیسی گرمی سے خود کو موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے لیے کیا کیا اقدامات پیشگی کر سکتے ہیں۔ گوپال کو بھی 'ہیٹ اسٹروک' نے متاثر کیا تھا اور وہ اسپتال پہنچنے کے بعد زندگی اور موت کی درمیانی منزل پر لٹکا تیسرے دن زندگی کی قید بامشقت سے رہائی پا گیا۔

نہ ہی پرنٹ میڈیا کی نظروں میں یہ چھوٹا سا عام حادثہ آیا اور نہ ہی تب الیکٹرونک میڈیا پر بیٹھے سیاستدانوں کے کالے اعمالوں پر دھواں دھار بحث کرتے صحافیوں تک ہی اس نامعلوم حادثے کی خبر پہنچی تھی۔ بس گوپال کی لاش جو ٹھنڈے پانی میں رکھنے سے پھول سی گئی تھی۔ سرسوتی کی جھگی میں پہنچی تھی اور سرسوتی کے گھر اور دل کے آنگن میں بناء کسی بین کے کہرام برپا تھا۔ وہ گوپال کی لاش کے سامنے جھگی کے باہر آنگن میں گم صم بیٹھی تھی۔ چھایا، جوتی اور شنکر اُس کے وجود کی دیوار کے ساتھ چپکے سسکیوں میں رو رہے تھے۔ سرسوتی کو تو جیسے صدمے سے چپ لگ گئی تھی۔ اُسے بند آنکھوں سے سوتے گوپال کی موت کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ جانے کتنے پہر گزر گئے تھے۔

ساتھ کام کرنے والے مزدوروں اور بھٹے کے مالک ہی نے گوپال کے کریا کرم کا انتظام کیا تھا۔ پھر گوپال کے ساتھ سارا آنگن ایک ایک کر کے خالی ہوتا گیا کوئی روتے بلکتے شنکر کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ آخر وہ گوپال کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چتا کو آگ تو اُس نے ہی دینی تھی۔

ساتھ والی جھگیوں کی عورتیں ہمدردی میں شام کا کھانا دے گئی تھیں۔ اور شاید کسی نے جوتی اور شنکر کو بھی کھلا دیا تھا۔ مگر چھایا ماں کا سایہ بنی بیٹھی تھی۔ وہ اُس وقت بھی ماں کے دکھ میں اُس کی ساجھی تھی اور پھر کچھ دن گزرنے کے بعد سرسوتی کے صدمے کا ملال کچھ ہلکا ہوا تھا۔ تب اُسے گوپال کے جانے اور اپنے اکیلے رہ جانے کا احساس بڑی شدت سے ہوا تھا۔ وہ تینوں بچوں کو خود سے لپٹا کر خون کے آنسو روئی تھی۔ گوپال کے بغیر زندگی جینے کا تو اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اور اب گوپال کے چلے جانے کے بعد اُس کے حصے کی ذمے داری سرسوتی کو نبھانی تھی۔ اپنے تینوں بچوں کی بھوک اور مفلسی کی ذمے داری...... سو اُس نے اپنے دکھ کو دل کے آنگن میں دفنا کے قریبی جھگیوں کی عورتوں کے ساتھ مل کر قریبی بنگلوں میں جھاڑو پونچھے کا کام شروع کر دیا۔

جبکہ چھایا نے گھر پر رہ کر کسی گرہستن کی طرح گھر کے کام کاج اور چھوٹے بہن بھائی کی ذمے داری اٹھاتے ہی ماں کے کاندھے کا کچھ بوجھ اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھا لیا۔ پھر نئی آزمائش شروع ہوگئی۔ زندگی بڑی عجیب شے ہے۔ موت سے پہلے بھی آزماتی ہے اور موت کے بعد بھی امتحان لیتی ہے۔

اور گوپال کے جانے کے بعد سکھ کے دن شاید آئے ہی نہیں تھے۔ گوپال کی موت اور جدائی نے سرسوتی کے دل ہی کو زخمی نہیں کیا تھا بلکہ اندر ہی اندر جگر کو بھی چھلنی کرتا رہا تھا۔

پھر ایک دن پتا چلا کہ سرسوتی جگر کی موذی بیماری میں مبتلا ہوگئی ہے۔ جب سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر نے اُسے یہ روح فرسا خبر سنائی تو چھایا پوری روح سے کانپ گئی تھی۔ صرف چھ سالوں میں گوپال کی جدائی کے دکھ نے اُس کی ماں کو دیمک کی طرح کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر وہ ماں کی طرح غضب کی صابر تھی۔ اُس نے بڑی سمجھداری سے ڈاکٹر کی بات سنی تھی اور سرسوتی کے باقاعدہ علاج کرانے کی دل ہی دل میں ٹھان لی تھی۔

اگلے دن سرسوتی کی جگہ بنگلوں میں کام کرنے کی ذمے داری چھایا نے اپنے کاندھوں پر اٹھا لی۔ سرسوتی کو اُس پر بڑا ترس آیا تھا۔ چھایا کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ وہ ایک پورے کنبے کی

بھوک کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھی۔ مگر حالات نے اُسے اس بھاری ذمے داری کو اٹھانے کے لیے وقت سے پہلے بڑا کر دیا تھا۔ دوسرے سرسوتی کے بڑھتے مرض کی اذیت و تکلیف نے اُسے اَدھ موانہ کر دیا ہوتا تو وہ اپنی معصوم بیٹی کو کبھی بے رحم حالات کے حوالے نہ کرتی۔ لیکن اب وہ ان ہی کڑے حالات کے ہاتھوں بے بس و مجبور تھی۔ زندگی نے اُسے اور چھایا کو پہلے سے بڑی اور کٹھن آزمائش کے لیے چن لیا تھا۔ لہٰذا سرسوتی سے پہلے سمجھدار چھایا نے حالات اور زندگی کی خواہش سے سمجھوتا کر لیا اور حالات کی چکی میں پسنے لگی۔

وہ پچھلے چار سالوں سے سرسوتی کا علاج کروا رہی تھی۔ اور اب سرسوتی کا آپریشن ہونا تھا۔ چھایا نے بڑی دقتوں سے آپریشن کی فیس کی رقم اکٹھی کی تھی۔ آپریشن کی تاریخ بھی مل گئی تھی۔ لیکن شاید زندگی ابھی اُس کا اور امتحان لینا چاہتی تھی۔ آج پھر آپریشن ملتوی ہو گیا تھا اور شاید نئی تاریخ ملنے والی تھی۔

☆......☆......☆

چھایا اسپتال کی ریسپشن لابی میں رکھی بینچ پر پچھلے آدھے گھنٹے سے بیٹھی ریسپشن کاؤنٹر کے پار بیٹھی خرانٹ عورت کے فارغ ہونے کی منتظر تھی۔ جو سرکاری خرچ پر لینڈ لائن نمبر پر جانے کس سے باتیں کر رہی تھی اور اس آدھے گھنٹے میں چھایا کی تھکن زدہ پژمردہ سوچوں نے پچھلے کئی سالوں کا سفر طے کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

گوپال اُس کی ماں کی طرح اپنے تینوں بچوں سے بھی بہت محبت کرتا تھا۔ اپنی زندگی میں تو اس نے کبھی سرسوتی اور چھایا کو اپنی سختیوں جھیلتی مشقت میں حصے دار نہیں بنایا تھا مگر موت نے بھی شاید اُسے لاچار کر دیا تھا۔ کیونکہ جس آزمائش سے گوپال اُس ماں بیٹی کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ کاتبِ تقدیر نے اُن کی زندگی کے ساتھ ہی زمین پر اُتار دی تھی۔ چھایا اس مشقت سے گھبرائی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ گوپال کی بیٹی تھی لیکن سرسوتی کی جان لیوا بیماری نے اُسے وقت سے پہلے تھکا دیا تھا۔ حالات کو تو اُس پر رحم نہیں آیا تھا مگر شاید ریسپشن پر کاؤنٹر کے پار بیٹھی سخت دل عورت کو آ گیا تھا۔ اس لیے کچھ دیر بعد فون ریسیور رکھ کر چھایا کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اور چھایا نے جیسے اُس کی توجہ پاتے ہی بینچ سے اُٹھ کر دوڑنے کے انداز میں بڑے قدموں سے کاؤنٹر تک پہنچتے ہوئے اپنی عرضی دی تھی۔

''میڈم...... اب سرسوتی ماں کا آپریشن کب ہوگا مجھے نئی تاریخ دے دیں۔ یا پھر آپریشن کے لیے کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلوا دیں۔ میری ماں بڑی تکلیف میں مبتلا ہے۔''

چھایا نے نم آنکھوں سے عورت کو دیکھتے ملتجی لہجے میں کہا تھا۔ سامنے بیٹھی عورت بھی نرم پڑی تھی۔ کیا ہوا جو اُس کے جذبات و احساسات بھی پروفیشنل ڈاکٹروں کے ساتھ کام کرتے کرتے پروفیشنل (مشینی) ہو گئے تھے۔ مگر تھی تو وہ انسان ہی گیلی مٹی سے بنی عورت......! اس لیے جواباً رسانیت سے بولی تھی۔

''نئی تاریخ تو پہلے ہی تمہاری مریضہ کی کیس میڈیکل فائل پر دی جا چکی ہے۔ مگر اب اُسے اسپتال سے ڈسچارج بھی کر دیا گیا ہے۔ یہ سرکاری اسپتال ہے یہاں پچھلے مریض کا بیڈ خالی ہوتے ہی نئے آنے والے مریض کو دے دیا جاتا ہے۔ تم نئی تاریخ کے ساتھ اپنی ماں کو بھی گھر لے

جاؤ۔ اب اگلے مہینے آجانا۔ اس بار ضرور آپریشن ہوجائے گا۔ میں بڑے ڈاکٹر صاحب سے سفارش کردوں گی۔'' عورت کو شاید چھایا پر ترس آگیا تھا۔ اس لیے ہمدردی دکھا کے بولی تھی۔ جواباً چھایا کے چہرے پر مایوسی کے بال چھٹے تھے۔

''جی میڈم...... بہت مہربانی۔'' چھایا جواباً صرف اتنا ہی بول سکی تھی۔ کیونکہ بار بار بیگم صاحبہ سے کام کی چھٹی لے کر سرسوتی ماں کو اسپتال آکر دیکھنا بھی مشکل تھا۔ اس لیے وہ ریسپشن سے سرسوتی کی میڈیکل فائل لے کر پھر سے جنرل وارڈ کی جانب چل پڑی تھی۔

☆☆......☆......☆☆

چھایا آپریشن کی رقم میں سے کچھ نوٹ نکال کر ٹیکسی میں سرسوتی کو بٹھا کر گھر واپس لائی تھی۔ ورنہ اس شہر کی خستہ حال بسوں میں تو صحت مند انسانوں کا سفر کرنا دوبھر تھا۔ کجا کسی مریض کو بٹھانے کو سوچنا بھی محال تھا۔ اُس نے سوچا تھا۔ اس ماہ کی ملنے والی تنخواہ اس رقم نکال کر آپریشن کی رقم میں شامل کردے گی۔ لیکن اُس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ تقدیر نے اُس کی آزمائش ختم کرنے کی ٹھان لی تھی۔

رات وہ جھگی میں موجود دو چار پائیوں میں سے ایک پر سرسوتی اور دوسری چار پائی پر جوتی اور شنکر کو سُلا کے خود سرسوتی کی چار پائی کے ساتھ نیچے زمین پر چٹائی بچھا کر سوئی تھی اور دن بھر کی کڑی تھکن کے بعد ٹوٹتے وجود کو آرام ملتے ہی ایسی گہری نیند نے اپنی آغوش میں بھرا تھا کہ نیند رات کے کسی پہر جلتے شعلوں کی گرمی سے بھی نہ ٹوٹی تھی۔ اور یہاں تک کے آگ کے شعلوں نے اُن چاروں نفوس کو موت کی آغوش میں لپیٹ لیا تھا۔

اُن کی جھگی کے باہر دوسری جھگیوں میں بسنے والے کسی ہیروئنچی نے نشے میں گم ہوتے رات کے جانے کس پہر آدھی بجی سگریٹ کے شعلے کو ہوا کے دوش پر اچھالا تھا جو سیدھا چھایا کی جھگی میں جاکر گرا تھا۔ جس نے قطرہ قطرہ بہتی رات کے ساتھ لحہ لحہ سلگتے ہوئے یکدم آگے کے تیز بھڑکتے شعلوں میں بدل کر جھگی کے صحن (آنگن) میں سوئے اُن چاروں قسمت کے ماروں کو بھی سوکھی لکڑیوں کی طرح اژدھا بن کر نگل لیا۔

بدقسمتی سے تیز آگ سے اٹھتے شعلوں میں ساتھ والی جھگیوں میں بے خبر سوئے لوگوں تک اُن کی چیخ و پکار بھی نہ پہنچی تھی اور بے رحم آگ نے زندہ انسانوں کی چتا کو مرنے سے پہلے ہی 'دستی' کردیا تھا۔ وہ زندہ ہی آگ میں جل کر بھسم ہوگئے صبح لوگ گوپال کی جلی ہوئی جھگی کی راکھ میں چار زندگیوں کو تلاشنے میں ناکام ہوکر بے بسی سے راکھ کے سیاہ ڈھیر کو گیلی آنکھوں سے دیکھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

جہاں آسمانوں پر شاید سرسوتی اور چھایا کی آزمائش کا انت اسی طرح لکھا جاچکا تھا۔ وہ ہر آزمائش سے آزاد ہوچکی تھی۔

اوپر والے نے زمین والوں کی آزمائش ختم کر کے انہیں اپنی رحمت کی چھایا میں لے لیا تھا۔

اور الیکٹرانک میڈیا پر ایک بڑے چینل پر چھوٹی سی خبر آئی تھی۔ شہر کے نواحی علاقے میں اینٹوں کے بھٹے پر بنائی گئی جھگیوں میں سے ایک جھگی میں آگ لگ گئی اور ظالم شعلوں نے زندہ انسانوں کو جلا کر کالی راکھ میں بدل دیا۔

زندگی واقعی بڑی عجیب شے ہے۔ موت سے پہلے بھی آزماتی ہے۔ اور موت کے بعد بھی امتحان لیتی ہے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

خولہ عرفان

''اماں یقین رکھ اگر تو محبِ وطن ہے تو میرے اندر بھی یہی خون دوڑ رہا ہے کیا ہوا جو اس سرزمین پر اپنا گھر نہیں بن سکا۔ لیکن میرے اجداد کی قربانیوں سے حاصل ہونے والا ملک مجھے اور تجھے ایک قبر کی جگہ تو دے ہی دے گا۔ اور اماں اس کے جذبہ......

اماں کی بوڑھی آنکھوں میں ایک تاریخ رقم تھی لب واقعہ دہراتے ہوئے بھی شدتِ ضبط سے ایک دوسرے میں سختی سے پیوست ہو جاتے اور پھر جب اُس واقعے کا جذباتی تاثر ختم ہوتا تو آنکھوں میں امید کے جگنو جگمگانے لگتے۔ وہ غور سے اماں کو سن رہا تھا۔ اماں پھر شروع ہو جاتیں اور جب تک واقعے کو اس کے منطقی انجام تک نہیں پہنچا دیتیں۔ اُن کی آنکھوں کا پانی حلق پر گر گر کر آواز کو گلوگیر کیے جاتا اور واقعے کے درمیان ایسے لمحات بھی آتے کہ آواز بھی جذبات کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ اماں کی شدتِ گریہ کے سبب بھیگی آنکھیں دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی چھلکنے کو بے تاب ہونے لگتیں۔ لیکن وہ رو نہیں سکتا تھا ورنہ اماں کہتیں۔

''اے کیا لڑکیوں کی طرح ٹسوے بہا رہا ہے۔''

اسے اس وہ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو کھڑکی سے باہر جھانکنے کے بہانے تیزی سے پلکیں جھپکا جھپکا کر آنکھوں میں ہی جذب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہاں تو یہ سمجھ لے بیٹا یہ ملک بڑی قربانیوں سے حاصل ہوا ہے۔ ہمارے رہنما بھی آرام سے نہیں تھے۔ رات دن مسلمانوں کی آزادی کے لیے سوچ بچار میں لگے رہتے تھے۔ جس طرح ہمارے آباؤ اجداد نے مال و جان کی قربانی دی تو انہوں نے بھی اپنی ساری قوت اس ملک کے حصول میں صرف کردی۔ تجھے ابھی نہیں پتا کہ جب کسی سے محبت ہو تو اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے تکلیف بھی راحت بن جاتی ہے۔ بس اللہ کی رضا اور خوشنودی کو مدِنظر رکھ کر اس ملک کو حاصل کرنے میں بڑے جوکھم تھے۔ لیکن اس کی ہی محبت نے ان جوکھموں کو برداشت کرنے کی طاقت دی۔

ورنہ ہم تو بڑے کمزور بندے تھے۔ اب کے انہوں نے آسمان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وقتی تناؤ کے بعد اب اماں کی آواز میں اس وقت کے ارادے کی پختگی جھلک رہی تھی۔ اماں جب بھی آزادی کے حوالے سے کچھ بتاتی تھیں ایسے ہی جذباتی ہو جاتی تھیں۔

پھر اماں کیا ہوا۔ اس نے اماں کو تصوراتی دنیا

سے حقیقی دنیا میں لانے کے لیے سوال جڑ دیا اور وہ جو قیامِ پاکستان کے حالات و اسباب سناتے سناتے چشمِ تصور میں خود اُن سالوں کی طرف پلٹ گئی تھیں۔ پھر حال میں آ موجود ہوئیں رات کو اماں بتاتی تھیں۔ ہندوؤں نے ہمارے محلے کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا لیکن کوئی بھی حملہ نہیں کر پا رہا تھا۔ ابا کے دوستوں نے اُن کو بتایا تھا کہ دوسرے محلے کے ہندو کہہ رہے تھے کہ بہت بڑی فوج نے ہمارے محلے کو چاروں طرف سے اپنی حفاظت میں لیا ہوا تھا اور حملہ آوروں کو بغیر حملہ کیے جانا پڑا۔

لیکن جب ابا نے سنا کہ وہ پھر حملے کا ارادہ رکھتے ہیں تو بس آن کی آن میں تیرے نانا کے دماغ میں کیا سمائی کہ تیری نانی کو سارا سامان باندھنے کا حکم دے دیا۔ سامان بھی کیا تھا بچوں کے پہننے کے چند کپڑے اور تھوڑا بہت زیور جو اماں نے میرے اور تیری خالاؤں کے لیے جوڑے رکھا تھا۔ چڑی مار ٹولہ سے نکل کر آگرہ کی جامع مسجد میں قیام کیا۔ وہاں بھی ہندوؤں کے حملوں کی گاہے بگاہے اطلاعات آ رہی تھیں۔

ایک قیامت کا منظر تھا ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی تھی کہ جیتے جی اپنی پاک زمین دیکھ لیں۔ دوپہر مسجد میں گزار کر ہم سب شام کی ٹرین سے

پاکستان روانہ ہوگئے۔ اماں کے چہرے پر خوشی کی ایسی چمک ابھری جیسے ابھی ابھی پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے اور تھوڑی دیر بعد آنکھوں میں پھر کسی درد بھرے لمحے نے آنسوؤں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہنے لگیں لیکن راستے بھر سربریدہ اجسام اور اعضاء انسانی وفضا میں بسی خون کی بو ماحول میں خوف اور سوگواری پیدا کرنے کے ساتھ آنکھوں میں امیدوں کے دیے اور دلوں میں اُن کی قربانیوں سے عہد و پیاں باندھ رہی تھیں اتنا کہہ کر اماں کا ہاتھ دبائے اُن کو اِس کیفیت سے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اماں کی نظروں نے کچھ دیر کے لیے ایک غیر مرئی نقطے پر ارتکاز کیا اور خود کو سنبھالنے کے بعد اُن کی آنکھیں پھر مسکرانے لگیں۔ جیسے شدید حبس میں بارش برس کر مطلع صاف کر دے۔ اماں نے اُس کو بہلاتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا بس یاد کر اپنا مجھے اور بھی کام کرنے ہیں اور اماں کو مطمئن دیکھ کر وہ اپنے پیپر کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

انٹر کے پیپر ختم ہوئے تو اُس نے سکون کا سانس لیا۔ اب اس کو اماں کے لیے کچھ کرنا تھا۔ ماں باپ کا تو اُس کی کم عمری میں انتقال ہو گیا تھا۔ نانی نے بڑی ہمت اور محبت سے اُسے اور اُس کی دونوں چھوٹی بہنوں کو پالا تھا مگر وہ انہیں نانی نہیں اماں ہی کہتے تھے اور اماں بھی اپنے ہی حوالے سے اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ اُن کے خالہ ماموں کا رشتہ جوڑ دیتی تھیں حالانکہ رشتے میں وہ سب اِن بچوں کے نانا نانی لگتے تھے مگر اماں کی محبتوں نے اُن کے درمیان پائے جانے والے عمر کے فرق کو ختم کر دیا تھا اور اِن بچوں کی محبت نے اماں کو جوان رکھا ہوا تھا۔ بیٹی کے دکھ پر نواسہ نواسیوں کی محبت بازی لے گئی تھی کہ ایک تو ان بچوں کا دکھ اُن سے زیادہ تھا دوسرا اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ وہ ہر روز جاب کی تلاش میں نکلتا تھا تا کہ اماں کو بھی سہارا ہو جائے اور پڑھائی کا خرچہ بھی نکل آئے۔ لیکن بغیر ہنر اور اعلیٰ تعلیم کے جاب کا ملنا ایک مشکل مرحلہ ثابت ہو رہا تھا۔

رات کے تین بجے تھے جب دروازے پر کھٹکا ہوا۔ اماں نے دروازہ کھولا اور بات کیے بغیر اندر چلی گئیں وہ خاموشی سے دروازہ بند کر کے اُن کے پیچھے اندر آ گیا۔

''کھانا کھایا؟'' اماں نے پوچھا۔

''ہاں اماں کھالیا...... آپ نے اور ندا، حرا نے کھالیا؟'' اُس نے جواب دیتے ہوئے چھوٹی بہنوں کے بارے میں بھی پوچھا۔

''ہاں......'' اماں نے ہنوز خفگی کے انداز میں جواب دیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔ اُس کو پتا تھا کہ اب بات کرنا بیکار ہے۔ اماں کی بات کا جواب نہیں دیں گی۔ وہ صبح اُٹھا تو گیارہ بج چکے تھے۔ گھر میں سناٹے کا راج تھا۔ دونوں چھوٹی بہنیں اسکول جا چکی تھیں۔ اماں مضافاتی علاقے میں واقع اس دو کمرے اور ایک صحن پر مشتمل کرائے کے گھر کو چمکا کر باورچی خانے میں خاموشی سے کھانا پکانے میں مصروف تھیں کہ کہیں اُن کی کھٹر پٹر سے محسن کی آنکھ نہ کھل جائے۔ تین بجے تو آیا تھا پتا نہیں کب سویا ہوگا۔ اُن کی ناراضگی اپنی جگہ اور محبت و خیال اپنی جگہ ہوتا تھا۔ حرا اور ندا بھی جب گھر کی صفائی میں منہ بناتیں تو اماں فوراً اُن کے ہاتھوں سے جھاڑو لے کر تیزی سے خود صفائی بھی کرتی جاتیں اور باتیں بھی سناتی جاتی تھیں۔

''یہ دیکھو یہ اس صدی کے جواں لوگ ہیں ناک پکڑو تو دم نکلے۔ ایک کام کرنے کا کہہ دو تو ہلا نہ جائے یہ گھر تو کچھ بھی نہیں۔ اتنے ڈربے تو

ہماری حویلی کے چھوٹے کمرے ہوتے تھے۔ جنہیں ہم گودام یا اسٹور کہتے تھے۔ یہ بڑے بڑے کمرے اور دالان ہوتے تھے۔ اماں دونوں ہاتھوں کو دائیں بائیں پورا پھیلا کر کہتیں۔ جن کی صفائی ہم خود کرتے تھے۔ وہ بھی بنا چوں چراں۔ مویشیوں کے لیے الگ جگہ تھی گھر کے ہی جانوروں کا اصلی دودھ اور مکھن کھاتے تھے لیکن وہ جگہ بھی ایسی صاف ہوتی تھی کہ لگتا نہیں تھا یہ مویشیوں کے باندھنے کی جگہ ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر تو خاص طور پر جلدی جلدی کام سے فارغ ہوکر حویلی کی چھت پر چڑھ جاتے تھے تا کہ شادی کا آنکھوں دیکھا حال اپنی اماں کو بتاسکیں۔

ہندوؤں کی بارات آتی تھی تو کچھ ناچ گانا ان کے مذہب کا حصہ ہوتا تھا کچھ ناچنے گانے بجانے والے ساتھ آجاتے تھے خوب دھوم دھڑ کا ہوتا تھا۔ ہمارے یہاں تو بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا یہ ناچنا گانا، مگر ہم کو تو ناچنے گانے والوں سے ہی زیادہ دلچسپی ہوتی تھی۔ اماں یہ جملہ کہتے ہوئے شرما کر منہ پر کپڑا رکھ لیتی تھیں۔ اُن کا ماضی حال کا یہ تقابلی جائزہ کسی بھی وقت شروع ہوجاتا تھا۔ جب سے وہ کام پہ جانے لگا تھا تو اماں ہفتے عشرے میں ایک بار گوشت یا مرغی بنانے لگی تھیں اور موسم کا پھل بھی کوشش کرتی تھیں کہ دستر خوان پر ضرور ہو۔ ویسے تو عموماً کھانے میں دال یا سبزی ہوتی تھی کیونکہ ابا کے مرنے کے بعد اماں نے سلائی کڑھائی کر کے ہی نواسہ نواسیوں کی پڑھائی اور پیٹ پالنے کا انتظام کیا تھا۔ لیکن وضع قطع کا ہمیشہ خیال رکھتیں۔ جو کھانے کو میسر آتا تھا شکر کے ساتھ کھاتے تھے۔ کبھی نیت کی خرابی اور کم مائیگی کا احساس نہ خود کیا نہ بچوں کو ہونے دیا۔ لیکن پھر بھی کبھی حالات کے ہاتھوں مجبور ہوکر اِن بچوں کے لیے دکھ سے سوچتی ہوئی کہتی تھیں۔

''ہائے میرے بچوں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا اور پھر ان کا تصوراتی ماضی کا سفر شروع ہوجاتا۔ نہ تازہ سبزیاں اور نہ اصلی گھی کا مزہ۔ تم لوگ کیا جانو کھیتوں سے کچن سبزیاں توڑ کر وہیں دھوکر کھانے کا کتنا مزہ ہے۔ اپنے گھر کے جانوروں کے دودھ سے نکلے اصلی گھی اور مکھن کا ذائقہ ہی الگ تھا۔ ہم نے تو پکے آم ڈال سے توڑ کر کھائے ہیں اب موا کاربیٹ لگا کر کچے آموں کو پکاتے ہیں خاک مزہ نہیں ہوتا وہ نخوت سے منہ بنا کر پھر ماضی حال کا تجزیہ شروع کر دیتی تھیں۔ صبح تڑکے کھیتوں میں ہری بھری فصل کے اوپر سے سورج کے نارنجی گولے کو اُگتے دیکھنے کا منظر اتنا دلفریب ہوتا تھا کہ ہوا کی شوخی پر لہلہاتی فصل بھی لمحہ بھر کو دم بخود رہ جاتی تھی۔

صبح صادق کے اندھیرے اُجالے کی آنکھ مچولی میں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سنبھل سنبھل کر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں گر گر کر اکثر اماں سے ڈانٹ کھا کر صبح کے ناشتے کا آغاز ہوتا تھا۔ گردشِ زمانہ اور حالات کی ستم ظریفیوں کے باوجود اماں کا لب ولہجہ علمی اور باذوق خاندان کی عکاسی کرتا تھا۔ وہ اماں کو ان کے ماضی کے کھیتوں اور پگڈنڈیوں سے کاندھوں سے پکڑ کر حال میں اُتار لیتا تھا مگر ماضی سے نکلتے نکلتے بھی بھائی میر واُن کے ذہن میں اٹک جاتے کہ تیرے ابا نے اس پر بھروسہ کر کے سب زمینوں کا مختار نامہ اُسے دے دیا تھا لیکن کیا پتا تھا کہ جس رب کے نام پر ملک بنا وہ اس کے احکامات سے ہی پھر جائے گا، لے کر بھاگ گیا میرے بچوں کا حق، کب تک کھائے گا؟ روزِ قیامت پکڑوں گی اُس کا گریبان......

اماں موجودہ حال پر آبدیدہ ہوتے ہوئے روزِ

قیامت کا منظر کھینچنا شروع ہو جاتیں۔ اور وہ اماں کو تسلی دیتا جاتا تھا۔ اماں اس کا ماتھا چوم کر ڈھیروں دعائیں اس کے دامن میں ڈال دیتی تھیں لیکن اب جبکہ وہ کام پر جانے لگا تھا تو اماں ہر وقت متفکر رہتی تھیں کہ آخر کہاں کام کرتا ہے جو شام سے شروع ہو کر آدھی رات کو ختم ہوتا ہے۔ اتنی رات تک کون سی دکانیں کھلی رہتی ہیں ان کو یقین نہیں آتا تھا۔ اماں کو باورچی خانے میں دیکھ کر وہ وہیں آ گیا رات کی ناراضگی ابھی برقرار تھی اُس کی آہٹ پر پلٹ کر دیکھا ۔ پھر کام میں لگ گئیں۔

''اماں ناراض ہو؟'' اس نے کاندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف موڑتے ہوئے پوچھا اور اُس کو پتا تھا کہ اماں کو اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی دیر ہے پھر کہاں کی اور کیسی ناراضگی۔ مسکرا کر سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اتنا کمزور ہو رہا ہے پتا نہیں رات کو کہاں رہتا ہے اور کیا کھانا کھاتا ہے۔ میرے دل کو تسلی نہیں ہوتی۔'' انہوں نے پریشانی سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا تو پیار سے اُن کی گردن میں بازو حمائل کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''اماں اچھی طرح اور اچھا کھانا کھاتا ہوں۔ میرے لیے کیوں پریشان ہوتی ہو مرد بچہ ہوں۔ اپنا اور میری چڑیلوں کا خیال رکھا کریں۔ بہنوں کی طرف تذکرۃً اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو باہر جانے کی کوشش کیوں نہیں کرتا محسن۔'' اماں نے اُسے کھانا دیتے ہوئے اچانک پوچھا۔ اس نے لقمہ لیتے ہوئے اماں کو مسکرا کر دیکھا اور تھوڑے انتظار کے بعد کہا۔

''اماں! میں نے ابھی صرف انٹر کیا ہے میرے پاس کوئی ہنر نہیں ہے۔ پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتا مجھے خود سے تُو دور کر سکے گی۔'' اماں کی آنکھوں میں اُداسی کی پرچھائیاں اور رم جھم کے آثار دیکھ کر اس نے کھانا چھوڑا اور اماں کے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''مجھے حب الوطنی گھٹی میں پلا کے اور صبر و شکر کے نوالے کھلا کے اپنی محبت اور وطن سے کیوں منکر اور بے بھروسہ ہوتی ہو۔ اتنا کمزور نہیں ہوں میں اماں کہ جس زمین کو میرے اجداد نے قربانیوں سے حاصل کیا اُسے چھوڑ کر دوسروں کو اپنے علم و فن سے مستفید کرنے چلا جاؤں۔ لیکن یہاں کام حاصل کرنے کے لیے کتنے جوتے رگڑنے پڑتے ہیں پھر بھی محنت کا معاوضہ کہاں حاصل ہوتا ہے۔ بہنوں کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا ہے اور گھر بھی کرائے کا ہے۔''

''تیرے نازک کاندھوں پر بہت بوجھ ہے میرے لال!'' اماں کے لہجے کو بیٹے کے لیے فکر اور مستقبل کے خوف دونوں نے گھیرا ہوا تھا۔

''اماں میں جو کام کرتا ہوں اس میں بھی قسمت نے ساتھ دیا تو بہت پیسہ ہوگا۔''

''مگر تو کام کیا کرتا ہے؟'' اماں نے پھر اس کے مطمئن لہجے پر تشویشناک انداز میں پوچھا۔ اُس نے تھوڑا جھنجلا کر کہا۔

''اماں بتایا تو ہے کپڑے کی دکان پر بیٹھتا ہوں اور باقی وقت اپنے دوستوں کے ساتھ کسی مستقل کام کے لیے منصوبہ بندی کرتا ہوں اس لیے تھوڑی دیر ہو جاتی ہے۔'' اماں کے کچھ سمجھ آیا ہو نہ آیا ہو مگر ڈھارس بندھ گئی کہ وہ یہیں رہ کر محنت کرنے پر یقین رکھتا ہے کہ جذبات میں آ کر بے ساختہ اُسے باہر جانے کا کہہ تو دیا تھا لیکن خود اندر سے ڈھے سی گئی تھیں۔

''اچھا اچھا تو کھانا کھا بیٹا بلاوجہ اُلجھا دیا میں نے تجھے باتوں میں۔'' اماں نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور باورچی خانے سے باہر آنے لگیں تو اُس نے جاتے ہوئے اماں سے کہا۔

''اماں یقین رکھ اگر تو محب وطن ہے تو میرے اندر بھی یہی خون دوڑ رہا ہے کیا ہوا جو اس سرزمین پر

اپنا گھر نہیں بن سکا۔ لیکن میرے اجداد کی قربانیوں سے حاصل ہونے والا ملک مجھے اور تجھے ایک قبر کی جگہ تو دے ہی دے گا۔ اور اماں اس کے جذبہ حب الوطنی میں پوشیدہ کرب پر آنکھوں میں گھر آنے والے آنسو چھپا کر اس حقیقت سے انکار کیے بغیر خاموشی سے آگے بڑھ گئیں اور وہ مسرور سا کھانا کھانے لگا۔ شاید اماں کو اطمینان دلانے کے لیے۔ گھر کے حالات و واقعات نے اسے وقت سے پہلے اور بہت زیادہ سمجھدار بنا دیا تھا۔ لیکن وہ اماں کے حسین ماضی کے ساتھ حال میں بھی مطمئن و مسرور دیکھنا چاہتا تھا۔

شام کو اپنے کام پر جانے کے لیے تیاری کرنے لگا تو اماں نے اس کو گھر کی چابیاں پکڑا دیں کہ ایک چابیوں کا گچھا اپنے پاس رکھ لو۔ آج حرا کی دوست کے بھائی کی شادی میں جانا ہے۔ پتا نہیں کتنا وقت لگ جائے اور اس نے احتیاطاً چابیاں اپنی جیب میں ڈال لیں۔ حرا کی دوست کے ابا کا شمار نو دولتیوں میں ہوتا تھا۔ اماں کا موڈ تو نہیں تھا۔ لیکن بہت عرصے بعد کسی دعوت کا بلاوا آیا تھا۔ اماں نے بچیوں کی خوشی کا سوچ کر حامی بھر لی تھی۔ وقت مقررہ کے بعد پہنچنے کے باوجود بھی ابھی لوگ نہیں آئے تھے۔ البتہ اسٹیج سجا ہوا تھا۔ موسیقی کا بھی ساؤنڈ سسٹم کے ساتھ انتظام کیا گیا تھا۔ اماں پردے کے خیال سے اندر کی طرف ہو کر بیٹھ گئیں کیونکہ مرد عورتوں کا ایک ہی جگہ بیٹھنے کا انتظام تھا۔ بعد میں یہ عقدہ بھی کھلا کہ باقاعدہ ہلکے پھلکے انٹرٹینمنٹ یعنی تفریح کے لیے کچھ ڈانسنگ گروپ اور فن کار بھی مدعو ہیں۔

مہمانوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ اناؤنسمنٹ بھی شروع ہوگئی کہ اب فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ اماں کو شدید الجھن ہو رہی تھی۔ اردگرد کی بڑبڑاہٹوں کے ساتھ اماں کی بڑبڑاہٹ بھی شامل تھی کہ جن لوگوں سے جان چھڑا کر آئے تھے۔ انہی کے طور طریقے اپنائے بیٹھے ہیں۔ رائیگاں کر دیں میرے بزرگوں کی قربانیاں، حرا اور ندا ان کا ہاتھ دبا دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ موسیقی کی تیز دھن پر لڑکوں نے اپنے ڈانس کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ لڑکوں کے بدن پھرتی سے دائیں بائیں آگے پیچھے حرکت کر رہے تھے۔ سر سے پاؤں تک لگ رہا تھا جیسے بجلیاں بھری ہوئی ہیں لوگ محظوظ ہو رہے تھے۔

فنکشن کے اختتام اور کھانے کی ابتداء کے درمیانی وقفے میں لوگ اس گروپ کے لڑکوں سے متاثر ہو کر ان سے گفتگو کرنے کو بڑے اعزاز کی بات سمجھ رہے تھے اور اپنی تقریبات میں بلانے کے لیے ان سے فون نمبر وغیرہ کا تبادلہ کر رہے تھے۔

شادی میں موجود چھوٹے بچے بھی موسیقی پر تھرکتے ہوئے اپنے فن کا مظاہرہ پیش کرنے کے لیے بھیجے جا رہے تھے اور ماں باپ فخر سے انہیں اسٹیج پر اعتماد کے ساتھ ڈانس کرتے دیکھ رہے تھے۔ اماں کو تاریخ کے جھروکوں میں کھڑی وہ مائیں آبدیدہ لگیں جو اتنے فخر سے اپنے بچوں کو صرف حصولِ علم کے لیے بھیجتی تھیں وہ بھی اُس وقت کے جید علماء کے پاس دوسرے شہروں میں، لیکن اس وقت تو وہ خود بھی آبدیدہ تھیں اور نظریں جھکائے بیٹھی تھیں اس لیے نہیں کہ وہ باپردہ تھیں بلکہ اس لیے کہ موسیقی کی لے پر ڈولتے مخنث کے جسم کو دیکھ کر اماں ماضی کے پسِ منظر اور حال کا منظر کا تقابلی جائزہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ اُن کے ذہن سے تاریخ کے سب اوراق اُڑ گئے تھے اب شاید اُن آنکھوں میں تاریخ رقم نہیں ہو سکے گی کہ قیامِ پاکستان نے حویلی کی چھتوں سے اُتار کر انہیں تماش بین سے تماشہ بنا دیا تھا۔

☆☆......☆☆

ابھی امکان باقی ہے

''سنو! تمہارا اس طرح باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔ پہلے ہی لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔ انہیں تمہارے نصیب کی برائی تو نظر آ گئی مگر اُس مرد کی زیادتی نظر انداز کر رہے تھے اُس شخص کے ظلم کا حساب کتاب کیے بنا ہی اُسے یونہی چھوڑ دیا گیا جبکہ......

اُن کرداروں کی کہانی، جو ہر معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں مگر جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے

قسط نمبر 1

''بارات واپس جا رہی ہے...... اروی کی بارات واپس جا رہی ہے۔'' جانے کس کی آواز گردش کرتی ہوئی دلہن بنی اروی احمد کے کانوں تک پہنچی تو اُس نے بوکھلا کر اپنے زرتار دوپٹے کا گھونگھٹ اُلٹ دیا۔

اردگرد جمع رشتہ دار و عزیز خواتین و لڑکیوں کا لگا جمگھٹا چھٹنے لگا۔

سب میں ایک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ہر کوئی کمرے سے باہر جانے کی کوشش میں تھا اور اس کوشش کی تاخیر پر ایک دوسرے سے اُلجھ بھی رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اُس کی سبھی کزنز اُس کے اردگرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں اور اُسے جتا رہی تھیں کہ وہ سب کے لیے کس قدر اہم ہے۔ اب کسی کو بھی اُس کی پروا نہیں تھی۔ اروی احمد کی گھٹی ہوئی آواز کسی کو بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ہوتا تو یہ کہ وہ غش کھا کر گر جاتی یا پھر باقی سب کی طرح بدحواس ہو کر باہر کی طرف لپکتی مگر اس وقت اُس کی مضبوط قوتِ ارادی نے اُسے ایسے کسی عمل سے روک رکھا تھا، دوسرے اُسے اپنی سماعت پر ابھی تک شبہ تھا۔ بصارت پر شک تھا۔

بے شک اُس کا رشتہ اچانک طے پایا تھا مگر اُس کے والدین نے اُس کی بہتری دیکھ کر ہی اُس کی زندگی کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ابھی تک صورت حال پر بے یقین سی تھی۔ باہر سے عجیب و غریب آوازیں آ رہی تھیں۔ جو اُس کی سماعت کو مخدوش کر رہی تھیں۔ اُسے صورتِ حال کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جیسے ایک لمحے کے حصار میں بیٹھی تھی۔ سن رہی تھی، دیکھ رہی تھی، لیکن محسوسات پر جیسے برف جمی ہوئی تھی۔ کوئی نہیں تھا جو اُسے آ کر حقیقت بتاتا یا اُسے سنبھالتا...... شاید اُسے سبھی بھول گئے تھے۔

کچھ لمحے گزرے تھے یا صدیاں بیت گئی تھیں۔ اک شناسا چہرا آخر اُس کمرے میں داخل ہوا۔ جو اُس کی عزیز از جان سہیلی نرمین کا تھا۔ نرمین آتے ہی اُس سے لپٹ کر رونے لگی۔ اُس کے چہرے پر پھیلا حزن و ملال اروی احمد کو یقین دلا رہے تھے۔ اُس کے مغموم و پرنم چہرے پر پھیلا دکھ دیکھتے ہی اُس کے

منجمد حساسات پگھلنے لگے۔

کچھ دیر پہلے اُس کے اندر پھیلی خواب کی سی کیفیت کی جگہ ایک سنگین وسنگلاخ حقیقت آشکارا ہو کر اُسے جھنجھوڑ گئی۔ اُس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور جانے کیا ہونے والا تھا۔ یہ اذیت ناک احساس اُسے لرزانے لگا تھا۔ اُس کے سبب اُس کے اردگرد بسنے والے جس تکلیف سے گزر رہے تھے اور گزرنے والے تھے یہ سوچ اُس کی جان کھینچ رہی تھی۔

اُس کے والدین کے لیے مستقبل میں اُس کی ذات نہ صرف بہت بڑا طعنہ بننے والی تھی بلکہ بہت بڑا مسئلہ بھی بننے والی تھی۔ معاشرے کی بے حسی وہ جانتی تھی بے گناہ کو سزائیں دینا دنیا کا شیوہ تھا۔ وہ ادارک رکھتی تھی کہ آنے والا وقت اُسے کس ستم کا نشانہ بنانے والا ہے۔ نرمین نے اُس کے وجود کی ٹھنڈک ولرزش محسوس کر کے اُسے سنبھالا دیا۔ اروی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ کچھ پوچھے۔ اُس نے بے دردی سے اپنے لب چبائے۔

''نر...... مین...... کیا با...... ت ہوئی...... با...... ہر...... شور......'' اروی کے لہجے کا لڑکھڑانا اُس کی اندرونی کیفیت واضح کر رہا تھا۔

''ہا...... ں...... سچ ہے...... سعد رضا نے ہمیں بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ وہ پہلے سے شادی شدہ ہونے کے علاوہ دو بچوں کا باپ بھی ہے۔ وہ بہت ظالم اور سفاک انسان ہے۔ اُس کی بیوی آ کر سب کی آنکھیں نہ کھولتی تو آ...... ج تم بھی نجانے اور کتنی معصوم لڑکیوں کی طرح اُس خبیث انسان کی خباثت کا شکار ہو جاتیں۔ اُس شخص کا یہ کاروبار ہے معصوم لوگوں کی بیٹیوں کو اپنے ساتھ باندھ کر بعد میں انہیں بے بس کر دیتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو لوٹ مار بھی کر ڈالتا ہے۔

اُس خوبصورت چہرے کے پیچھے ایسا گھناؤنا چہرا ہے۔ مجھے تو سن کر تکلیف ہو رہی ہے۔ اور جن معصوم لڑکیوں نے اُس کا ظلم وستم سہا ہوگا اُن بے چاریوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خدایا! اس قدر فریبی لوگ بھی ہوتے ہیں۔'' نرمین خود بھی اُسی کیفیت میں تھی۔ اُس کے آنسو بھی تواتر سے بہہ رہے تھے۔

''کیا...... ؟ نہیں...... ؟'' اروی کی دبی دبی چیخ لبوں سے برآمد ہوئی وہ جیسے ابھی تک اُسی ایک لمحے میں تھی۔ بے یقین وخواب جیسی کیفیت تھی اُس کی۔

''یہ بالکل سچ ہے اروی...... شاید تمہاری اپنی ہی دعاؤں نے تمہیں بچا لیا ہے۔ تم خود بھی تو اس جلد بازی میں طے پانے والے رشتے سے مطمئن نہیں تھیں۔ صرف انکل احمد کی خوشی کے لیے اُن کے فیصلے کو مجبوراً مان رہی تھیں۔

تمہاری بے اطمینانی شاید اسی وجہ سے تھی۔ انکل احمد اور زہیر احمد تو اس دھوکا دہی پر آگ بگولہ ہو گئے تھے۔ زہیر بھائی کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اُس فراڈی انسان کو قتل ہی کر ڈالیں۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے معاملہ سنبھالا ہے۔ انکل احمد کے دوستوں نے خوب سُنا کر اُن لوگوں کو رخصت کیا ہے۔ دیکھو اب تمہیں ہمت سے کام لینا ہے۔ آنٹی کو تم ہی سنبھال سکتی ہو...... وہ تو یہ معاملہ دیکھ کر ہی شاکڈ ہیں۔''

''کہ...... کیا ہوا امی کو...... ؟'' اروی جو پھر سے بستر پر ٹک چکی تھی بے تابانہ اٹھی...... نرمین نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''سنو! تمہارا اس طرح باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔ پہلے ہی لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔ انہیں تمہارے نصیب کی برائی تو نظر آ گئی مگر اُس مرد کی زیادتی نظر انداز کر رہے تھے اُس شخص کے ظلم کا حساب کتاب کیے بنا ہی اُسے یونہی چھوڑ دیا گیا جبکہ یہی لوگ...... اب تمہیں ساری زندگی ناکردہ جرم کی سزا دیتے رہیں گے۔''

زمین نے آبدیدہ نظروں اور رقت بھرے لہجے سے کہتے ہوئے اُسے دیکھا۔ اروئ جانتی تھی ''وہ لوگ'' کون تھے جو اُس کے نصیب کے پردے میں اُسے برا کہہ رہے تھے اور اُس کے والدین کو اذیت دے رہے تھے۔ ایک دم ہی خواتین کا ریلا اندر اُمڈ آیا۔ زمین نے فوراً ہی اُسے قریب بیٹھا کر گلے سے لگا لیا اور وہ اُس سے لپٹ کر اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''ہا...... ئے...... ہائے میری بچی...... یہ کیا ظلم ہوا ہے ہمارے ساتھ...... یہ کس کی بددعا نے تمہارے نصیب پر کالک تھوپ دی۔ یہ کیسا دن دکھایا ہے خدا نے ہمیں، کاش میں یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی مر جاتی۔ کیا کیا ارمان تھے میرے...... اب...... اب کون تجھے بیاہنے آئے گا...... ہائے...... یہ کیا ہو گیا میرے خدایا......''

زہرا احمد باہر سے ہی سینہ کوبی کرتی ہوئی آئیں۔ عورتوں کو راستے سے پرے ہٹاتی ہوئی آگے بڑھ کر اپنی بیٹی کو اسی طرح اپنی آغوش میں جھپٹ کر بھرا جیسے مرغی اپنے ناتواں چوزے کو پروں میں چھپا لے۔ اس وقت وہ دوپٹے سے بے نیاز اُلجھے بکھرے حلیے میں بین کرتی ہوئی کئی آنکھوں کو اشکبار کر گئیں۔

''امی...... امی جی...... پلیز آ...... پ۔'' اروئ نے کچھ کہنا چاہا، مگر آنسوؤں کے گولے نے حلق سے آنے والی آواز پر پہرا بٹھا دیا تھا۔ البتہ آنسوؤں کی روانی پر بند باندھنا مشکل ہو رہا تھا۔

اُس کے آنسو اُس کی زبان بنے ہوئے تھے۔ اردگرد چہ مگوئیاں جاری تھیں۔ کمرے میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''آ...... آپا...... سنبھالو خود کو، کیوں تماشہ بنوا رہی ہو اپنا...... اروئ کو دیکھو...... کچھ خیال کرو آپا، بچی نڈھال ہو رہی ہے۔'' نمرہ خالہ نے اپنی بہن کو دوپٹہ اوڑھاتے ہوئے۔ اروئ کو اُن سے الگ کر کے اپنے گلے سے لگاتے ہوئے انہیں سنبھالنے، سمجھانے کی کوشش کی۔

''کیسے...... سنبھالوں خود کو نمرہ...... تم نے دیکھا...... نہیں...... میری تو دنیا اجڑ گئی۔ پہلے کام کا ہی یہ انجام ہوا تو؟ میری بچی کے نصیب دیکھو...... برباد ہو گئی ہے یہ۔ ابھی گھر بسا نہیں تھا اور یہ پہلے ہی اجڑ کے باپ کے گھر بیٹھی رہ گئی ہے۔ تم کہتی ہو خود کو سنبھالوں...... کیسے؟ بتاؤ کیسے؟ اس کرموں جلی کا کیا بنے گا۔ مجھے بتاؤ کون اس کے نصیب کی کالک پونچھے گا۔ کون اسے عزت سے لے جائے گا۔''

زہرا احمد ہچکیاں لیتے ہوئے بمشکل اپنی بات کہہ پائیں تھیں۔ اُن کا دھاڑیں مار مار کر رونا نمرہ کے ساتھ ساتھ اروئ اور زمین کو بھی پریشان کر رہا تھا۔ نمرہ نے بہن کو بے بسی سے دیکھتے ہوئے انہیں سنبھالنے کی ایک اور کوشش کی۔

''آپا...... تم کیسی باتیں کر رہی ہو...... تم تو خدا کا شکر ادا کرو، جس نے ہمیں بروقت بچا لیا۔ ذرا سوچو! اگر ہمیں اُس کی پہلی شادیوں کا بعد میں پتہ چلتا تو ہم کیا کر لیتے۔ تب بھی تو نصیب کو ہی کوستے...... ہماری

بچی کو بعد میں یہ دکھ ملتا تو کیا ہوتا۔ وہ بیاہ کر کے ساتھ لے جا کر نجانے اروئی کے ساتھ کیسا سلوک کرتا میں تو شکر کرتی ہوں کہ اروئی ہمارے سامنے ہے اور صد شکر اس پر کہ ابھی نکاح بھی نہیں ہوا تھا ورنہ تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ جان چھڑانی مشکل ہو جاتی اُس خبیث انسان سے، کیسا بھروسہ جیتا ہے اُس نے احمد بھائی کا جبھی تو آناً فاناً سبھی طے کروایا۔ خدا غارت کرے اُس مردود کو۔'' نمرہ خالہ نے اپنی بھڑاس بھی زور و شور سے نکالی۔

''لاکھ مرد کا قصور ہو مگر ماننا پڑے گا بی بی بدنامی تو اپنی ہی لڑکی کی ہوئی نا۔ بارات کا دروازے سے لوٹ جانا کوئی اچھا شگن نہیں ہوتا بی بی۔'' کسی عمر رسیدہ عزیزہ نے قریب سے رائے زنی کی۔

''صحیح بات ہے۔ لوگ تو رائی کا پربت بنانے میں دیر نہیں لگاتے۔ دیکھ لینا اب کیا کیا باتیں اڑائیں گی۔ کوئی وجہ تھوڑی جاننے کی کوشش کرے گا کہ 'بارات کیوں واپس لوٹا دی۔'' کسی دوسری نے تیز پھینکا۔

''اس بدنصیب کا تو جو ہوگا سو ہوگا۔ زہرا کی دوسری بیٹی کے لیے بھی اب تو مسئلہ بن جائے گا۔ اُس کے لیے بھی جو آئے گا پہلے بڑی بہن کے بارے میں پوچھ گچھ کرے گا۔ زہرا ٹھیک تو رو رہی ہے۔'' کہیں سے ایک اور نشتر چلا اروئی بھی سسک پڑی۔

دل و روح پر زخموں کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یہ وقت ہمدردی و دلجوئی کا تھا مگر سب رنگ برنگی بولیاں بول کر اُن کے زخموں پر مزید نمک مرچ بلکہ گرم مصالحہ تک چھڑک رہی تھیں اور انہیں بلبلانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اُن سب میں جو خواتین اس عمل میں پیش پیش تھیں وہ زہرا احمد کے سسرال سے تعلق رکھتی تھیں۔

''اڑانے دیں لوگوں کو بے پر کی...... ہمیں تو اطمینان کہ ہماری بیٹی جنجال سے بچ گئی اللہ نے چاہا تو ہماری اروئی کا کوئی بہتر سبب بنے گا۔ مجھے تو اللہ پر بھروسہ ہے ہماری ایسی نیک پیاری فرمانبردار بیٹی کو کوئی اچھا بر ہی ملے گا۔ آپا تم فکر کیوں کرتی ہو۔ اللہ نے جو کیا وہ اروئی کی بہتری کے لیے کیا۔ لوگوں کی باتوں پر مت جاؤ، لوگوں کا کیا ہے لوگ تو باتیں کرتے ہی ہیں۔ ہمیں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ آج نہیں تو کل وہی کوئی وسیلہ بنا دے گا۔''

نمرہ خالہ کا ایمان پختہ تھا۔ اُن کی باتوں میں اللہ پر یقین کی جو مہک تھی وہ بند کمرے میں آکسیجن کی سی اہمیت رکھتی تھی۔

نمرہ خالہ کی باتیں کئی لوگوں کو ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ کوئی دو بدو کہہ رہا تھا اور کوئی سرگوشیوں میں نمرہ خالہ نے پھر تو کسی کا بھی لحاظ نہیں کیا اور سبھی کو کمرے سے باہر کر دیا۔ وہ جانتی تھیں اُن لوگوں کی باتیں سانسیں بند کر دینے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

اس وقت انہیں اپنی بہن اور مظلوم بھانجی کو سنبھالنا تھا اس لیے انہوں نے سب کو نکال کر دروازہ بند کیا اور چٹخنی لگا دی۔

☆......☆......☆

شادی کا گھر ایک دم ماتم کدہ بن گیا تھا۔ کھلکھلاتے لب صدمے سے خاموش ہو گئے تھے۔ کھلتے چہرے مغموم و سنجیدہ ہو رہے تھے۔ خواتین تو خیر سے ایک نئے موضوع پر حاصل سیر بحث چھیڑے بیٹھی تھیں۔ اروئی کی آئندہ زندگی کا تاریک نقشہ سبھی اپنی اپنی زبان و سوچ کے مطابق بیان کر رہی تھیں۔ مگر

مرد حضرات معاملے کی سنگینی سے کسی طرح نمٹنے کے بعد نہایت سنجیدگی سے احمد حسن کو سنبھالے ہوئے تھے۔ بارات کو واپس لوٹانے کے بعد اچانک اُن کا فشارِ خون بھی چڑھ گیا تھا۔ اُن کے لیے فوراً ہی محلے کے ڈاکٹر کو بُلا کر ابتدائی طبی امداد دی گئی تھی۔ اُن کے فشارِ خون کی بلندی کا اصل سبب تو لوگوں کی باتیں تھیں۔ اُن کے اپنے سگے بھائی اُن سے اُلجھ رہے تھے بگڑ رہے تھے۔

دراصل وہ لوگ اروی کی بارات کو لوٹانے کے حق میں نہیں تھے۔ اُن کے نظریے کے مطابق اروی کا مقدر یہی تھا اور اللہ کی مرضی ومنشا بھی، اُن کا خیال تھا کہ اسی طرح خاندان کی عزت میں کمی آنے کا احتمال تھا۔ اُن سبھی بلکہ خاندان بھر کی لڑکیوں کا مستقبل اُن کے عمل سے متاثر ہوا تھا۔ احمد حسن نے اُن کے فیصلے اور بات کو رد کر کے اُن کی عزت بھی گھٹائی تھی۔

احمد حسن اروی کے باپ ہونے کی حیثیت سے اپنے ہاتھوں کیسے اپنی بیٹی کو جہنم میں دھکیل سکتے تھے۔ انہیں جو مناسب لگا تھا انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا۔

مگر اب مسلسل لوگوں کی باتوں نے اُن کا حوصلہ توڑنے کی پوری کوشش کی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جذباتی تناؤ سے نکلتے ہوئے انہیں اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا تھا۔ جو حلق سے رگوں تک منتقل ہوا چاہتی تھی اور زندگی میں سرایت ہونا بھی شروع ہوگئی تھی۔ ایسے میں صرف احمد حسن کے دوست، احباب ہمت و حوصلے کی تلقین کرتے دل جمعی میں مصروف تھے۔

شریح خان اُن کے بچپن کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ جن میں طبقاتی ومعاشی فرق کے باوجود اب تک دوستی قائم تھی۔ دو الگ الگ شہروں میں رہائش رکھتے ہوئے بھی شریح خان سال میں تین چار بار تو ضرور احمد حسن سے ملنے ضرور آتے تھے اور اکثر فون پر رابطہ بھی رکھتے تھے۔

اب بھی وہ احمد حسن کی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے ہی آئے تھے اور انہوں نے ہی اس معاملے کو فریقین کے درمیان تحمل وبردباری سے نمٹایا تھا۔ اُن کی حیثیت سے سبھی مرعوب تھے۔ اُن کی شخصیت دیکھ کر اور اُن کی بات چیت کے انداز پر ہی سعد رضا اور اُس کے ساتھ آئے ہوئے چند ایک باراتی کسی بڑے ہنگامے کے بغیر چلے گئے تھے۔

اس وقت بھی وہ احمد حسن کے قریب بیٹھے انہیں نہ صرف تسلیاں دے رہے تھے۔ بلکہ آئندہ وقت کی اچھی امیدیں بھی اُن کے اندر بیدار کر رہے تھے۔

''احمد اللہ تعالیٰ کی اس میں کوئی مصلحت تھی۔ اُس نے صرف وقتی دکھ دے کر دائمی غموں سے نجات دلا دی ہے۔ حوصلہ رکھو، سب ٹھیک ہوجائے گا انشاء اللہ...... اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

''شریح...... میں کیا کروں، کیسے صبر کا دامن تھام لوں۔ میری بیٹی بہت معصوم ہے۔ وہ ساری عمر بنا گناہ کے سزا پائے گی۔ یہ لوگ...... یہ معاشرہ...... جسے ہم خود تعمیر کرتے ہیں یہی ہمارے راستے بند کر دیتا ہے۔ تم جانتے ہونا یہ لوگ کیا کریں گے۔

''یہ...... یہ میری بیٹی پر بنا قصور کے پتھر اُچھالتے رہیں گے اور وہ اپنی اُمنگوں کا لاشہ اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھا کر چپ چاپ سنگسار ہونے پر مجبور رہے گی۔'' احمد حسن کا غم آنکھوں سے چھلک کر اُن کا چہرا بھگونے لگا۔ شریح خان نے ایک باپ کو ایسا بے بس شاید پہلے کبھی دیکھا تھا۔ احمد حسن کے دکھ کی

تڑپ اُن کے وجود میں بھی اترنے لگی تھی۔
''احمد حسن...... اس طرح خود کو کمزور مت بناؤ، اگر تم خود کو مضبوط رکھو گے تو کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔ تم حوصلہ تو کرو...... جس معاشرے کو ہم خود تعمیر کرتے ہیں اُس میں رہنے کی اپنے لیے گنجائش بھی ہم خود ہی ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی کچھ نہیں کر سکتا اگر ہم کسی کو موقع نہ دیں۔''
''اُٹھو...... حوصلہ کرو، جا کر بیٹی کو سنبھالو اُسے اپنے ہونے کا احساس دلاؤ۔ پیار کرو، اُسے تمہاری ضرورت ہے۔'' شریح خان کا مدہم لہجہ گو کہ زخم بھرنے کی اہلیت رکھتا تھا مگر احمد حسن کی ٹوٹ پھوٹ اتنی شدید تھی کہ سارے زخم اُن کی شکستگی کے احساس سے اُدھیڑنے لگتے تھے۔
''میں...... میں کیسے کر پاؤں گا اُس کا سامنا...... میں اپنی بیٹی کا مجرم ہوں۔ اُس سے نظر ملانے کا یارا مجھ میں نہیں ہے شریح۔ جانتے ہو میں نے ہی اُسے اپنی جلد بازی کی بھینٹ چڑھایا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ پہلے رشتے کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے۔ مجھے بھی یہی لگا اسی لیے میں نے اُس کی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے اُس کی مرضی جاننے اُس کی رائے لینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ یہ دن مجھے میری جلد بازی نے دکھایا ہے۔ میں اب کس منہ سے اُس کے سامنے جاؤں گا۔ میں اب کبھی اُسے اپنی شکل نہیں دکھا سکتا۔ خدایا مجھے موت دے دے...... میں جینا نہیں چاہتا۔''
احمد حسن بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے تھے۔
''ابو جی پلیز ایسی باتیں تو نہ کریں امی اور اروی تو پہلے ہی جان دینے پر تلی بیٹھی ہیں اور اب آپ بھی......'' زہیر اُن کا اکلوتا بیٹا اُن کے کندھے تھامے انہیں نہ صرف دلاسا دے رہا تھا بلکہ اپنی ذات کی مضبوطی کا احساس بھی دلا رہا ہے۔
''اُٹھیں ابو...... اندر چلیں...... اندر نجانے کیا صورتِ حال ہے۔ امی اور اروی کو آخر ہمیں ہی سنبھالنا ہے۔ کچھ نہیں ہوا ہے زندگی میں ہر کسی کو کوئی نہ کوئی آزمائش دینی پڑتی ہے۔ شاید یہ ہماری آزمائش ہے۔ آپ اس طرح حوصلہ ہاریں گے تو ہم کیا کریں گے۔ آپ بالکل فکر نہیں کریں۔ اروی کی شادی انشاء اللہ بہت جلد ہو جائے گی۔''
زہیر کی مثبت باتیں اور رویہ شریح خان کو بھی متاثر کر گیا۔
''بیٹا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جاؤ جا کر بھابی اور بچوں کو دیکھو انہیں اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ اس طرح ہمت ہارو گے تو اُن کا کیا بنے گا۔'' شریح خان نے انہیں بہت ہمت سے رہائشی حصے کی طرف بھیجا۔

☆......☆......☆

حوصلے اور ہمت کا درس دینا تو بہت آسان تھا مگر عمل کرنا جس قدر مشکل تھا یہ وہی جانتے تھے۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ وہ زمانے کے چلن سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ آگے کیا ہونے والا تھا۔ وہ اچھی طرح آگاہ تھے۔ احمد کی بیٹی پر آج اسی لمحے سے زندگی تنگ ہونے جا رہی تھی۔ وہ اپنے ناکردہ گناہ کی سزا، ہر پل، ہر آنکھ ہر زبان سے وصول کرنے والی تھی۔
بلکہ اُس کا یہ سفر تو شروع بھی ہو گیا تھا۔ وہ اُس معصوم لڑکی کا دکھ اپنے دل میں محسوس کر رہے تھے۔ احمد

حسن کا اور اُن کا درد مشترک تھا۔ ماضی کا دکھ جسے وہ اپنے سینے میں دفن کیے بظاہر مطمئن نظر آتے تھے اج پھر سے اُن کے دکھ کا دفینہ دل کی تہہ سے اُبھر کر اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی صورت سمٹ آیا تھا۔ سارے منظر ذہن کی اسکرین پر تیزی سے چلنے لگے تھے۔

زر بخت خان اُن کی چھوٹی بہن...... جس کی شوخی و چنچل پن کا سبھی نشانہ بنتے تھے۔ وہ نہایت ناز نعم میں پلی بڑھی تھیں۔ عمر کے چودہویں سال میں ہی اُن کے لیے رشتوں کی لائن لگ گئی تھی۔ وہ تو گھر بھر کی نظروں میں اُس وقت بچی ہی تھیں جو اپنی گڑیا کی شادی کا کھیل ہر سال چھٹیوں میں دھوم دھام سے رچایا کرتی تھی۔

اُس کی شادی کا سلسلہ شروع ہونے کی بات نے اُن کے بابا اور تینوں بھائیوں کے علاوہ اُن کی اُمو جان کو بھی حیران کر دیا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ زر بخت کے لیے آئے ہوئے ہر رشتے میں کوئی نہ کوئی کمی محسوس کی جاتی۔ کوئی ایک بھی سب کو متفق نہیں کر سکا۔ اُسی دوران شریح خان اپنے بڑے بھائیوں کی طرح دو سال کے لیے ملک سے باہر اعلیٰ تعلیم کے لیے چلے گئے تھے۔ اُس وقت بھی زر بخت کی شادی کا سلسلہ اٹکا ہوا تھا۔ نجانے کیا بات تھی۔ کہیں بات بنتی نہیں تھی۔ اور پھر اُن کی واپسی سے پہلے ہی زر بخت کا کہیں رشتہ طے ہو گیا تھا۔

اُن کی بہن کا نصیب بہت دیر میں کھلا تھا۔ اُن کے خاندان میں لڑکیوں کی شادیاں سولہ سترہ سال کی عمر میں کر دی جاتی تھیں۔ صرف زر بخت ہی تھی جو انیسویں سال میں بیاہی جا رہی تھی۔ بتیس سال پہلے کسی لڑکی کا اُس عمر تک پہنچ کر شادی ہونا لوگوں کی نظر میں اُسے کم تر ثابت کیا کرتا تھا۔ اُن کے خاندان کی روایت ہی ایسی تھی۔ شریح خان واپس لوٹے تو زر بخت بہت بدلی ہوئی تھی۔ گم صم سی...... نوجوانی میں انہیں بہن کی خاموشی کا سبب تو معلوم نہیں تھا البتہ اُس کی خاموشی ایک محبت کرنے والے بھائی کو بہت کھلتی تھی۔

وہ اکثر اُمو جان سے زر بخت کی خاموشی کا سبب پوچھا کرتے مگر وہ بھی اُسے ٹال جایا کرتی تھیں۔ یہ فہم وادراک تو انہیں بہت دیر بعد حاصل ہوا تھا کہ لوگوں کی باتوں نے اُن کی ہنستی کھلکھلاتی بہن کی ساری مسکراہٹیں کیوں چھین لی تھیں۔ وہ جہاں جس محفل میں بھی جاتیں اُن کی ذات موضوع بنا کرتی تھی۔ لوگوں کی ہمدردی میں چھپے طنز اُن کی روح گھائل کر گئے تھے۔ شاید اسی سبب کے اُن کے بابا جان نے اپنے خاندان اور برادری سے باہر کے رشتے کو قبول کر کے زر بخت کی شادی طے کر دی تھی۔

اُن کی شادی طے ہونے سے اُن کی کھلکھلاہٹیں اور شوخیاں تو واپس نہیں آئی تھیں البتہ اُن کے لب مسکرانے لگے تھے۔ اُن کی آنکھوں کی پتلیوں میں پھر سے خواب سجنے لگے تھے۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اُن کی بہن کے خوابوں کی تعبیریں الٹ ہو جائیں گی۔ زندگی نے زر بخت کے بخت کو سیاہ کر دیا تھا یا پھر تقدیر کا لکھا ہی ایسا تھا کہ اُن کے نصیب میں کوئی خوشی کوئی سکھ درج ہی نہیں تھا۔ اُن کی بہن تقدیر کے کاری وار کی زد میں آ گئی تھی۔

شریح خان اپنے غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے اپنے اردگرد حتیٰ کہ اپنے ساتھ لائے ہوئے اپنے بیٹے کو بھی فراموش کر چکے تھے۔ انہیں اُن کی سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں سے اُسی بیٹے کی آواز نے نکالا تھا۔

''بابا جان...... با...... با جان......؟'' اصم اُن کے پاس کھڑا تھا۔

''آر یو اوکے (Are You O.K) انہوں نے چونک کر بیٹے کو دیکھا اُس کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی کے ساتھ اُن کے لیے تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بھی موجودہ صورتِ حال سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اپنے بابا کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے اُس نے انہیں ہچکچاتے ہوئے مخاطب کیا۔

''بابا جان...... آئی تھنک ہمیں اب چلنا چاہیے۔''

''کیا ہمیں چلنا چاہیے؟'' شریح خان نے پلٹ کر سوال کیا۔

''آ...... پ ابھی...... رُکنا چاہتے ہیں، اوکے......'' وہ اس وقت متوسط درجے کے ایک گھر کے باہر لگے شامیانوں کے نیچے بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے ہوئے تھے۔

اصم خان نظریں جھکا کر اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ شریح خان نے سر جھکائے بیٹھے بیٹے کا بغور جائزہ لیا۔ اُن کے تینوں بیٹے نہایت فرمانبردار اور سعادت مند واقع ہوئے تھے۔ اصم اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے زیادہ ہی اپنے بابا کا فرمانبردار تھا۔ اُسے دیکھ کر ایک خیال سا اُن کے ذہن و دل کو چھو کر گزرا تھا۔ اُن کے بڑے بیٹے شادی شدہ تھے جبکہ اصم کے لیے آج کل لڑکیاں دیکھی اور پرکھی جارہی تھیں۔ وہ آج کل اپنے بابا کے ساتھ ساتھ رہتا تھا تاکہ اُن سے تجرباتی طور پر بھی سیکھ سکے۔ اپنے خیال کے اظہار کے لیے انہوں نے کافی نرمی و شفقت سے بیٹے کو مخاطب کیا۔

''بیٹا جان...... ذرا میرے ساتھ آؤ۔'' وہ کہہ کر اُٹھے اور اُس سے آگے بڑھنے لگے۔

''کدھر بابا جان...... واپس چل رہے ہیں؟'' اُن کے پیچھے جاتے ہوئے اصم نے قدرے حیرت سے استفسار کیا۔ کچھ لوگ جو شامیانے میں موجود تھے۔ انہوں نے شریح خان کو جاتے ہوئے خاص معنی خیزی سے دیکھا۔ شریح خان محلے کی گلی عبور کرتے گلی سے باہر کھلی جگہ پر کھڑی اپنی گاڑی کے پاس جارُکے۔ اصم بھی اُن کے اچانک اُٹھ کر چلے آنے پر محوِ حیرت تھا۔ وہ اپنے دوست سے ملے تھے اور نہ ہی کسی سے کچھ کہا تھا۔ اصم نے اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر گاڑی کا لاک کھولا اور پھر دونوں ہی خاموشی سے اندر بیٹھ گئے۔

☆......☆☆......☆

''احمد حسن تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔ ایک غلط روایت تو تم پہلے ہی ڈال چکے ہو اب کیا خاندان کے سارے باپوں کو بیٹیوں کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑا کرو گے۔'' پھوپو سکینہ سے احمد حسن کا بیٹی سے اظہار شرمندگی برداشت نہیں ہوا تھا۔ پوری گھن گرج سے نہ صرف انہوں نے چھوٹے بھائی کو لتاڑا بلکہ اروی کو بھی رگیدا...... شاباش بیٹی...... باپ کی کمر تو پہلے ہی دوہری کردی ہے۔ اب اُس کا سر بھی اپنے پیروں میں جھکوالو۔'' احمد حسن اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی اروی کو ڈھونڈنے اُس کے کمرے تک پہنچے اور پھر بیٹی سے لپٹ کر اپنا ضبط کھو بیٹھے۔ شرمندگی سے اُن کی آواز پست اور وجود لرزیدہ تھا۔ اروی کو جھکے سر اور بند آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ یہ کب ہوش تھا کہ اُس کے پیارے ابوجی اُس کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہیں یا ہاتھ باندھے۔ وہ تو خود اس کیفیت میں تھی کہ زمین پھٹے اور وہ اُس میں سما جائے۔ جانے اُسے ابھی اور کتنی ذلت سہنی تھی۔ لوگوں بلکہ اپنوں ہی کے ہاتھوں وہ جس طرح اذیت اٹھارہی تھی یہ وہی جانتی تھی۔

''آ.....پا..... اسے کچھ مت کہو۔ اس معصوم کی کیا خطا ہے۔ قصور تو میرا ہے۔ جسے کچھ کہنا ہے مجھے کہے۔ میں مجرم ہوں۔ میری بیٹی تو میرے عمل کی پاداش میں سزا بھگت رہی ہے۔'' احمد حسن کی گڑگڑاہٹ اروئی سمیت زہرا احمد اور چھوٹی بیٹی وردہ کی ہچکیاں بلند کر گئی۔ نمرہ خالہ کو ایک بار پھر برائی اپنے سر لینا پڑی۔

''بھائی جی...... آپ لوگ تو اس طرح کر رہے ہیں جیسے اروئی کی بارات واپس بھیج کر آپ نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ شکر ادا کریں۔ ہماری بیٹی بچ گئی۔ اللہ سے پُرامید رہیں۔ انشاءاللہ وہی کوئی سبب پیدا کردے گا۔ اس طرح حوصلہ مت ہاریں۔ آپ نے بالکل صحیح کیا ہے۔ لوگوں کی باتوں کی وجہ سے اور غلط رسموں کی وجہ سے ہم اپنی بیٹی کو کسی گہری کھائی میں کیسے دھکیل سکتے ہیں۔ آیئے اِدھر آرام سے بیٹھیں...... اور خدارا آپ سب بھی جاکر آرام وسکون سے بیٹھیں۔ اس طرح پریشان ہونے اور پریشان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' نمرہ خالہ نے بہنوئی کو بازو سے پکڑا اور کرسی پر بیٹھا دیا۔ سکینہ پھوپو کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

''نمرہ تمہیں بہت باتیں آرہی ہیں۔ ہم پریشان نہ ہوں؟ ہماری بچی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہوگیا۔ آج تک خاندان کی کسی لڑکی کے ساتھ ایسا ہوا ہے کہ ساری تیاریوں کے باوجود لڑکی رخصت نہ ہو۔ ساری زندگی اُسے بٹھائے رکھے گا۔ میرا بھائی یہ دکھ کیسے سہے گا اس کا تمہیں کیا اندازہ چار دن کو آئی ہو...... تماشا دیکھ لیا، اب چل دو گی۔ ساری زندگی تو ہمیں بھگتنا اور سہنا پڑے گا۔ خاندان کی باقی لڑکیوں کے رستے جو بند ہوئے ہیں اُس کا حساب تو ہمیں رکھنا ہوگا۔ تمہارا کیا ہے۔'' سکینہ پھوپو غصے میں بولے جارہی تھیں۔ احمد حسن کے دل پر جو بیت رہی تھی وہی جانتے تھے۔

''خدا کے لیے آپا...... خاموش ہوجائیں۔ سارے یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے میرے بچوں کے

ساتھ تنہا چھوڑ دیں۔'' آخر احمد حسن کو ہی اپنا رویہ دکھانا پڑا۔ اروی کی ہچکیاں ہتھوڑے کی طرح اُن کے اعصاب پر برس رہی تھیں۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ احمد حسن کے چیخنے پر بھی کچھ لوگ وہیں ڈٹے رہے۔ یقیناً اُن کا مقصد تماشا دیکھنا تھا یا پھر سلگتے ہوئے زخموں پر اپنی باتوں کی گرمی سے مزید جلن بڑھانی تھی۔

☆......☆......☆

''اصم...... بیٹا ابھی کار اسٹارٹ مت کرو، پہلے میری بات سنو۔'' اصم نے ابھی چابی اگنیشن میں لگائی تھی کہ انہوں نے اُسے ٹوکا۔ اصم نے فوراً چابی نکال لی۔

''جی بابا جان کیا بات ہے؟'' اصم کا لہجہ ہی نہیں آنکھوں کا تاثر بھی استفہامیہ تھا۔

''اصم...... بیٹا...... سمجھ نہیں آ رہی کیسے کہوں...... تم دیکھ رہے ہو، بلکہ سبھی نے دیکھا کہ ابھی یہاں کیا قیامت برپا ہوئی اور اب اُس کے بعد......'' شریح خان بات کرتے کرتے ایکدم خاموش ہو گئے۔

''بات کیا ہے بابا جان...... آپ کہیے...... خاموش کیوں ہو گئے؟ یہاں آپ کو زیادہ ٹائم کے لیے رُکنا ہے تو نو پرابلم...... بی بی جان کو فون کر دیتا ہوں۔ آپ ٹینشن مت لیں۔'' اصم کی نظریں باپ کے کشمکش زدہ چہرے پر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں۔ شریح خان بھی آخر اپنی بات دل میں دبا نہیں سکے، اپنے مخصوص مشفق لہجے میں آہستہ آہستہ گویا ہوئے۔

''اصم...... یہ شعبہ ہمیشہ سے تمہاری بی بی جان کے سپرد رہا ہے لیکن...... سخت مجبوری ہے، کہوں تو کیسے......؟''

''پلیز بابا جان آپ کے دل میں جو بات ہے کہہ دیں......''

''آج...... تم نے دیکھا کہ کیسے ہنستا مسکراتا ماحول ایکدم چیخ و پکار سے بھر گیا۔ زندگی کا یہ کوئی امتحان ہے یا مذاق جو احمد حسن کی تقدیر کا لکھا بن کر اس طرح سامنے آیا ہے۔ احمد حسن کی بیٹی کی بارات کا واپس لوٹا دینا ایک طرح سے جائز اور مناسب تھا۔ کسی انسان کے دھوکے اور فریب کا اور کیا جواب دیا جاتا۔ مگر اب جو صورتِ حال ہے اُس کا سارا الزام اُس معصوم لڑکی پر آ رہا ہے۔ اور آئندہ بھی آتا رہے گا۔ ہمارا سوشل سسٹم اس قدر بگڑ چکا ہے کہ سبھی حقیقت کو ماننے اور سمجھنے کے بجائے اپنی جاہلانہ سوچوں اور رویوں سے احمد اور اُس جیسے نجانے کتنے لوگوں کو اسی طرح تل تل مرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں لوگ اُس بچی کا جینا حرام کر دیں گے۔ ہر کسی کا دھیان بارات 'لوٹ' جانے پر رہے گا کوئی حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کرے گا اور جاننے والے بھی کبھی سچی وضاحت نہیں کریں گے۔'' شریح خان نے بولتے بولتے کچھ توقف کیا۔ اُن کے چہرے پر بھی گہرا غم جھلک دے رہا تھا۔ اصم نے اپنا پورا چہرا اُن کی جانب موڑ لیا۔ وہ ہمہ تن گوش اپنے بابا کا غم ہلکا کرنا چاہتا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا جان مگر ہم نہ تو سوشل سسٹم چینج کر سکتے ہیں اور نہ ہی لوگوں کی سوچیں اور رویے...... کیونکہ کہیں نہ کہیں کسی 'اور' کے معاملے میں ہم بھی ضرور انوالو رہے ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہم احتجاج نہیں کر سکتے کہ مبادا ہم ہی اس لپیٹ میں نہ آ جائیں۔'' اصم نے اپنے طور پر انہیں غم کے اثر سے نکالنا چاہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بیٹے...... معاشرے میں برائی ہم انسانوں کی کمزوریوں اور بے حوصلگی سے پہنچتی

ہے۔ دکھ تو یہی ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ بے گناہوں کو سزا دیتے ہیں۔ یہ لوگ احمد حسن کی بیٹی کو جینے تو نہیں دیں گے۔ اُس نے جو جرم نہیں کیا وہ اُسی کی سزا جھیلے گی۔ اسی لیے...... اصم میں...... چاہتا ہوں کہ ہم اُسے 'سزا' سے بچالیں۔ اُس پر سیاہ بختی کا لیبل نہ لگنے دیں بلکہ ہم تاریخ بدل کر اُس کے نصیب میں خوش بختی کی نئی تحریر رقم کر دیں۔'' وہ اپنے بابا جان کی بات سمجھتے ہوئے بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اُن کا اشارہ واضح تھا وہ پھر بھی متحیر تھا۔

''آ...... پ کیا چاہتے ہیں بابا جان...... ہم کس طرح؟'' اصم نے اپنی کشمکش کے ساتھ استفسار کیا تو شریح خان نے اُسے دیکھتے ہوئے اپنی بات مزید وضاحت سے سمجھانا چاہی۔

''بیٹا...... تمہارے دل میں ہزاروں خواہشیں ہوں گی۔ اپنی ذاتی زندگی کے حوصلے سے تم نے کئی خواب دیکھے ہوں گے، جنہیں پورا کرنے کی تمہارے پاس حیثیت بھی ہے اور صلاحیت و طاقت بھی...... مگر زندگی میں حسین خوابوں کی تکمیل کے علاوہ حقیقتوں کے اصل روپ بھی سامنے رکھے ہوں گے۔ امکان و گمان نے کبھی کبھی خوابوں کے نامکمل رہ جانے کا خوف بھی دلایا ہوگا۔ اشارہ بھی دیا ہوگا۔ کبھی تمہیں اپنی خواہشوں...... خوابوں اور زندگی کی اچھی بُری حقیقتوں میں سے کسی کو منتخب کرنا پڑے تو تم کیا کرو گے بیٹا۔''

شریح خان کو اپنی بات کہنی دشوار ہو رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے کسی بیٹے کو برملا کسی بات یا عمل کا حکم دینے سے ہچکچا رہے تھے۔ ذہن و دل میں کئی وسوسے سر اُٹھا رہے تھے دل دو طرف کھینچ رہا تھا۔

''با...... با جان میں سمجھا نہیں۔ آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' اصم کو بھی جیسے اپنی سماعت پر بے یقینی سی تھی۔

''اصم...... میرے بچے میں چاہتا ہوں کہ...... ت...... م...... احمد حسن کی بیٹی کو اپنا لو۔''

''ج...... ی...... ی؟'' اصم کے سر پر گویا کوئی بم پھٹا تھا۔ اُسے اپنے لیے یہ سننے کی توقع نہیں تھی یا پھر اُسے اپنے بابا کی سوچوں کا اس نہج پر بہہ جانے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ایک انسان دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو، اُسے محسوس کر کے اُس کا تدارک کرے یہی انسانیت ہے بیٹا...... تماشائی تو تماشوں کے متمنی ہوتے ہیں، دوسروں پر ہنسنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ انسانیت کا تقاضہ تو یہی ہے نا کہ ہم کسی کے غم پر بے شک آنسو نہ بہائیں لیکن اُس کے غم پر بہنے والے آنسوؤں کو پونچھنے کی کوشش تو کریں...... مگر یہاں...... کوئی ایسا نہیں ہے۔ سبھی احمد حسن کا غم بڑھانے کی کوشش میں ہیں۔ یہاں کسی میں اتنا ظرف نہیں کہ وہ اُس بچی کے ننگے سر کو اپنے دامن سے ڈھانپ دے۔ کسی نے یہ حوصلہ نہیں دکھایا کہ اپنے نام کا عزت کا آنچل اُسے اُوڑھا دیتا۔ اصم...... تم...... آگے بڑھو۔ اُس کا ننگا سر ڈھانپ دو۔ اُسے کھلے آسماں کے نیچے تماشا بننے سے بچالو بیٹا...... یہ میری خواہش بھی ہے اور درخواست بھی۔''

شریح خان بولتے بولتے نہ صرف جذباتی ہو گئے تھے بلکہ اُن کی آواز بھی آنسوؤں سے بھیگتی چلی گئی۔ کرب سے اُن کا دم بھی اُلجھنے لگا تھا۔

''م...... میں......؟ بابا جان...... مگر......؟ یوں اچانک فیصلہ...... اور پھر بی بی جان......'' وہ اپنی بات ربط سے بیان نہ کر سکا لیکن شریح خان پھر بھی سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''زندگی میں اکثر 'اہم' فیصلے اسی طرح انجام پذیر ہو جاتے ہیں، زندگی میں رونما ہونے والے حادثے اور کئی واقعات ایسے ہی اچانک زندگی بدل دیتے ہیں بیٹا...... انسان تبدیلیوں کو آخر قبول کرتا ہی ہے۔ تمہاری بی بی جان بھی وقتی طور پر شاید یہ تبدیلی قبول نہ کر پائیں اور برہم ہو جائیں لیکن یہ سب وقتی ہوگا۔ مجھے یقین ہے وہ حقیقت کو جلد ہی قبول کر کے ہمارے اقدام کو سراہیں گی۔

''با......ت تو دراصل تمہاری ہے بیٹا...... پہلے تو تمہارا عملی قدم ضروری ہے اُس کے بعد کسی کے ردِعمل کا سوچا جائے گا۔ تم اپنی رائے اپنا فیصلہ بتاؤ اصم...... اگر تم میرے فیصلے پر متفق ہو تو میں اس اُجڑے ماحول کو بہار بخش دوں۔'' شریح خان اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔ وہ اُسے سوچنے کا موقع دے رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا۔

''بابا جان اُس کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ و معاملہ آناً فاناً طے کرنا چاہ رہے تھے جبکہ اُس نے تو ابھی اپنی شادی کے حوالے سے کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ بی بی جان بے شک اپنے طور پر اپنی کوششوں میں مصروف تھیں اور اُن کی کوششوں پر اُس نے ایک دن مذاق میں اُن سے دل کی بات کہی تھی کہ وہ شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھنا اور ایک بار ملنا چاہے گا پھر شادی کے لیے رضا مندی دے گا اور اب اچانک یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ بھی نئی کشمکش میں گھر گیا تھا۔ بابا جان کے رنج و یاس بھرے چہرے پر اُس کی 'ہاں' سننے کی آس تھی فی الحال اُس کے اندر کوئی جذبہ نہیں تھا صرف اپنے بابا کے موجودہ دکھ پر اُس کا دل بھی کڑھ رہا تھا۔ شریح خان اُس کی خاموشی طویل ہوتے دیکھ کر خود ہی بولنے لگے۔

''میں جانتا ہوں بیٹا یہ فیصلہ کرنا اتنا آسان نہیں ہے اور تمہارے لیے تو اور بھی مشکل ترین ہے کیونکہ تم نے ہمیشہ اپنی بی بی جان کے فیصلے اور باتیں مانی اور قبول کی ہیں، تمہیں یا تمہارے بھائیوں کو کبھی انتہا تک جانے کی ضرورت پیش ہی نہیں آئی لیکن میں تمہیں آج اپنے لیے اچانک پیش آنے والی صورتِ حال میں فیصلہ کرنے کا اختیار دے رہا ہوں۔ تم اپنے ارادوں سے اپنے عمل و فیصلے سے ایک زندگی بچا سکتے ہو ایک خاندان کو خوشیاں دے سکتے ہو۔ تمہارے اختیار میں بہت کچھ ہے بیٹا۔ دنیا بدل دینے کی قدرت و قوت اللہ تعالیٰ نے تمہیں بخشی ہے مرد کی قوتِ ارادی تو اُسے صدیوں کے برابر خلیج پاٹنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ تم سوچ رہے ہو گے آج بابا جان کو کیا ہو گیا ہے۔ یہاں اور بھی لوگ ہیں اُس لڑکی کے سگے رشتے دار بھی موجود ہیں وہ کوئی پیش قدمی نہیں کر رہے ہے اور تمہارے بابا تمہیں ایک جست میں منزل کی آخری حد چھونے کا کہہ رہے ہیں تمہیں یہ ایک انہونی بات لگ رہی ہو گی۔''

اصم نے اپنے دل کی بات اپنے بابا کی زبان سے سن کر انہیں حیرت سے دیکھا، بالکل یہی باتیں اُس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔

''حیران نہ ہو میرے بچے...... دراصل میرے رویے اور فیصلے کے پیچھے ایک 'وجہ' ہے۔ دراصل میرا اور احمد حسن کا درد مشترک ہے جو آج احمد حسن پر بیت رہی ہے۔ وہ آج سے بتیس سال پہلے مجھ پر...... ہما......رے خاندان پر بھی بیت چکی ہے۔'' اصم مزید چونک کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔ آج کا دن اُس کے لیے بہت عجیب اور حیرتناک تھا اُس پر کیا کیا منکشف ہو رہا تھا۔

''شاید! میں کبھی بھی اپنا دکھ اپنا یہ غم کسی سے نہ کہتا مگر آج کے واقعے نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں

تمہیں اپنے دکھ میں شریک کرلوں۔ میرا دکھ سن کر ہی شاید تمہیں احمد حسن اور اُس کی بیٹی کے دکھ کا اندازہ ہو جائے۔''

''با...... باجان آپ کا دکھ......؟ کہ کیا ہوا تھا ہمارے خاندان میں او......ر کس کے ساتھ۔'' اصم کو اپنی آواز اجنبی محسوس ہونے لگی تھی۔

''وہ...... میری چھوٹی بہن اور تمہاری پھوپو زربخت تھیں جن کی زندگی اور خوشیوں پر ایسی ہی بلا حملہ آور ہوئی تھی اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بُرا ہوا تھا...... جانتے ہو؟ عین رخصتی کے وقت ہم پر بھی اُس رزیل انسان کی اصلیت واضح ہوئی تھی۔ وہ شخص بھی شادی شدہ اور بچوں والا تھا۔ اُس کی دھوکا دہی پر ہم سب بھی جوش میں آگئے تھے۔ زربخت کا تو نکاح بھی ہو چکا تھا۔ بہت جتن کر کے زبردستی ہم نے اُسی وقت اُس خبیث کو طلاق دینے پر مجبور کیا تھا اور بارات لوٹا دی تھی اُس کے بعد جانتے ہو کیا ہوا؟ ہماری زربخت کو ہمیں اس دنیا سے ہی رخصت کرنا پڑا تھا۔ صرف ایک دن میں ہی تمہاری پھوپو کو لوگوں کی باتوں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا صرف ایک دن میں ہی تمہاری پھوپو لوگوں سے ہار گئی تھیں۔

''صرف ایک دن میں ہی...... یہ بہت بڑا عذاب ہے اصم، لوگوں کی باتیں دل و روح کو چھید ڈالتی ہیں بظاہر زخم نظر نہیں آتے مگر زیست سسکتی کراہتی رہتی ہے۔ جینے کی خواہش چھین لیتے ہیں یہ لوگ مجبور کر دیتے ہیں اپنا آپ مٹانے پر، بھی تو...... میں۔'' بولتے بولتے شرجیل خان کی آواز رندھ گئی آنکھیں ضبط سے سرخ ہوگئی تھیں اُن کا درد چھلکنے لگا تھا۔

اصم نے ہمیشہ اپنے بابا کو پُرعزم، پُراعتماد اور مضبوط دیکھا تھا اب اس واقعے پر اُن کا اس طرح بکھرنا اُسے تڑپا گیا۔ اُس کے بابا نے کتنا بڑا دکھ اُن سے چھپا رکھا تھا۔ اُس نے آج سارا واقعہ نہ صرف دیکھا تھا بلکہ حالات کی تلخی کو شدت سے محسوس بھی کیا تھا۔ لوگوں کی باتوں نے اُس کی سماعتوں کو بھی مخدوش کیا تھا۔ اپنے ہی اپنوں پر زندگی تنگ کرنے کے درپے تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ آج سے بتیس سال پہلے اُس کے بابا جان اور خاندان پر کیا گزری ہوگی۔ اب سے پہلے کا زمانہ اس سے بھی زیادہ جاہلانہ تھا۔ لوگوں نے اسی طرح اُس کی پھوپو پر زندگی حرام کر دی ہوگی۔ بنا قصور کے وہ کس عذاب سے گزر کر زندگی جیسی انمول نعمت سے منہ موڑ کر موت کی طرف بڑھی ہوں گی۔ یہ سوچ اُسے جھنجھنا گئی تھی۔ اپنے بابا کے دکھ کے ساتھ اسے اب احمد حسن اور اُن کی بیٹی کے دکھ کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ یقیناً وہ لڑکی بھی اُسی عذاب و اذیت سے گزر رہی تھی۔ جس سے گزر کر اُس کی پھوپو موت کو اپنی نجات سمجھ بیٹھی تھیں اور اب یہ لڑکی بھی...... یہ خیال اُسے بھی لرزا گیا۔ اُس کے جذبات ایک اَن دیکھی لڑکی کے لیے بیدار ہو رہے تھے۔ درد کی اس نئی لہر نے اُس کے جذبوں کے ساتھ سوچوں کو بھی متاثر کیا تھا۔

☆......☆......☆

''ضیغم...... تمہارے بابا کے دوست کی بیٹی کی شادی تو دوپہر میں تھی۔ اب شام ڈھل رہی ہے۔ اب تک تو اُن لوگوں کو لوٹ آنا چاہیے تھا۔'' 'بیت الجنت' میں شام کی چائے پر زبیدہ شرجیل خان کے ساتھ بہوؤں کے علاوہ دونوں بیٹے ضیغم اور شارم بھی موجود تھے انہیں چھٹی والے دن سبھی کو اکٹھا دیکھنے کی جو

عادت تھی آج وہ معمول ٹوٹنے کے سبب انہیں کچھ بے چینی و کمی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

''جی بی بی جان آ تو جانا چاہیے تھا۔ مے بی راستے میں ہوں۔'' ضیغم اُن کا بڑا بیٹا نہایت سعادت مندی سے گویا ہوا۔

''بی بی جان آپ پریشان نہ ہوں بابا جان کے ساتھ اصم ہے نا...... دوپہر کو اُس نے وہاں پہنچتے ہی انفارم کیا تھا مجھے...... اب آنے سے پہلے بھی ضرور بتا دے گا۔ اس طرح کے فنکشن میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔'' شارم نے اُن کی بے چینی بھانپتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

''اصم کی وجہ سے ہی تو پریشانی ہے۔ کبھی اس طرح شہر سے باہر گیا نہیں ہے۔ کہا بھی تھا شام سے پہلے لوٹ آئیے گا۔ اچھا تم پھر فون کر کے پوچھو کہ کہاں ہیں؟'' زبدہ خان نے اس بار برملا فکرمندی کا اظہار کیا۔ شارم نے حکم کی تعمیل میں فوراً ہی اپنے موبائل پر نمبر ملایا۔ مگر سگنل نہیں مل رہے تھے۔ دو تین بار کی کوشش کے بعد بھی رابطہ نہ ہو سکا۔ زبدہ خان دیکھ بھی رہی تھیں سمجھ بھی رہی تھیں۔ بیٹے کو خود ہی منع کیا۔

''اچھا ابھی رہنے دو...... ہو سکتا ہے وہ راستے میں ہی ہوں۔''

''بی بی جان...... اصم بھائی کے بغیر تو آج مجھے بھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔'' نیلم جو گھر میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے کچھ لاڈلی تھی، وہ زبدہ خان کے قریب بیٹھ کر اُن کے کندھے پر سر رکھ کر قدرے لاڈ سے بولی۔

''انہوں نے آج مجھے آؤٹنگ کے لیے لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ ابھی تک نہیں آئے...... اب آئیں گے تو تھکن کا بہانہ کریں گے۔''

''بہانہ نہیں وہ واقعی تھک جائے گا اتنے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد...... آتے ہی اُسے تنگ مت کرنا وہ تمہیں پھر کسی دن لے جائے گا۔'' بی بی کی نرمی میں بھی اُن کی اصول پسندی کی جھلک تھی، وہ بیٹیوں کے زیادہ لاڈ اٹھانے کے حق میں نہیں تھیں۔

''ثمن تم ذرا رات کے کھانے کا انتظام کروالینا۔ ڈنر پر تو انشاء اللہ ہم سب ساتھ ہی ہوں گے۔'' بڑی بہو ثمن سے چائے کا کپ تھامتے ہوئے انہوں نے اُسے ہدایت دی۔

''جی بی بی جان آپ بے فکر رہیں اصم اور بابا جان کی پسند کی ڈشز ہی بنوا رہی ہوں۔'' ثمن نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے انہیں اطمینان دلایا۔ ثمن بحیثیت بہو اُن کے دل و نظر میں کافی اہمیت رکھتی تھیں۔ بڑی بہو ہونے کی وجہ سے ثمن نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو احسن طور پر نبھایا تھا۔

''بی بی جان آپ عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں تو ہاجرہ (وچولن) کا فون آیا تھا کہہ رہی تھی کہ نیکسٹ سنڈے وہ اصم کے لیے لڑکی دکھانے لے جائے گی۔ وہی جس کی وہ تصویر لے کر آئی تھی۔ کافی تعریفیں کر رہی تھی کہ کافی کھاتے پیتے لوگ ہیں اور خواہش مند بھی ہیں۔'' سبرینہ بھی اپنے شوہر شارم کو چائے سرو کرتے ہوئے انہیں بتا رہی تھی۔ بی بی جان نے چھوٹی بہو کو نظر اُٹھا کر دیکھا۔

''ہاجرہ سے کہا بھی تھا کہ ہمیں کسی کی دولت و ثروت سے زیادہ شرافت و عزت داری سے غرض ہے۔ لڑکی کا سلیقہ و قرینہ ہمارے لیے ضروری ہے۔ پچھلی بار بھی جہاں لے گئی تھی وہ لوگ تو سلیقے سے ہی نابلد تھے۔ کیا فائدہ ایسی دولت کا جسے برتنے کا قرینہ ہی نہ ہو...... اور ویسے بھی انعم (بڑی بیٹی) کسی لڑکی کو دکھانے کا کہہ رہی تھی اُس کے سسرال میں شاید اُس کی نند کے سسرال سے تعلق رکھتی ہے۔''

''پھر تو پہلے انعم کی بتائی ہوئی لڑکی کو ہی دیکھ لیتے ہیں۔ ہاجرہ کی بات تو ویسے بھی قابل بھروسہ نہیں ہے۔ وہ کہتی کچھ ہے بعد میں نکلتا کچھ ہے۔'' ثمن نے بھی باتوں میں حصہ لیا۔ موضوع پھر بدل گیا تھا۔ اصم کی شادی کا ذکر بھی کے لیے دلچسپی رکھتا تھا۔

''بابا جان...... میں...... مجھے آپ کی خوشی چاہیے۔ آپ جیسا چاہتے ہیں مجھے منظور ہے۔ بس آپ پریشان نہ ہوں۔'' اپنے بابا سے اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے اُن کے کندھوں پر اپنی محبت واعتماد بھرا دباؤ ڈال کر انہیں سچی خوشی فراہم کی۔ اُن کے چہرے پر سچی خوشی کے سارے رنگ اُتر آئے تھے۔

''تھینک یو...... تھینک یو میری جان...... میرے بچے تم نہیں جانتے تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔ تم نے واقعی میرا مان رکھ لیا ہے۔ تم نے جیسے میری زربخت کو موت کے منہ سے نکالا ہے بیٹا۔'' شریح خان نے بیٹے کو بڑھ کر شدت سے چوما۔

''بابا جان پلیز...... اس طرح مت کہیں...... میری زندگی کی ہر خوشی آپ سے ہی منسوب ہے۔''

''بیٹا یہ تمہاری سعادت مندی ہے۔ تمہیں معلوم ہے؟ یہ لڑکیاں یہ بچیاں...... بہت حساس اور چھوٹے دل کی مالک ہوتی ہیں، ہر بات کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ اُن کی زندگی ایک گھر کی تعمیر کے اردگرد سفر کرتی ہے۔ اگر اُن کا یہ خواب کسی طرح مکمل نہ ہو تو پھر یہ خود ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ ہر بات کو گہرائی سے محسوس کرنے کی وجہ سے اکثر اپنا ہی نقصان کر ڈالتی ہیں۔ اُن کی جذباتیت انہیں جان سے گزرنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ کہیں احمد کی بیٹی بھی زربخت کی طرح۔''

''نہیں بابا جان...... اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں خلوص دل سے کہہ رہا ہوں مجھے آپ کا فیصلہ آپ کی خوشی دل سے قبول ہے۔'' اصم خان کے چہرے پر عزم واعتماد اور اطمینان ہلکورے لے رہا تھا۔ شریح خان نے ایک بار پھر بیٹے کو گرمجوشی سے گلے لگا کر اُس کی پیشانی چومی۔

''میرے بچے...... میری جان تم نے یہ احسان مجھ پر کیا ہے۔ میں ساری زندگی اس کا بدلہ نہ چکا سکوں گا بیٹا۔''

''بابا جان...... کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میرا آپ پر کیا احسان؟ آپ مجھے حکم بھی دے سکتے تھے۔ یہ تو ایک نکاح کا معاملہ ہے۔ میں تو آپ پر جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔'' اصم نے قدرے تڑپ کر انہیں ٹوک کر احساس دلایا۔

''شکریہ بیٹا...... اللہ کا بھی لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے مجھے ساری اولاد نیک اور سعادت مند دی ہے۔ اللہ تمہیں اور خوشیوں سے نوازے۔'' انہوں نے اُسے تھپتھپایا۔ اُسی لمحے اصم کا سیل فون بج اٹھا۔ اُس نے جیب سے فون نکال کر دیکھا۔

''بابا جان شارم بھائی کا فون ہے۔'' اصم نے کال ریسو کرنے سے پہلے شریح خان کو بتایا۔

''لاؤ...... میں بات کرتا ہوں۔'' اصم نے سیل فون اُن کی طرف بڑھا دیا۔

''وعلیکم السلام......! بیٹا...... ہم خیریت سے ہیں بچے...... ہاں...... یہاں کچھ مسئلہ ہے۔ تاخیر ہو جائے گی...... ابھی تو نکاح ہونا ہے۔ ہمیں واپسی میں رات ہو جائے گی۔ تم اپنی بی بی جان کو بتا دینا۔ وہ

بالکل بھی فکر نہ کریں۔ ہم انشاء اللہ خیریت سے لوٹ آئیں گے...... اللہ حافظ۔'' شریح خان نے شارم کو تسلی بخش انداز میں اطمینان دلا کر فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

ایک بار پھر اندر باہر ہلچل مچ گئی۔ کسی کو اعتبار ہی نہیں آ رہا تھا۔ اروی کا مقدر اس طرح پلٹا کھا جائے گا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تماشا دیکھنے والوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

احمد حسن اپنے دوست کو ممنونیت کے بھرپور احساس کے ساتھ بار بار گلے لگا کر عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ آج صحیح معنوں میں ایک دوست نے حقِ دوستی ادا کیا تھا۔ ایک دوست نے دوسرے کے دکھ کو نہ صرف محسوس کیا تھا بلکہ اُس دکھ اُس درد کا درماں بھی کیا تھا۔ ماحول میں نئی زندگی کی لہر رواں دواں تھی۔ زہیر بھی اُن کی پذیرائی میں مصروف تھا۔ زہرا، نمرہ اس معجزے پر سجدۂ شکر ادا کر رہی تھیں۔ انہیں تو جیسے موت کے بعد زندگی ملی تھی۔

اروی تک بھی جب یہ خبر پہنچی تو وہ بھی یقین نہ کر سکی۔ لوگوں کی باتوں نے اُسے بھی دلبرداشتہ کر دیا تھا۔ اُس کی سوچیں اور احساسات انتہا تک پہنچ رہے تھے۔ وہ اپنا ہار سنگھار نوچ کر اپنے ہی ماتم میں مصروف اشکبار تھی۔ اُسے یہ سب بھی ایک نیا مذاق نیا تماشہ محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی کیسے اتنا ظرف والا ہو سکتا ہے کہ اُس کی زندگی کو ڈوبنے سے بچا سکتا۔ حتیٰ کہ اُس نے اپنی بے اعتباری کے ساتھ ہی نکاح نامے پر دستخط بھی کر دیے تھے۔ صرف اور صرف اپنی امی اور ابو جی کی خاطر اُس نے زندگی کو نئی سمت کی جانب موڑ دیا تھا۔ وہ مسلسل خوف وہراس میں مبتلا تھی۔

اپنے ابو جی کے حوالے سے اُسے کئی خدشات لاحق تھے۔ اپنی امی کے بینوں نے اُسے سراسیمہ کر دیا تھا۔ اُسے واقعی لگنے لگا تھا کہ اُس کی نحوست کے سائے نے اُس کے سارے گھر کو نگل لینا تھا۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ نرمین بار بار اُسے اُس احساس سے نکالنے کے لیے اُسے یقین دلا رہی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں اروی...... یہ بالکل حقیقت ہے۔ تمہاری زندگی سے وہ بُرا پل گزر گیا ہے۔ یو آر ویری لکی...... تمہارا دولہا بہت ہینڈسم اور گڈلکنگ ویری ڈیشنگ پرسنالٹی ہے۔ رئیلی بہت کم لوگ ایسے ہوتے نائس اور سوفٹ ہارٹیڈ...... یار تمہاری تو قسمت کھل گئی بلکہ سمجھو تمہاری لاٹری کھل گئی۔ بیٹھے بیٹھائے اتنا پیارا بندہ مل گیا ہے تمہیں۔'' نرمین کے لہجے میں گرمجوشی بھی تھی اور اپنائیت بھی۔ وہ چاہ رہی تھی اروی جلد از جلد اپنی افسردگی سے نکل آئے۔

''قسمت...... مقدر......؟ ابھی کچھ دیر پہلے اسی قسمت کو کوسا جا رہا تھا۔ میرے مقدر کی خرابی کا رونا رویا جا رہا تھا۔ بددعائیں دی جا رہی تھیں۔ میری بدقسمتی پر مجھے زندہ درگور کیا جا رہا تھا۔ مجھ پر زندگی کی ہر خوشی حرام قرار دی جا رہی تھی اور ا...... ب...... اب پھر میری قسمت کا ہی چرچہ ہے۔ واہ رے نصیب۔'' اروی تلخ ہو کر پھر سے رو پڑی۔

''بس کرو اروی...... کوئی الٹی سیدھی بات مت سوچو۔ دنیا کو چھوڑو۔ خدا نے اس عمل میں بھی کوئی مصلحت ہی رکھی تھی۔ تمہارا رشتہ اسی طرح ٹوٹنا اور پھر اصم خان سے جڑنا اوپر لکھا گیا تھا۔ یہ سب روزِ اول سے طے پایا ہوگا تبھی اسی طرح ہوا۔ اللہ پر ایمان ہے نا کہ وہ جو کرتا ہے ہمارے بھلے کے لیے کرتا ہے۔ تم

اُس کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تمہیں بہت کم وقت تکلیف میں رکھ کر اتنا بڑا انعام بخشا ہے۔ لوگوں کی تو عمریں گزر جاتی ہیں آزمائشوں سے گزرتے۔

''اچھا اب تم یہ رونا دھونا چھوڑو اور ہنسی خوشی اپنے سسرال سدھارو۔'' زمین نے بہت رسانیت سے اُسے سمجھایا۔ پھر اُسے ہنسانے کے لیے چھیڑا۔

''اور سنو...... تم اپنی ان خوفزدہ ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھوں کو مزید مت پھیلانا۔ کہیں پہلی نظریں ہی تم سے اصم بھائی ڈر جائیں اور سین الٹ ہو جائے، یعنی دولہا صاحب بے ہوش ہو جائیں اور تم......''

زمین اپنی کوششیں میں کامیاب ہوگئی تھی۔ صاف شفاف مسکراہٹ اُس کے چہرے کے ساتھ آنکھوں سے بھی چھلکی تھی۔

''بس ایسے ہی ہنستے رہنا، میری طرح تمہارے سسرال والے بھی تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔''

زمین نے اُسے اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے اُس کا ناقدانہ جائزہ لیا۔

''تم نے تو اپنا سارا میک اپ ہی آنسوؤں سے دھو ڈالا ہے۔ چلو بیٹھو میں تمہیں پھر سے تیار کر دوں۔''

''نہ...... ہی...... نرمی...... ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ تم بس یہ دوپٹہ سیٹ کر دو۔''

''اروی...... تم دلہن ہو؟ اس طرح اینٹری دو گی سسرال میں۔'' نرمی سے خفگی سے پوچھا۔

''نر...... مین...... نجانے کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' اروی نے عروسی دوپٹہ پن اپ کرتی زمین کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کیفیت کا اظہار کیا۔ زمین نے اُس کے وجود کی لرزش محسوس کر کے اُسے کندھوں سے تھام کر بستر پر بٹھا دیا۔ کمرے میں اس وقت دونوں تھیں۔ باقی سبھی لوگ اصم کے گرد جمع تھے۔

''کیوں ڈر لگ رہا ہے؟ اب ڈرنے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ سب معاملہ تو سیٹ ہو گیا ہے۔''

''نرمی...... یہ لوگ بھی نجانے کیسے ہوں گے۔ میں سوچتی ہوں 'اُن' کے گھر والے نجانے میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ اُن کے رشتے دار بھی تو ہوں گے۔ وہ سب بھی ایسی شا...... دی پر باتیں بنائیں گے اور 'وہ' بھی ایسی شادی ہونے پر دل سے راضی ہوئے ہوں گے یا مجبوری۔''

اروی کا خوف اپنی جگہ درست تھا۔ پھر بھی زمین نے اُسے تسلی دیتے ہوئے ذرا ڈپٹ کر اُس کا خوف ختم کرنا چاہا۔

''کیا فضول باتیں سوچ رہی ہو۔ اچھے لوگ ہیں تبھی تو تمہیں اپنایا ہے اور تمہارے سسر انکل احمد کے گہرے دوست ہیں، اپنی مرضی اور خواہش سے شادی کر کے لے جا رہے ہیں۔''

''مجھے اُمید ہے تم بہت خوش رہو گی۔ تھوڑا بہت برداشت کرنا بھی پڑا تو خاموشی سے کر لینا۔ پھر بھی اگر تمہاری تسلی نہیں ہو رہی تو اصم بھائی کو اِدھر بلوانے کا انتظام کر لیتی ہوں۔ تم کر لو اپنی تسلی...... لے لو اُن سے قول و قرار۔''

''شٹ اپ......'' اروی نے اُسے خفگی سے گھورا۔ دل میں اصم کا نام سنتے ہی ایک نیا جلترنگ سا بجا تھا۔ ایک نیا احساس اُس میں جاگا تھا۔ نکاح کے چار بول زندگی کا مفہوم بدل دیتے ہیں اُسے اب علم ہو رہا تھا۔

''چلو آؤ...... ایک نظر ہی دیکھ لو۔'' زمین نے پھر شرارت سے کہا تو جھینپ کر نفی میں سر ہلایا۔

''ہاں...... ایک نظر سے بھی کہاں سیری ہوگی۔ وہ تو گھنٹوں دیکھنے کی چیز ہیں...... خیر تم تو اب ساری عمر انہیں ہی دیکھو گی اور دیکھتی رہ جاؤ گی...... کیوں؟''

نرمین اپنی شرارتوں اور باتوں سے اُس کا موڈ بدلنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔ ارویٰ بھی اب اپنی نئی زندگی اور آنے والے وقت کو قدرے خوشگواری سے سوچ رہی تھی۔ نئے بننے والے رشتوں کے حوالے سے اُس کے ذہن و دل میں محبت بھرا احساس اُٹھ رہا تھا۔ اُسے اپنے تلخ ماضی کو آخر فراموش کرنا ہی تھا۔ اسی میں اُس کی بہتری اور اُس کے گھر والوں کی عزت تھی۔

☆......☆......☆

''سنو اروی...... ہم نے تمہاری تربیت جس طرح کی ہے اُس پر ہمیں اعتماد ہی نہیں مان بھی ہے بیٹا...... ہماری عزت اب تمہارے ہاتھ ہے۔ تم بہت بڑے گھر میں جا رہی ہو...... وہاں کا رہن سہن بھی تمہارے لیے نیا ہوگا۔ بہت کچھ انجانا ہوگا۔ تمہیں بہت سمجھداری سے وہاں رہنا ہے۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دینا۔''

زہرا احمد وقتِ رخصت بیٹی کو نصیحت کر رہی تھیں۔ ایک بار پھر بھی رونے دھونے میں مصروف تھے۔ مگر اس بار رونے میں کراہ نہیں بلکہ شکر گزاری کا احساس پوشیدہ تھا۔ اپنے فرض کی ادائیگی پر اروی کے اپنوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

اروی بھی زبان سے نہیں اپنے اشکوں سے اظہارِ تجدید کر رہی تھی اُسی لمحے احمد حسن کے ساتھ شریح خان کے ساتھ رہائشی حصے میں آ گئے۔

''بس بھابی جی، اب تو رونا بند کیجیے اور ہمیں اپنی امانت لے جانے کی اجازت دیجیے۔'' شریح خان نے سیاہ چادر اوڑھے کھڑی اروی کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا۔

''شریح اجازت کیسی اب تو اس پر تمہارا ہی حق ہے۔'' احمد حسن مسلسل احساس شکر گزاری میں تھے۔

''بالکل...... اب تو یہ تمہاری نہیں میری بیٹی ہوگئی ہے اور اب اس کے لیے کسی کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے گھر میں اسے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ چلو بیٹا جان۔'' شریح خان نے اُسے اپنے بازو کے حصار میں لیا۔

''بھائی جان...... کہنا تو نہیں چاہیے مگر پھر بھی ایک التجا ہے۔ یہ ابھی بچی ہے۔ اس سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو اسے معاف کر دینا۔''

''یہ واقعی کہنے کی بات نہیں ہے۔ یہ میری بچی بھی ہے، کہا تو ہے آپ بالکل فکر نہ کریں اور میں احمد کو پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ جہیز کے نام پر ہمارے ساتھ کچھ نہیں جائے گا۔ سوائے بیٹی کے چند ایک کپڑوں کے جوڑوں کے...... آپ پلیز میری بات کا برا مت مانیے گا اور وہ سامان آپ ہماری چھوٹی بیٹی کے لیے رکھ لیں...... اصم بھی یہی چاہتا ہے۔''

شریح خان نے زہیر کے ساتھ ایک دو لڑکوں کو سامان (جہیز کا) باہر لے جاتے دیکھ کر ٹوکا۔ اروی کو گھونگھٹ کے اندر بھی یہ باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ ابو جی اور امی جی کی چاہت سے بنائی چیزوں کو نہ لے جانے کا اُسے قلق تو تھا مگر اس مقام پر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

احمد حسن نے اروی کو اپنے دوست شریح خان اور داماد اسم خان کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔ احمد حسن اپنے دوست پر نازاں تھے۔ جنہوں نے اُن کی بیٹی کو اندھیروں سے بچا کر روشنی کی پناہ دی تھی۔ ایک نئے مقام نئی حیثیت کے ساتھ صرف وہ ہی نہیں اُن کی بیٹی بھی سرخرو ہوئی تھی۔

دن بھر کی کٹھن صورتِ حال سہنے کے بعد انہیں سکھ کی سانس آئی تھی۔ سبھی رشتے دار تو چلے گئے تھے۔ نمرہ اور پھوپو سکینہ البتہ ابھی تک موجود تھیں۔ اور پھوپو سکینہ کو ابھی تک...... اروی کی شادی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔

''احمد حسن تمھیں بھروسہ ہے نا اپنے دوست پر؟ بھئی ایسا تو نہیں اپنی واہ واہ کرانے کے لیے وہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر ابھی تو اروی کو لے گیا بعد میں کہیں۔''

''اللہ نہ کرے آپا...... آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں وہ بھی اپنی بھتیجی کے لیے۔'' زہرا نے تڑپ کر اُن کی بات کاٹی۔ احمد حسن انہیں بس دیکھ کر رہ گئے۔

بڑی بہن کے سامنے زبان کھولنے کی، اُن میں کبھی ہمت نہیں رہی تھی اور جب سے بیوہ ہوئی تھیں تب سے تو وہ چپ ہی سادھے رکھتے تھے۔ مبادا اُن کی کسی بات سے دکھی بہن کا دل نہ دکھ جائے خواہ وہ انہیں جتنا چاہے دکھ دیتی رہیں۔

''مجھے معلوم ہے میں کیا کہہ رہی ہوں۔ دنیا کے چلن کے حساب سے بتا رہی ہوں۔ اس زمانے میں اتنا اچھا کون ہوتا ہے کہ اس طرح ہماری لڑکی بیاہ کر لے گیا۔ آخر کو اُس کی بھی تو برادری ہوگی۔ احمد کا دوست جب خاندان میں جا کر اعلان کرے گا تو کیا سمجھو ہو۔ لوگ ایسے ہی یہ بات ہضم کر لیں گے۔ مانو کہ اُس کی نیکی لوگوں کی سمجھ میں آ بھی گئی تو کیا خبر ہماری لڑکی کو دل سے قبول بھی کیا جاتا ہے۔''

''آپا...... میں نے بیٹی اللہ کے حوالے کر دی ہے اب اللہ کی جو مرضی ہو...... مجھے تو اطمینان ہے کہ میری بیٹی عزت سے لے جائی گئی ہے تو اُسی طرح رکھی بھی جائے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' آخر احمد حسن کو ہی زبان کھولنی پڑی۔ بہن کو خاموش کروانے کا یہی طریقہ تھا۔ وہ ایسے موقع پر بھائیوں کے بعد اب بہن کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''اللہ تمہارا اطمینان برقرار رکھے۔ بہن ہوں تمہاری دشمن تو نہیں ہوں۔ پھر بھی دھیان رکھنا۔ بیٹی بڑے گھر میں بھیجی ہے، خبر گیری کرتے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ دوست کی مالداری سے رعب میں آ کر بیٹی کا پیچھا ہی چھوڑ دو۔''

''اچھا آپا...... میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔ آپ چل کر آرام کریں۔'' زہرا نے آپ کا بستر لگا دیا ہے۔

''صبح سے بے آرام ہیں۔'' احمد حسن نے بیوی کو اشارے سے خاموش رہنے کے لیے کہا اور خود اپنی بہن کو اپنے حساب سے موڑا...... زہرا خود بھی جانتی تھیں کہ اُس وقت انہیں چھیڑنے کا مطلب اپنے لیے بددعائیں سمیٹنا تھا۔ سو خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئیں۔ البتہ پھوپو سکینہ کی باتوں سے اُن کے دل میں بھی خدشے سرا ٹھانے لگے تھے۔

(اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہِ ستمبر میں ملاحظہ فرمائیں)

افسانہ

ماریہ یاسر

پیار ایک بار

''چلو آؤ اُس ٹیبل پر جا کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں سے دولہا دلہن قریب سے نظر آئیں گے۔'' اُس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ''حد ہے یار بالکل بچی ہو اتنا ہی شوق ہے دولہا دلہن کو دیکھنے کا تو جاؤ جا کے پہلے مل آؤ ناں اُن سے۔'' مومن کو حیرانگی ہوئی۔ ''مل کے تو.....

شک ایک ایسا بیج ہے جو اگر محبت کی سرزمین پر بو دیا جائے تو چاہے وہ زمین کتنی بھی سرسبز و شاداب کیوں نہ ہو، تھوڑے ہی عرصے میں بنجر و ناکارہ ہو جاتی ہے اور غلط فہمیوں سے یہ بیج دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے پھر اگر وقت پر اُس کی کٹائی نہ کی جائے تو تباہی و بربادی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

ایسا ہی ایک بیج مومن کے دل میں بھی بونے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوشش اور کسی نے نہیں بلکہ اُس کی کزن اور بچپن کی راز دار حریمہ صدیقی نے کی جو اُس کی چاہت میں غلط اور درست کے فرق کو بھلائے بیٹھی تھی۔

☆......☆......☆

یار حریمہ تم ایک بار کوشش تو کرو ناں، کیا پتہ یہ تمہاری غلط فہمی ہو، دیکھو تم وفا کو بتاؤ کہ میں اُس سے کتنا پیار کرتا ہوں اور اُس کے بغیر نہیں رہ سکتا، تمہیں تو سب پتہ ہے ناں' تم ایک کوشش تو کرو پلیز یار پلیز پلیز پلیز...... میری اچھی دوست نہیں ہو کیا، بلکہ تم ایسا کرو کہ کسی بھی طرح میری اُس سے ملاقات ارینج کروا دو، میں خود ہی اُسے کنوینس کر لوں گا۔ بے تابی اُس کے ایک ایک لفظ سے جھلک رہی تھی۔

مومن کتنی بار بولوں کہ وہ اپنی یونیورسٹی کے کسی لڑکے میں انوالو ہے، میں نے اُس سے بات کی تھی لیکن وہ تمہیں پسند نہیں کرتی، ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ اُس نے مومن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ایسا مت کہو حریمہ دیکھو میں اُس کے بغیر مر جاؤں گا، تم مجھے اُس کا فون نمبر ہی دے دو یار میں ایک بار خود اُس سے بات کرنا چاہتا ہوں نہیں تو میں اُس کے گھر پہنچ جاؤں گا۔ اُس نے دونوں مٹھیوں میں اپنے بال جکڑے۔

او کے او کے ریلیکس مومی میں اُس سے ایک بار پھر بات کرتی ہوں۔'' اُس نے زخمی دل سے کہا۔

''وعدہ کرو مجھ سے کہ تم اپنی طرف سے پوری

کوشش کروں گی اُسے میری محبت کے بارے میں بتانے کی۔ ایسا کہ مجھے بھی ساتھ لے جاؤ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں اُس کے پاس۔'' اُس کے دل کو کسی صورت اطمینان نہ آ رہا تھا۔

''مومی میں نے تمہیں بولا ناں کہ میں بات کروں گی اور تم ایسا بے ہیو بھی مت کرو جیسے وہ دنیا کی آخری لڑکی ہو۔'' اب کے وہ جھنجلا گئی۔

''یہ تو تم میرے دل سے پوچھو کہ وہ میرے لیے کیا ہے۔ دنیا کی پہلی اور آخری لڑکی۔'' وہ جیسے کسی خواب کے زیرِ اثر بولا تو حریمہ اپنے آنسو چھپانے کے لیے رخ موڑ گئی۔

☆......☆......☆

''مومن'' حیدر اقبال اور رازیہ کا اکلوتا بیٹا تھا جو شادی کے 4 سال بعد بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا، روپے پیسے کی کبھی کمی نہ ہوئی اس لیے مومن کے منہ سے نکلا ہر لفظ اور ہر فرمائش

ہمیشہ پوری کی گئی۔ لیکن لاڈ پیار نے اسے بگڑنے نہ دیا۔ ہمیشہ ہر کلاس میں فرسٹ آنا تو جیسے اُس کے نام لکھا جا چکا تھا۔ اپنے گھر میں اکلوتے ہونے کی وجہ سے وہ اپنی چچازاد حریمہ سے کافی قریب ہوگیا جو اُس سے 2 سال چھوٹی تھی۔ دونوں کی دوستی خاندان بھر میں مشہور تھی۔ حریمہ کی 2 بڑی بہنیں مناہل اور موول تھیں جو شادی شدہ تھیں۔ بچپن کی دوستی بڑھتے بڑھتے حریمہ کے دل میں محبت کے پھول کھلا چکی تھی اور جب اُس نے سوچا کہ مومن کو آگاہ کیا جائے تو اُس سے پہلے ہی مومن نے ایسا دھماکا کیا جو حریمہ کی برداشت سے باہر تھا۔

وفا جو حریمہ کی ماموں زاد تھی نجانے کب سے مومن کے دل پر قبضہ جما چکی تھی اس کا اُسے اندازہ بھی نہ تھا لیکن جب مومن کے منہ سے وفا کا سنا تو اُس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ وفا کو کچا چبا جائے، لیکن اُسے خود پر کنٹرول رکھنا پڑا۔ اُس نے خود کو بظاہر نارمل رکھا لیکن اُس کے دل میں وفا کے لیے نفرت بھڑک چکی تھی۔ اُس نے ایسا منصوبہ سوچا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

☆......☆......☆

کیا ہو رہا ہے بھئی کیا سوچا جا رہا ہے یوں اکیلے بیٹھے بیٹھے۔ اُس نے وفا کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گئی۔

''ارے حریمہ تم کب آئی؟'' اُس نے محبت سے اپنی پیاری سی کزن کی طرف دیکھا۔

''جب تم کسی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی اب بتاؤ کہ کس کو سوچا جا رہا تھا۔'' اُس نے لہجے کو بشاش بنانے کی کوشش کی۔

''کچھ نہیں یار میں نے کس کو سوچنا ہے بس یونہی دل اُداس ہے۔ تم بتاؤ آج کیسے یاد کرلیا ہم غریبوں کو۔'' وفا نے خوش مزاجی سے کہا تو وہ اُس کے اور نزدیک چلی آئی۔

''وہ اصل میں یار مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے سمجھ لو کہ میرے جینے مرنے کی بات ہے،'' وہ اصل مدعے پر آئی۔

''ہاں ہاں بولو ایسی کیا بات ہے کہ تم یوں بول رہی ہو۔'' اُس کی آنکھوں میں تشویش کی جھلک نظر آنے لگی۔

''پہلے وعدہ کرو کہ تم یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گی اور دوسرا وعدہ کرو کہ تم میری بات ضرور مانو گی۔'' اُس نے خود غرضی سے کہا۔

''ہاں ہاں حریمہ بولو میں اپنی سویٹ سی دوست اور کزن کے لیے حاضر ہوں۔ تم بلا جھجک بولو۔'' اُس نے اپنے ماتھے پر آئے بالوں کو ہولے سے پیچھے کیا۔

''وہ اصل میں بات یہ ہے کہ......'' وہ کہہ کر خاموش ہوگئی اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کیسے شروع کرے۔

''بولو ناں کیا ہوا۔'' اُس نے اپنا ہاتھ حریمہ کے ہاتھ پر رکھ دیا تو اُسے حوصلہ ہوا۔

''اچھا دیکھو تم میری بات سن کر ناراض مت ہونا۔'' اُسے ڈر لگنے لگا۔

''نہیں ہوتی ناراض تم اب بولو ناں۔'' وفا کو بے چینی ہونے لگی۔

''وہ یار بات اصل میں یہ ہے کہ میں مومن سے پیار کرتی ہوں بہت زیادہ اور اُس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' اُس نے وفا کی آنکھوں میں جھانکا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے اِس بات پر تم اتنا ڈر رہی تھی کمال ہو تم بھی۔'' وفا حیران ہوئی۔

"وفا بات صرف اتنی سی نہیں ہے کچھ اور بھی کہنا ہے مجھے۔" اُس نے تھوک نگلا۔
"وہ یار میں مومن سے بہت پیار کرتی ہوں لیکن وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے۔ تو میں نے اُسے بول دیا کہ تم اپنے کسی یونیورسٹی کے فیلو میں انٹرسٹڈ ہو اب وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے تو میں چاہتی ہوں کہ تم بھی وہی بولو جو میں نے کہا۔" اُس نے ایک ہی سانس میں سب کہہ کر نظریں جھکا لیں گویا اندازہ ہو کہ جو وہ کر رہی ہے ٹھیک نہیں ہے۔
"یہ کیا بول رہی ہو، ایسا کیسے کہہ دیا تم نے میرے بارے میں، یار یہ تو غلط ہے ناں۔" وفا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کے بچپن کی سہیلی اُس کے بارے میں اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔
"یار ایسا بولنا بہت ضروری تھا ورنہ مومن مان نہیں رہا تھا اور وفا دیکھو پلیز تم میری فیلنگز سمجھنے کی کوشش کرو دیکھو میں اُس سے بہت پیار کرتی ہوں اور اُس کے بغیر نہیں رہ سکتی اس لیے اُس کو پانے کے لیے میں نے یہ جھوٹ بولا ہے، تم تو اُس کو پسند نہیں کرتی ناں اس لیے تمہیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر تمہاری اُس کے ساتھ شادی نہ ہو تب بھی لیکن یار میں اُس کے بغیر مر جاؤں گی۔ اس لیے پلیز میرا ساتھ دو وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے تم اُسے بول دو کہ تم کسی اور کو پسند کرتی ہو۔" حریمہ کی بات سُن کر اُس کی نظروں کے سامنے مومن کا سراپا گھوم گیا۔
جب شادی کی ایک تقریب میں وہ اُس کے سامنے موجود تھا، ڈارک براؤن تھری پیس میں ہلکی ہلکی داڑھی اونچا لمبا مومن جیسے خوابوں کا شہزادہ ہو۔
کھنکتا لہجہ اور آنکھوں میں شرارتی سی چمک اُسے باقی سب سے ممتاز بنا رہی تھی۔ وہ تھا ہی ایسا کہ جہاں جاتا ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتا۔ اُس کے ساتھ کی تو لڑکیاں دعا مانگتیں تھیں اور آج جب قسمت اُس پر مہربان ہونے کو آئی تو حریمہ بول رہی ہے کہ مجھے کوئی اثر نہیں پڑے گا اگر میری اُس سے شادی نہ ہو تب بھی، یہ کیسا دوراہا ہے یا خدا بے شک میں نے اُسے کبھی بھی باقاعدہ اپنے خوابوں میں نہیں بسایا کیونکہ میں نے خود کو اُس شہزادے کے قابل کبھی بھی نہیں سمجھا لیکن ایک اچھے شریکِ حیات کی آرزو تو سب کو ہی ہوتی ہے ناں سو مجھے بھی ہے اور اگر شریکِ حیات مومن ہو تو گویا خوابوں کو حقیقت مل جائے، لیکن یہ کیسی بے بسی ہے کہ حریمہ کے سامنے اپنی بات نہیں رکھ سکتی تھی۔
"بولو ناں وفا میرے لیے یہ کام کرو گی، دیکھو اب تمہارے ہاتھ میں ہے میری خوشی تم چاہو تو مجھے زندگی بھر کی خوشی دے دو اور چاہو تو زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین لو، اب یہ تمہارا فیصلہ ہوگا۔ اُس نے اپنے دل کی دھڑکن واضح سنی۔
"وفا پلیز مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے دو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ وہ اُس کے پاؤں میں جھکنے ہی لگی تھی کہ وفا نے اُسے پکڑ کے اپنے گلے لگا لیا۔
"یہ کیا کر رہی ہو تم۔ بہنیں ایک دوسرے کے پاؤں میں نہیں پڑتیں۔"
تم بے فکر ہو جاؤ جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا، مومن تمہیں مبارک ہو۔ اس نے کس دل سے کہا یہ وہ ہی جانتی تھی۔ آنسو اُس کے دل پر گر رہے تھے۔
"کیا واقعی تم سچ کہہ رہی ہو تھینک یو سو مچ، بہت شکریہ یہ تمہارا او فا تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے

مجھ پر۔'' وہ اُس کے گلے لگ کے رو رہی تھی اور وفا اپنے اندر گرتے آنسوؤں سے نگاہیں چرا کے اُسے چپ کرا رہی تھی۔

☆......☆......☆

''دیکھیں مومن میں نے آپ کے بارے میں کبھی بھی اِس طرح نہیں سوچا ایکچوئلی میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں پلیز آپ مجھے فورس مت کیجیے گا۔'' اُس نے نگاہیں چراتے کہا تو مومن اپنی سی کوشش کرنے کے بعد ناکام و نامراد لوٹ آیا۔ لیکن اُس دن کے بعد سے اُسے چپ لگ گئی وہ جو ہر وقت ہنستا مسکراتا اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا اب یوں خاموش ہو گیا گویا کہنے کو کچھ باقی بچا ہی نہ ہو، حیدر اور رازیہ بھی پوچھ پوچھ کے تھک گئے لیکن اُس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا دیا اور اسی گھر کے اوپر والے پورشن سے حریمہ بھاگ بھاگ کے اُس کے پاس پہنچتی لیکن اُس کی چپ نہ ٹوٹی۔ وہ سارا سارا دن اُس کا دل بہلانے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہتی۔ لیکن وہ تو جیسے ہر چیز سے لاپرواہ ہو چکا تھا۔ دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا، وہ جو سوچ رہا تھا کہ وفا نے انکار کیا تو وہ جی نہیں پائے گا لیکن وہ جی تو رہا تھا لیکن اپنی خوشی سے نہیں، بس اپنوں کی خاطر دن رات کاٹ رہا تھا۔

☆......☆......☆

یا اللہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا ایسا، کیا کمی ہے مجھ میں جو اُس نے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اُس نے کوئی خواہش کی ہو اور وہ ادھوری رہ گئی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا جب اچانک اُس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ لیکن اُسے پتہ ہی نہ چلا جب حریمہ نے اُس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تو ہوش میں آیا۔

''مومن اب بس بھی کرو کیا ہو گیا ہے تمہیں، آئینہ دیکھا ہے کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا خود کو سنبھالو، اتنے دن سے جاب پر بھی نہیں جا رہے، کب تک چلے گا ایسا اُس کے انکار سے دنیا ختم تو نہیں ہو گئی ناں۔'' وہ اُس کے بکھرے حلیے سے پریشان ہو گئی تھی۔

''کیوں کیا ہو گیا ہے میرے حلیے کو، ٹھیک تو ہوں اور چلا جاؤں گا جاب پر بھی۔'' اُس نے لاپرواہی سے کہا۔

''اچھا چلو اٹھو مجھے آئس کریم کھلا کے لاؤ۔ بہت ہو گیا تمہارا سوگ، اب اٹھو چلو جلدی سے۔'' اُس نے مومن کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور اُس کے ناں ناں کرنے کے باوجود بھی اُس کو لے کر ہی گئی۔

''اب دوبارہ میں تمہیں کمرے میں اُداس لیٹے نہ دیکھوں او کے، اپنے لیے نہ سہی تو ہم سب کے لیے ہی اُسے بھول جاؤ، تم کوشش کرو گے تو دیکھنا پھر پہلے جیسے ہو جاؤ گے اور مجھے وہی اپنا دوست چاہیے جس سے میں اپنی ہر بات شیئر کر سکوں۔'' اُس نے دوستانہ لہجے میں کہتے ہوئے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تو وہ بھی سر اثبات میں ہلا کر مسکرا دیا۔

''او کے میں کوشش تو کر رہا ہوں اُسے بھولنے کی۔'' اُس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تو حریمہ نے شکر کیا کہ پچھلے ایک مہینے سے اُس پر چڑھے اُداسی کے خول کو اتارنے میں کامیاب تو ہوئی۔

☆......☆......☆

''تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے، ٹائم دیکھا ہے کیا ہو رہا ہے، چلو جلدی کرو فوراً تیار ہو کے

آ جاؤ۔'' وہ اُسے حکم دے کے باہر نکلنے ہی والی تھی کہ دوبارہ واپس مڑی۔

''مومن چلو ناں تیار ہو جاؤ فوراً ساڑھے 9 تو ہو رہے جلدی سے نکلیں۔'' اُس نے مومن کو اُسی حالت میں لیٹے دیکھا تو دوبارہ بول پڑی۔

''نہیں یار میں نہیں جا رہا تم باقی سب کے ساتھ چلی جاؤ۔'' اُس نے موندھی آنکھوں کو ذرا سا کھول کے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں کچھ نہیں سن رہی تم چل رہے ہو تو مطلب چل رہے ہو۔'' اُس نے ضدی لہجے میں کہتے ہوئے بریسلیٹ اپنی کلائی میں باندھا۔

''میں بہت تھکا ہوا ہوں آج آفس میں بہت کام تھا مجھے رہنے دو۔'' اُس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''تمہارے پاس صرف 5 منٹ ہیں تیار ہونے کو۔'' کہہ کر وہ رُکی نہیں تو مومن بھی فوراً کھڑا ہو گیا کیونکہ وہ اپنی دوست کو اچھی طرح جانتا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ 5 منٹ بعد اُس کو اُسی حلیے میں لے جائے، اُس سے کچھ بھی امید رکھی جاسکتی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے تیار ہونے لگا اور ٹھیک 5 منٹ میں حریمہ کے ساتھ خاندان کی شادی میں جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

''چلو آؤ اُس ٹیبل پر جا کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں سے دولہا دلہن قریب سے نظر آئیں گے۔'' اُس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

''حد ہے یار بالکل بچی ہو اتنا ہی شوق ہے دولہا دلہن کو دیکھنے کا تو جاؤ جا کے پہلے مل آؤ ناں اُن سے۔'' مومن کو حیرانگی ہوئی۔

''مل کے تو میں آ گئی ہوں بس پھر بھی اُس ٹیبل پر بیٹھتے ہیں ناں چلو......'' وہ اُس کو کھینچ کے اپنی مرضی کی ٹیبل پر لے گئی۔

''ارے وفا تم بھی آئی ہوئی ہو۔ یہاں آؤ ہمارے ساتھ بیٹھو، اُس کی نظر سامنے کھڑی وفا پر پڑی تو چونک گئی۔ لیکن اگلے ہی پل اُسے اپنے پاس بیٹھنے کا بولنے لگی تو مومن کو جھٹکا لگا۔ لیکن اُس نے جلد ہی خود پر قابو پالیا۔

''کیسی ہیں آپ۔'' مومن نے خود کو نارمل کرتے ہوئے سامنے کی کرسی پر بیٹھی وفا سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اُس نے مبہم سے انداز میں کہا اور نظریں جھکا لیں۔

''حریمہ میں آتا ہوں۔'' مومن کہہ کر اُٹھ گیا تو وہ وفا سے باتوں میں مشغول ہو گئی۔ دور کھڑے مومن کی نظر بار بار اُس دشمن جان پر چلی جاتی تو واپس پلٹنا بھول جاتی، لائٹ پنک ایمبرائیڈری سوٹ، کھلے بال، میک اپ سے عاری چہرہ، کلائی میں پنک چوڑیاں اور پاؤں میں نازک سی جوتی، یہ اُس کی مکمل تیاری تھی۔ اس کے باوجود وہ ہال میں سب سے نمایاں تھی۔ مومن کی نظر بھی بار بار اُس کا طواف کرتی رہیں۔ آخر کچھ دیر بعد اُس نے دل کو ڈپٹتے ہوئے گھر کی راہ لی۔

اور گھر آ کے وہ مومن پر ناراض ہوتی رہی اُس کے یوں بغیر بتائے چلے آنے پر لیکن وہ خاموش رہا۔

☆......☆......☆

زندگی میں بعض اوقات ایسے مقام بھی آتے ہیں جب انسان کی کوئی بہت دیرینہ خواہش پوری ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے۔ اُس کی زندگی میں بھی ایسا ہی وقت آیا اور آ کے ٹھہر گیا، اُسے تو کم سے کم ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ جو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ نوکری ملتے ہی وہ اپنی آرزو کو پایہ تکمیل تک پہنچا لے گا، اُسے یہ گمان تھا کہ یہ کام یوں چٹکی

بجاتے ہی ہو جائے گا۔ وہ اپنے ماں باپ کو رشتے کے لیے وفا کے گھر بھیجے گا اور وہاں سے فوراً جھٹ پٹ ہاں ہو جائے گی۔ کیونکہ اُس میں ایسی کوئی خامی یا کمی یا کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی بنا پر وفا کی فیملی اُسے ریجیکٹ کرتی۔ اُسے تو یہی لگتا تھا لیکن ضروری تو نہیں کہ انسان جو سوچے یا جس کی خواہش کرے ویسا ہی ہو۔

مومن حیدر کو اپنی سوچ پہ ہنسی آرہی تھی کہ کیسے اُسے خود پر بھروسہ تھا کہ اُسے کوئی ریجیکٹ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ شکل وصورت تعلیم خاندان وہ ہر لحاظ سے اچھا تھا، اِس لیے اُسے مکمل بھروسہ اور اطمینان تھا، لیکن وفا نے اُس کا سارا بھروسہ سارا اطمینان سب خاک میں ملا دیا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا جب اُس نے اپنی محبت سے سنا کہ وہ تو کسی اور سے پیار کرتی ہے، اُس کے دل نے چاہا کہ کوئی ایسی چیز ہوتی اُس کے پاس جس سے وہ وفا کے دماغ و دل دونوں سے اُس کے پیار کا نام مٹا کے اپنا نام لکھ دیتا اور اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس لے آتا، لیکن ایسا اب ممکن نہ رہا۔

''کیا ہو رہا ہے جناب۔'' ابھی وہ اپنی سوچوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا کہ کہیں دور سے حریمہ کی آواز آئی۔ اُس نے غائب دماغ سے یہاں وہاں نگاہیں دوڑائی تو سامنے مسکراتی حریمہ پر نگاہ پڑتے اُسے سمجھ آئی کہ وہ آواز تو یہیں سامنے سے آئی تھی دور تو وہ خود نکل گیا تھا سوچوں میں۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی۔'' اُس نے بلاوجہ نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں تو حریمہ اُس کی آنکھوں میں آئی بے چینی کو بھانپ۔

''اگر ایسے ہی بیٹھے ہو تو چلو مجھے کہیں گھما کے لاؤ۔ فضول بیٹھنے سے بہتر ہے مجھ سے دعائیں

لو۔'' اُس کے انداز پر مومن کو ہنسی آگئی، بے رنگ و بے رونق ہنسی۔ جسے دیکھ کر حریمہ کے دل کو کچھ ہوا۔

''چلو، کہاں جانا ہے، بتا دو میں جلدی سے تیار ہو کے آتا ہوں۔'' اُس نے بے دلی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ساحل سمندر چلتے ہیں۔'' حریمہ اُس کا موڈ بدلتا دیکھ کے مطمئن ہوگئی۔ تم گاڑی میں بیٹھو میں 5 منٹ میں آتا ہوں۔ کہہ کے وہ چینج کرنے چل دیا۔

''مومن میں اگر تم سے کچھ مانگوں تو تم مجھے دو گے۔'' ساحل سمندر پانی کی لہروں کے شور سے اپنے دل کی اُداسی دور کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا جب حریمہ نے دھڑکتے دل سے کہا۔ گھبراہٹ کے مارے اُسے پسینہ آرہا تھا۔ حالانکہ ہوا خوب زوروں پر تھی اور شام ہونے کی وجہ سے دھوپ بھی اپنے تمام رنگ سمیٹ کے جا چکی تھی۔

''ہاں بولو، ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے تمہیں اجازت لینے کی ضرورت آپڑی ہے۔ ویسے تو تم کوئی چیز لیتے ہوئے پوچھنا کیا بتانا تک گوارا نہیں کرتی، آج کیا ہوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔'' اُسنے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے چیک کرنے کی ایکٹنگ کی۔

''مومن پلیز بی سیریس مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے، اگر تم نے انکار کیا تو میں اسی سمندر میں اپنی جان دے دوں گی۔'' اُس نے عجیب سے لہجے میں کہا تو مومن کے دل کو دھڑکا لگا۔

''بولو اگر میرے بس میں ہوا تو میں ضرور دوں گا لیکن بس سے باہر ہوا تو تم سمجھنے کی کوشش کرنا۔'' اُس نے کہا تو حریمہ کو لگا کہ اُسے علم ہو گیا

کہ وہ کیا بات کرنے والی ہے۔

''تمہارے بس میں ہو یا نہ ہو تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔'' اُس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' وہی ہوا جس کا مومن کو شک ہو رہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔'' مومن کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''وہی جو سچ ہے میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں کیونکہ بہت محبت کرتی ہوں تم سے تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔'' اُس نے بھیگے لہجے میں کہا۔

''تمہیں تو پتہ ہے ناں حریمہ کہ میں وفا سے پیار کرتا ہوں پھر بھی، تمہارا یہ فیصلہ غلط ہے۔'' اُس نے حریمہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہاں میں سب جانتی ہوں پھر بھی تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں اسی پانی میں ڈوب کر مر جاؤں گی۔'' اُس کا لہجہ اتنا اٹل تھا کہ مومن بھی ڈر گیا۔

''دیکھو حریمہ بچکانہ باتیں مت کرو یہ فضول باتیں ہیں دیکھو تم سمجھنے کی کوشش کرو میں تمہیں وہ پیار نہیں دے سکوں گا جس کی تم حقدار ہو۔ کیونکہ میرے دل و دماغ میں وفا ہے اور اُسے بھلانے میں تھوڑا ٹائم تو لگے گا۔'' اُس نے سچے دل سے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتی اور میں شادی کے بعد تم سے کوئی ڈیمانڈ کوئی گلہ شکوہ نہیں کروں گی تمہیں سپورٹ کروں گی وفا کو بھلانے میں، پلیز نا مت کرنا۔ تم تو دل ٹوٹنے کا درد جانتے ہو نا کہ کتنی اذیت ہوتی ہے جب وہ ہستی انکار کر دے جس سے آپ خود سے زیادہ پیار کرتے ہوں۔ میں تمہارے پیار میں ڈوب چکی ہوں پوری طرح۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے میرے پاس، تم مجھے وہ درد مت دینا جو تم جھیل چکے ہو...... پلیز۔''

اُس نے بڑی آس کے ساتھ مومن کی طرف دیکھا تو مومن اُس کی یہ آس توڑ نہیں سکا۔ کیونکہ کہہ تو وہ بلکل ٹھیک رہی ہے کہ وہ دل ٹوٹنے کے درد سے خوب واقف ہو چکا ہے کہ کتنی اذیت ہوتی ہے جب آپ کو آپ کا پیار مایوس لوٹا دے۔ اس لیے وہ اُسے یہ تکلیف نہیں دے سکا۔

''اوکے، میں تمہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کروں گا، لیکن اِس کے باوجود کوئی بھول چوک ہو جائے تو معاف کر دیا کرنا۔ اُس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو حریمہ کو یقین نہ آیا، اُسے لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اُس نے جسے چاہا اُسے پا لیا۔ اِس سے بڑی خوش قسمتی کی بات اور کیا ہو گی خوشی کے مارے اُس کے آنسو نکل گئے۔

''کیا واقعی سچ کہہ رہے ہو تم، قسم کھاؤ میری۔'' اُسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں حریمہ میں تم سے شادی کروں گا اور تمہیں خوش رکھنے کی بھی پوری کوشش کروں گا۔''

اُس نے سوچا کہ وہ خود تو محبت میں تہی دامن خالی ہاتھ رہ گیا لیکن کیا ضروری ہے کہ اُس کی بچپن کی ساتھی اُس کی کزن بھی اُس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی خوشی سے دور اُس کے لیے ترستی ہی رہے۔

☆......☆......☆

اپنی محبت کو پا لینے کا احساس اتنا خوبصورت ہوتا ہے جس کے آگے انسان کو کوئی بھی برائی بری نہیں لگتی۔ وہ اپنی ہی دھن میں مگن ہو جاتا ہے اس بات سے لاپرواہ کہ اُس کے غلط فیصلے سے اُس کے ارد گرد رہنے والے لوگ کس قدر دکھی ہیں۔ حریمہ بھی ان سب باتوں سے بے حس ہو کے اپنی اور مومن کی شادی کی تیاریوں میں مصروف

ہوگئی۔ اُسے اندازہ ہی نہ تھا کہ اُس کی بہن جیسی کزن اور مومن دونوں ہی خوش نہیں ہیں۔ اُسے معلوم تھا تو صرف یہ کہ وہ خود خوش ہے اور اُس کی خوشی مومن میں ہے اُسے صرف اپنی خوشی سے غرض تھی۔

اِس خوشی خوشی میں شادی کا دن آ پہنچا۔ میرون لہنگے میں بنی سنوری وہ کوئی شہزادی ہی معلوم ہو رہی تھی، اُس کے پاس بیٹھا مومن خود کو خوش ظاہر کرنے کی خوب کوشش کر رہا تھا لیکن دل کے ایک کونے میں اب بھی درد اٹھ رہا تھا جس کو دبانے کے لیے وہ بار بار حریمہ کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو جاتا دوسری طرف حریمہ پر تو واقعی شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ اُس کی خوشی اُس کے چہرے سے بھی ظاہر تھی۔ ایسے ہی ہنستے مسکراتے وہ مومن کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی جب سب سے کونے والی ٹیبل پر بیٹھی وفا پر نظر پڑی، جس کے چہرے پر اِس قدر سوگواریت چھائی ہوئی تھی کہ ایک لمحے کے لیے دل کو کچھ ہوا لیکن دوسرے ہی پل وہ نارمل ہوگئی۔

شادی کا 10 واں دن تھا جب وہ تیار ہو رہی تھی اور اب بھی اُسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہ آ رہا تھا۔ اُس نے ایک نظر مومن پر ڈالی جو بیڈ پر لیٹا اُسی کی طرف متوجہ تھا۔ کیسی لگ رہی ہوں میں۔ اُس نے ریڈ لپ اسٹک ہونٹوں پر پھیر کے رُخ اُس کی طرف موڑا۔ بہت بہت خوبصورت بلکل پری لگ رہی ہو۔ اُس نے دل سے تعریف کی تو وہ جھینپ گئی۔

چونکہ اُس کا میکہ اور سسرال دونوں ہی ایک گھر میں تھے بس ایک دیوار کی دوری تھی اور اُس کے آنے جانے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اچانک اپنے مما پاپا کے لیے دل مچلنے لگا تو وہ مومن اور رازیہ کو بتا کے اُن کی طرف آ گئی۔

''اسلام وعلیکم مما، ارے ماموں آپ لوگ آئے ہوئے ہیں ہمیں تو پتہ ہی نہیں، ورنہ مومن اور تائی بھی آتے آپ سے ملنے۔'' وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سامنے رضوان اور صوبیہ پر نظر پڑتے ہی حیران ہوئی۔

''وعلیکم السلام کیسی ہو بیٹا۔'' صوبیہ ممانی نے خوشدلی سے اُسے اپنے ساتھ لپٹایا۔

''یہ کیا مناہل اور موحل آپی بھی آئی ہوئی ہیں کیا۔'' وہ ابھی ممانی کے گلے لگی ہوئی تھی کہ باہر سے آتی مناہل اور موحل پر نظر پڑتے چونک سی گئی۔

''کوئی خاص بات ہے کیا جو سب اکٹھے ہوئے ہیں آپ لوگ، مجھے بتایا تک نہیں اپنے آنے کے بارے میں وہ اپنی بے چین طبیعت کے باعث سارے سوال ایک ہی سانس میں پوچھ بیٹھی۔

''ہاں ہاں سب بتائیں گے تم بیٹھو تو سہی اور بات تو خاص ہی سمجھو۔'' مناہل نے اپنے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو بہلاتے کہا۔

''کیا بات ہے جلدی بتاؤ ناں۔'' اُس کی جلد بازی پر رضوان اور صوبیہ مسکرا دیے۔

''تم میرے پاس یہاں بیٹھو میں تمھیں سب سچ بتاتی ہوں۔'' صوبیہ کے کہنے پر وہ اُن کے پاس صوفے پر ہی ٹک گئی۔

وہ اصل میں مناہل اور موحل اپنے سسرال سے وفا کے لیے رشتہ لانے کا بول رہی ہیں تو اِسی سلسلے میں مشورے کے لیے بھائی صاحب اور باجی کے پاس آئے ہیں، چونکہ مناہل اور موحل ایک ہی گھر میں دیورانی جیٹھانی ہیں اور اپنی پھوپی ساس کے بیٹے جبران کے لیے رشتہ لانے کا بول رہی ہیں کیونکہ جبران کی ماں نے دونوں

بہنوں کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ اپنے ماموں ممانی سے اِس بارے میں بات کریں اسی مقصد کے لیے سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔

''ارے یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ جبران تو بہت ڈیسینٹ لڑکا ہے۔ اپنا بزنس کرتا ہے۔ اپنی وفا کو بہت خوش رکھے گا۔ اچھا اسی لیے وفا آج آئی نہیں۔'' اُس نے اب غور کیا تو وفا کو نہ پاکر درست اندازہ لگایا۔

''تو پھر کیا فیصلہ ہوا میرا مطلب ہے کہ اُن لوگوں کو کیا بولیں گے اُس نے اپنی مما کی طرف دیکھا۔ اب دیکھو اللہ کی جو مرضی ہم سب کی تو یہی رائے ہے کہ اُن لوگوں کو رشتے کے لیے آنے دیں۔ اچھے لوگ ہیں، ویسے بھی اچھے رشتے بار بار نہیں آتے۔ نزہت نے بھائی کو مخلصانہ مشورہ دیا۔

☆......☆......☆

''مومن آپ کو پتہ ہے وفا کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔'' اُس نے لوشن ہاتھوں پر ملتے ہوئے کہا تو ایک لمحے کے لیے ایک سایہ سا مومن کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔

''کب ہو رہی ہے اُس کی شادی۔'' خود پر قابو پاتے ہوئے اُس نے زخمی دل سے پوچھا۔

''اگلے مہینے کے اسٹارٹ میں شادی ہے، وہ خاور بھائی بزنس ٹور پر لندن گئے ہوئے ہیں تو اُن کی واپسی پر ہوگی شادی۔'' اُس نے بہنوئی کے بارے میں بتایا۔

''کس سے ہو رہی ہے شادی۔'' اُس نے نا چاہتے ہوئے بھی وہ سوال آخر پوچھ ہی لیا۔

مناہل اور موحل باجی کے سسرال میں، خاور اور اعظم بھائی کے پھوپو زاد جبران سے، اُس نے بغیر سوچے سمجھے سب سچ بتا دیا۔

''یہ کیا بول رہی ہو، تم تو کہہ رہی تھی کہ وہ اپنے یونیورسٹی کے کسی لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے تو پھر اب مناہل کے سسرال میں کیسے؟''

اُس نے حیرت سے کہا تو حریمہ کے لوشن ملتے ہاتھ ایک دم ساکن ہو گئے۔

اُسے تو یاد ہی نہ رہا کہ اُس نے وفا کے بارے میں مومن سے کیا کہہ رکھا ہے، جبھی تو اتنی بڑی بات اُسے اتنے آرام سے بتا بیٹھی، لیکن کمان سے نکلا تیر اور منہ سے نکلے الفاظ دوبارہ واپس نہیں آسکتے۔ اسی طرح اُس کے الفاظ بھی واپس نہیں لیے جاسکتے، اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اب وہ صفائی میں ایسا کیا کہے کہ اُس کے شوہر کو اُس پر شک نہ ہو۔

''وہ اُن دونوں کا بریک اپ ہو گیا تھا، اُسے یہی سمجھ میں آیا۔''

''بریک اپ پر کیوں؟'' اُس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''وہ لڑکا صرف فلرٹ کر رہا تھا اُس سے۔ اور آپ کیوں اتنی تفتیش کر رہے ہیں، لائٹ آف کریں مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اُس نے بوکھلا کے چادر سر تک اوڑھ لی تو مومن نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

یہ مہینہ کیسے پر لگا کر اُڑا اُسے کچھ خبر ہی نہ ہوئی، وفا کی شادی کی تیاریوں اور اُس کی پورے خاندان میں دعوتیں چل رہی تھیں، مومن عجیب بجھا بجھا سا تھا۔ حریمہ کے پوچھنے پر بھی ٹال دیتا۔ اُس کے دل میں کچھ تو کھٹک رہا تھا لیکن کیا؟ اِس کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ایسے ہی دن گزرتے گئے اور شادی کا دن آن پہنچا وہ جو خود سے عہد کر بیٹھا تھا کہ اُس کی شادی میں کسی صورت نہیں جائے گا لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے اپنا عہد بھول گیا

اور اب اُسے سامنے دلہن بنا دیکھ کے اُس کا دل اتنا دکھی ہو رہا تھا کہ خود کو لاکھ سمجھانے پر بھی وہ اُس دشمنِ جاں سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ ریڈ لہنگے میں وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ پریوں کو بھی مات دے رہی تھی۔

اُس کی اور جبران کی بلائیں لی جا رہی تھیں، دونوں کو چاند سورج کی جوڑی قرار دیا جا چکا تھا۔ وفا اتنی مطمئن نظر آ رہی تھی کہ حریمہ کے دل کا سارا ملال بھی جاتا رہا۔

''کیا ہوا آپ ایسے اُداس کیوں بیٹھے ہیں۔'' وہ ہمیشہ ہی سوچے سمجھے بنا بولتی سو آج بھی بولنے کے بعد سوچا تو اپنے ہی سوال پر پچھتانے لگی۔

''چلیں آئیں ہم بھی تصویریں بنواتے ہیں۔'' اپنی بات کا اثر ختم کرنے کے لیے وہ بات بدل گئی۔

''نہیں یار میرا موڈ نہیں ہے تصویریں بنوانے کا۔'' اُس نے بے دلی سے کہتے ہوئے باہر کی راہ لی۔

''مومن وہ میں کہہ رہی تھی کہ کیوں ناں ہم اِس سنڈے کو وفا اور جبران کی دعوت کریں۔'' وہ جو لیپ ٹاپ پر کام میں مصروف تھا۔ سر ہلانے پر اکتفا کیا، ویسے بھی اُس نے بہت مشکل سے خود کو سنبھالا اور وفا کی یاد سے پیچھا چھڑا رہا تھا۔ اب اُس کے بارے میں باتیں بہت سرسری لینے کی کوشش کرنے لگا۔

''بتائیں ناں مومن۔'' حریمہ اُس کو کام کی طرف متوجہ پا کر چڑ گئی۔ ویسے بھی اُسے اس حال میں غصہ بہت جلد آنے لگا۔

''یار تم کو میں نے منع تھوڑی ہی کی ہے جب دل کرے کر دو مجھ سے اجازت لینے کی کیا

ضرورت ہے۔'' وہ اِس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے تھوڑا غصے میں آ گیا۔
مگر یہ بات حریمہ کی سمجھ سے باہر تھی یا وہ جان بوجھ کر انجان بنتی تھی۔
بس ہر وقت کام میں ہی لگے رہا کریں۔ میری تو کوئی پرواہ ہی نہیں، کتنے دن ہو گئے ہمیں ایک ساتھ ٹائم اسپنڈ کیے ہوئے لیکن آپ کو کیا فرق پڑتا ہے، میں جیوں یا مروں۔'' وہ غصے سے اٹھی ہی تھی کہ ایک دم چکر آنے پر زمین پر گر گئی۔
''حریمہ کیا ہوا حریمہ یار اٹھو کیا ہوا تمہیں، اچھا سوری میں ایکسکیوز کرتا ہوں اب ٹائم دوں گا تمہیں پرامس۔'' وہ اُسے بے ہوش دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اُسے ٹھیک کر دے۔ اُسے تھوڑی سی تکلیف میں دیکھ کر ہی اُس کا دل ڈوبنے لگتا اور آج تو وہ بے ہوش تھی۔ وہ اُس کا چہرہ تھپتھپا رہا تھا لیکن وہ ہنوز بے ہوش ہی تھی، اُسے احتیاط سے بیڈ پر لٹا کے وہ گاڑی نکالنے بھاگا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ڈاکٹر کے سامنے موجود تھا۔
''دیکھیے مومن آپ کی مسز کا بی پی لو ہو گیا تھا اور میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ اِن کا بہت خیال رکھیں کیونکہ کافی کمزوری ہو رہی ہے انہیں، میں آپ کو یہ میڈیسن لکھ کے دے رہی ہوں باقاعدہ لینی ہیں یہ ساری۔'' لیڈی ڈاکٹر نے پیشہ وارانہ انداز میں پہلے مومن اور پھر حریمہ کی طرف دیکھتے کہا۔
''ڈاکٹر صاحبہ کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے ناں۔'' اُس کا دل ابھی بھی گھبرا رہا تھا۔
''نہیں خطرے کی بظاہر کوئی بات نہیں، یہ سب پریگنینسی میں ہوتا رہتا ہے بس آپ دونوں خیال رکھیں۔'' اُس نے مسکرا کے انہیں تسلی دی۔

''یار آج تو تم نے میری جان ہی نکال دی تھی۔'' وہ اُس کے سرہانے بیٹھا اُس کے سر میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔
''اچھا جی اگر ایسی ہی بات ہے تو آپ مجھے اگنور ہی مت کیا کریں ناں، کتنے دن سے آپ کے ساتھ کے لیے ترس رہی ہوں۔'' اُس نے سامنے بیٹھے مومن کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''آئندہ پورا خیال رکھوں گا کہ تمہیں ٹائم دے سکوں۔'' اُس نے اپنی پیاری بیوی کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

☆......☆......☆

آج وہ صبح سے ہی خانساماں کے ساتھ کچن میں لگی ہوئی تھی، اُس کی پوری کوشش تھی کہ ہر ڈش اتنی اعلیٰ بنے کہ وفا اور اُس کا شوہر خوش ہو کے جائیں۔ ڈیڑھ بجے کچن سے فارغ ہو کے وہ واش روم میں گھس گئی۔ لائٹ بلیو نفیس سا جوڑا جس پر ہلکا ہلکا کام بہت مہارت سے کیا گیا تھا، ہلکا سا میک اپ کیے گیلے بال تولیے سے خشک کرتی وہ پرفیوم خود پر چھڑک رہی تھی کہ کچھ یاد آنے پر فوراً موبائل اُٹھا کر مومن کو کال ملائی۔
''مومن آپ کو یاد ہے ناں آج ٹائم پر آنا ہے، وفا لوگ بھی آنے ہی والے ہیں آپ بھی نکل جائیں آفس سے۔'' اُس نے کہتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی اور بیل کی آواز پر جلدی سے فون بند کر کے باہر آ گئی۔
گرین کام والے سوٹ میں میک اپ کیے بالوں کا جوڑا بنائے وہ اتنی آسودہ لگ رہی تھی کہ حریمہ کا رہا سہا ملال بھی جاتا رہا۔
جبران کی نظریں ہر تھوڑی دیر بعد اُس کا طواف کر رہی تھیں، کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ مومن نے بھی فون کر کے حریمہ کو تسلی دی کہ

آدھے گھنٹے میں پہنچنے والا ہے۔ مبادا پھر کہیں وہ غصے میں اپنا بی پی لو نہ کرلے۔

''وفا چلو آؤ تم میرے ساتھ، چائے پینے کے بعد وہ جبران کو تائی تایا اور مما پاپا کے ساتھ بیٹھا چھوڑ کے وفا کو اپنے ساتھ اپنے روم میں لے آئی۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو، ماشاء اللہ۔'' اُس نے کھلے دل سے تعریف کی۔

''شکریہ۔'' وفا نے مسکرا کے کہا۔

''یہ تمہارے لیے گفٹ......'' اُس نے بلیک ایمبرائیڈری والا سوٹ اُسے تھمایا جو اُس نے دو دن پہلے مومن کے ساتھ جا کے بہت دیر پسند کرنے کے بعد خریدا۔

''ارے حریمہ اس کی کیا ضرورت ہے۔'' اُس نے منع کرنا چاہا۔

''رکھو یار تم شادی کے بعد پہلی بار ہمارے گھر آئی ہو، یہ تمہارے لیے میری طرف سے چھوٹا سا تحفہ اس نے وفا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے کہا۔

''تھینکس یار بہت خوبصورت ہے۔'' وفا نے ستائشی نظروں سے سوٹ کی طرف دیکھا۔

''تھینکس تو میں تمہارا کرنا چاہتی ہوں یار تم نے میرے لیے جو کیا وہ کوئی اپنا ہی کرسکتا ہے، یار تم نے مجھے خرید لیا۔ میں ساری زندگی تمہارا یہ احسان چاہ کے بھی نہیں اُتار پاؤں گی۔ مومن کو میری قسمت میں لکھ کے تم نے مجھے سب سے بڑی خوشی دی میری زندگی کی، میری دعا ہے کہ جبران کے ساتھ میں بھی تمہیں اتنی خوشیاں ملیں کہ تمہیں مومن سے دستبردار ہونے کا سارا ملال ختم ہوجائے۔'' اُس نے بھیگی آنکھوں سے وفا کو دیکھا۔

''حریمہ اِس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں اور آج اِس ٹاپک کو یہیں ختم کردو یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے اور مومن سے دستبردار ہوکے مجھے کوئی ملال نہیں ہے۔ اللہ نے مجھے جبران کی شکل میں اتنا اچھا جیون ساتھی دیا کہ میں اپنی قسمت پر رشک کرنے لگی ہوں۔''

وہ دونوں اور بھی پتہ نہیں کیا باتیں کررہی تھیں لیکن مومن اِس سے آگے سن نہ سکا، دروازے میں کھڑا وہیں جم سا گیا، اُس کے کان سائیں سائیں کررہے تھے۔ وہ کیا سن چکا تھا اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جس سے وہ اپنا ہر غم شیئر کرتا آرہا تھا۔

وہی اُس سے اُس کی خوشی چھین چکی تھی۔ اتنا بھروسہ کرتا تھا وہ حریمہ پر، اور اُس نے کیا کیا، اُس کے بھروسے اُس کے اعتماد کو چور چور کرکے رکھ دیا۔ اُس کا دل کررہا تھا کہ وہ زور زور سے چیخے وہ جو سمجھتا رہا کہ اُس کی قسمت میں کچھ کمی تھی جو وفا اُس کی قسمت میں نہ تھی لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ اُس کی خوشی چھین کے حریمہ اُس کی زندگی میں آنے کے منصوبے بناتی رہی تھی۔

اُس کا دل چاہا کہ سامنے بیٹھی دونوں لڑکیوں کو ایک ایک تھپڑ لگا کے پوچھے کہ انہیں کس نے حق دیا ہے اُس کی زندگی سے کھیلنے کا، آخر اُس کے ساتھ ہی اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا گیا۔ لیکن اِس سب کے برعکس وہ خاموش ہی وہاں سے لوٹ گیا۔

''میں دبئی جارہا ہوں۔'' ایک بم تھا جو اُس نے حریمہ کے سر پر پھوڑا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ، کیوں مجھے لے کر جارہے ہیں ناں۔'' اُس نے مومن کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھ لی لیکن پھر بھی امید کا دامن

پکڑے رکھا۔

''نہیں فی الحال میں اکیلا جا رہا ہوں۔ تم ابھی اس حالت میں سفر نہیں کر سکتیں۔ میری پروموشن ہوگئی ہے لیکن ساتھ ہی مجھے دبئی کی برانچ میں شفٹ کیا جا رہا ہے۔'' اُس نے تحمل سے جواب دیا۔

''میں کیسے رہوں گی آپ کے بغیر مجھے بھی ساتھ لے کر جائیں۔ ہم اتنا افورڈ تو کر سکتے ہیں کہ ساتھ جائیں اور وہاں میں آپ کے ساتھ رہوں۔'' اُس کو مومن کے جانے کا سوچ سوچ کے ہی ہول اٹھ رہے تھے۔

''ضد مت کرو حریمہ میں اپنے بچے کے معاملے میں رسک نہیں لے سکتا۔ پہلے مجھے وہاں جانے دو، میں وہاں سیٹ ہو جاؤں کچھ عرصہ پھر تمہیں بلوا لوں گا۔''

سب بڑوں نے بھی حریمہ کو سمجھایا کہ پہلی بار وہ ماں بننے جا رہی ہے ایسے میں سب سے دور اکیلے رہنا مناسب نہیں۔ پھر نئی جگہ ہے مومن بھی اُسے اور بچے کو وقت نہیں دے پائے گا لہٰذا ابھی اُس کو جانے دیا جائے۔ پھر مومن اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالنے دبئی چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد کتنے دن وہ روتی ہی رہی لیکن پھر اُسے آہستہ آہستہ قرار آتا گیا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ ضرور لوٹ کے آئے گا، اُس کی محبت میں اتنی تاثیر تو ضرور ہوگی کہ ایک نہ ایک دن اُسے واپس کھینچ لائے۔ بس وہ اُسی دن کے انتظار میں دن کاٹنے لگی۔

☆......☆......☆

کبھی کبھی سچ اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ انسان یہ خواہش کرتا ہے کہ کاش وہ جھوٹ کی دنیا میں ہی سانس لیتا رہتا اور سچ سے واقفیت نہ ہوتی۔

ایسا ہی حال مومن کا بھی ہوا جب اُس نے سنا کہ اُس کی بیوی نے اُس کے ساتھ کیا کیا۔ وہ اُسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب جو بھی ہو او وہ اُس کی بیوی اور اُس کے آنے والے بچے کی ماں تھی اور سب سے بڑی بات اُس کو حریمہ سے محبت ہونے لگی تھی۔ جب اچانک اُس دن اُس نے دروازے پر کھڑے سب سن لیا اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سب کچھ تہس نہس کر دے لیکن وہ خاموش رہا اور اپنا ٹرانسفر دبئی کروا لیا۔

بہت دنوں تک مومن کا دل حریمہ سے بہت خراب رہا۔ وہ اُس کی کال اکثر اگنور کر دیتا یا بہت اکھڑ انداز میں بات کرتا۔ گھر والوں سے تفصیلی بات بھی کرتا اس کی خیریت بھی پوچھتا مگر اُس سے فاصلہ ہنوز برقرار تھا۔

مگر پھر آہستہ آہستہ اُسے احساس ہو گیا کہ حریمہ نے وہی کیا جو کوئی بھی محبت میں مبتلا شخص کرتا کہتے ہیں نا کہ ''All Is Fair In Love And War'' سو وہ محبت کرتی تھی اور سچی محبت تھی تبھی مومن کو اپنا بنا لیا میری محبت میں کمی تھی اس لیے وفا کسی اور کی ہوگئی مگر اب میں اپنی محبت میں کوئی کمی نہ رکھوں گا۔ میں خوش قسمت ہوں کہ میری بیوی مجھے اتنا چاہتی ہے۔

وفا سراب ہے اور حریمہ حقیقت میرے ہونے والے بچے کی ماں...... مومن کے دل پر سے بوجھ ہٹ گیا اور اُس نے مسکراتے ہوئے حریمہ کا نمبر ڈائل کرنے کے لیے فون اٹھا لیا۔ آج بہت دنوں بعد اُسے ایک بار پھر حریمہ سے بہت ساری باتیں کرنی تھیں اور بتانا تھا کہ وہ اُسے کتنا مس کر رہا ہے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

ریمل آرزو

دشتِ عطش

"سکھاں میرا سانول تو لوٹ کر آئے گا نہ؟" سکھاں نے سر اُٹھا کر سلونی کی جانب دیکھا جس کی آنکھوں میں جانے کیا کچھ تھا۔ خدشے وسوسے خوف آس امید انتظار یقین و بے یقینی کے عالم میں کیئے گئے سوال کا جواب وہ سکھاں کے کچھ کہنے......

کھڑی نیم کے نیچے ہوں تو ہیکلی
جا تو ڑا دتا رُومناں چھنی سی دیکھ لے

سنہری ریت کے دیس کی کوئل مائی بھاگی کا مشہورِ زمانہ گیت سکھاں کے لبوں پہ رقصاں صحرا کی تند تیز ہواؤں کے دوش پر سفر کرتا ہوا تپتی ریت پر برہنہ پا کھڑی سانول کی راہ تکتی سلونی کی سماعتوں سے ٹکرایا تو اس کی بنجر آنکھوں میں دو آنسوؤں نے جنم لیا اور جنم لیتے ہی سلونی کے غم نے انہیں بے گھر کر دیا۔

آگ برساتے سورج کی کرنیں اسے الوداع کہتے ہوئے باور کروا رہی تھیں کہ ایک دن حیات کا اور تمام ہوا آج بھی اس کا انتظار لاحاصل ٹھہرا۔ تین دن ہونے کو آئے تھے مگر سانول لوٹ کر نہیں آیا تھا اس کی کہیں کوئی خبر نہیں تھی۔ سلونی کا بس چلتا تو وہ خود سانول کی تلاش میں نکل جاتی اور سارا صحرا چھان مار کر اسے ڈھونڈ نکالتی مگر وہ بے بس تھی کیونکہ وہ تنہا نہیں تھی اس کے ساتھ اس کا دو سالہ بیٹا بلاول تھا اور اسے وہ ساتھ لے جانے کی بے وقوفی کر سکتی تھی اور نہ ہی تنہا چھوڑ سکتی تھی۔ سو وہ مجبور تھی اور دعا گو کہ سانول جلد لوٹ آئے میرے لیے اپنے لختِ جگر بلاول کے لیے......

بلاول کا خیال اسے سانول کے خیالوں سے چونکا کر باہر لے آیا تو وہ اندر چونرے (جھونپڑی نما کمرا) کی جانب بھاگی جہاں بلاول بے خبر سو رہا تھا۔ وہ دھیرے سے چلتی ہوئی اس کے پاس آن بیٹھی اور اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی تو اس کے لبوں پر ممتا سے بھرپور مسکان رقص کرنے لگی۔

وہ یونہی کچھ دیر اس کے سرہانے بیٹھی اسے محبت سے تکتی رہی۔ بلاول گہری نیند میں تھا ابھی اس کے جاگنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ جبھی سلونی اُٹھ کر باہر آ گئی جہاں سکھاں اب بھی دھیمے سروں میں گنگنا رہی تھی۔

"سکھاں تمہاری آواز بہت خوبصورت ہے۔ اگر تمہیں ریڈیو ٹی وی پر گانے کا موقع ملے تو

یقین مانو بہت آگے جاؤ۔'' سلونی نے فراخ دلی سے سکھاں کی تعریف کی تو وہ شرما کر مسکرادی اور کہنے لگی۔

''زارون میری ماسی کا پٹ (بیٹا) بھی میری آواز کا بہت شیدائی تھا...... سلونی بھاء جائی میں زارون کی منگ تھی...... وہ اکثر مجھ سے اپنا پسندیدہ گیت 'چار دناں دا پیار او ربا، لمبی جدائی بڑی لمبی جدائی' سنتا تھا اور پھر اک دن وہ سچ مچ لمبی جدائی میرا مقدر کر گیا۔'' سکھاں نے یادوں کی کھڑکی کھولتے ہوئے اُداسی سے کہا۔

زارون کہتا تھا۔ ''سکھاں تیری آواز کا جادو تو پئن بلا سانپ آدمی کو ڈستا نہیں ہے بلکہ سوئے ہوئے آدمی کے منہ پر پھونک مارتا ہے اور اسے ملک عدم میں پہنچا دیتا ہے۔ تیری آواز بھی ایسی ہی ظالم ہے جو بظاہر ڈستی تو نہیں ہے لیکن جس کسی کی بھی سماعتوں کے رستے دل میں اترتی ہے اسے گھائل کر کے رکھ دیتی ہے۔ اپنا اسیر کر لیتی ہے کہیں کا نہیں چھوڑتی تیری ظالم آواز۔''

''زارون کی جن باتوں پر میں ہنستی چلی جاتی تھی آج اس کی وہی باتیں مجھے لہو رلاتی ہیں۔''

تمہیں معلوم ہے سلونی زارون جھوٹا تھا۔

''صحرا میں میری آواز اور پئن بلا سانپ سے بھی زیادہ ظالم ایک چیز تھی میرے ہاتھوں کی لکیروں میں لکھی قسمت اور قسمت کی پٹاری میں کنڈلی مارے بیٹھی غربت اور جب غربت کا ناگ ڈستا ہے تب محبت دم توڑ جاتی ہے۔ تمام رشتے ناطے منہ موڑ جاتے ہیں بس ایک ہی رشتہ باقی رہتا ہے۔ جسم و جاں کا رشتہ...... اور جب یہ رشتہ خطرے میں دیکھائی دیتا ہے تب انسان کچھ بھی کر گزرتا...... صحیح و غلط کی پہچان کھو بیٹھا ہے۔

پچھلی بار جب تھر میں قحط پڑا تھا تب زارون کے تمام کھیت اجڑ گئے تھے اور مویشی بھی ہلاک ہو گئے تھے۔ تب زارون کے ایک شہری دوست نے اسے شہر کام دلوا دیا۔ زارون بہت خوش تھا

اس نے ماسی اور مجھے بھی شہر میں آباد ہونے کے لیے کہا مگر ہم نے صاف انکار کر دیا تب وہ ناراض ہو کر شہر ایسا گیا کہ پھر کبھی لوٹ کر گاؤں نہ آیا۔

☆......☆......☆

سانول نے شہر جا کر زارون کو تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث تھا اور قید کاٹ رہا ہے ماسی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور اس کی دید کی پیاس لیے پیاسی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ زارون ماں کے آخری دیدار کو بھی نہ آیا اور شاید اب کبھی اب لوٹ کر نہ آئے گا۔''

سکھاں اپنی داستان سنا کر اشکبار ہو گئی اور یہی حالت سلونی کی بھی تھی اس نے دہل کر سکھاں سے کہا۔

''سکھاں میرا سانول تو لوٹ کر آئے گا نہ؟'' سکھاں نے سر اُٹھا کر سلونی کی جانب دیکھا جس کی آنکھوں میں جانے کیا کچھ تھا۔ خدشے وسوسے خوف آس امید انتظار...... یقین و بے یقینی کے عالم میں کیے گئے سوال کا جواب وہ سکھاں کے کچھ کہنے سے قبل ہی خود ہی جواب دینے لگی۔

''ہاں...... سانول لوٹ کر آئے گا اسے آنا ہی ہوگا۔''

☆......☆......☆

''اے لڑکی اٹھو۔'' اس کی سماعتوں سے ایک اجنبی کی رعب دار آواز ٹکرائی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی...... نیند میں ڈوبی خمار آلود آنکھوں کو بمشکل کھول کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا تو وہ چند لمحوں تک سمجھ ہی نہ پائی کہ وہ کہاں ہے، مگر جلد ہی اسے سب یاد آ گیا اس کے ذہن کی اسکرین پر بیتی رات کے منظر چلنے لگے کہ کیسے وہ درندہ صفت لوگوں کی قید سے فرار ہو کر رات کی تاریکی میں اندھا دھند بھاگتے بھاگتے ایک گاڑی میں آ چھپی تھی اور کب اپنی تقدیر کا ماتم کرتے کرتے اس کی آنکھ لگی اسے خبر بھی نہ ہوئی۔

''کون ہو تم...... اور یہاں کیا کر رہی ہو؟''

اجنبی نے اسے خاموش پا کر اسے دوبارہ مخاطب کیا تو وہ چونک کر مکمل ہوش میں آئی مگر اپنے سامنے حیرت زدہ سے کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ سمٹ کر دو قدم پیچھے ہٹی خوف کے سائے اس کی سوجی ہوئی لال انگارہ آنکھوں میں رقص کرنے لگے اسے لگا جیسے کسی نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی ہو۔

''او بی بی بولتی کیوں نہیں ہو تم...... بہری ہو کیا...... تمہیں سنائی نہیں دیتا...... کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے...... کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ اور میری گاڑی میں کیا کر رہی تھیں؟ کہیں تم کچھ چرانے تو نہیں لگیں تھیں گاڑی سے...... اگر ایسی ہی بات ہے تو ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔''

وہ برہم ہوا تو وہ اس کی بات سن کر بری طرح گھبرا گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ اس کے یوں اچانک رونے پہ وہ بھی گھبرا گیا۔ اجنبی شہر میں اجنبی حسین دوشیزہ اس کے سامنے رو رہی تھی کوئی دیکھ لیتا تو کیا سوچتا۔ عزت خاک میں مل جاتی۔

''ارے ارے تم...... تم رونے کیوں لگ گئی۔ دیکھو تم چپ ہو جاؤ کچھ نہ بتاؤ مگر خدارا رونا بند کر دو۔'' وہ نرمی سے بولا تو اس کے رونے میں کمی آ گئی مگر آنسو ابھی بھی اس کے دودھیا رخساروں پہ بہہ رہے تھے۔''

''میں...... میں چور نہیں ہوں۔'' وہ ہچکیوں کے دوران اٹک اٹک کر پہلی بار بولی تو اسے لگا جیسے اس کے آس پاس گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ وہ

چند لمحوں تک اس کی آواز کے سحر میں کھویا رہا۔ اس کا سارا غصہ ہوا ہو چکا تھا وہ سر جھٹک کر بولا۔

''ٹھیک ہے مگر اب میں کیا کروں کچھ پوچھا تو تم پھر سے رونے لگو گی اور اگر میں تمہارے آنسوؤں کے دریا میں ڈوب گیا تو اِدھر میری اماں اور ادی کا کیا ہوگا جو میری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔'' اس نے مصنوعی معصومیت سے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔

''عجیب لڑکی ہو ابھی رو رہی تھیں اور اب ہنس رہی ہو۔ اچھا چلو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں مجھے گاؤں کے لیے نکلنا ہے دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تو اس لڑکی کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔

''بتاؤ کہاں ہے تمہارا گھر؟'' اس نے پوچھا تو وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' اجنبی نے اسے تحیر سے دیکھا تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اس کے دل کو کچھ ہوا وہ اس کے قریب آیا اور آہستگی سے بولا۔

''میرے ساتھ چلو گی۔'' اس نے چونک کر سر اٹھایا اور پہلی بار اپنے سامنے کھڑے اجنبی شخص کو بغور دیکھا انتہائی سادہ شخصیت کا مالک وہ پُروقار سا شخص اس لمحے اسے بالکل اجنبی نہ لگا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں جھانکتی شرافت اسے باور کروا رہی تھی کہ یہی ہے وہ شخص جو اسے اس بھیڑیوں کے جنگل میں تحفظ دے سکتا ہے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆......☆......☆

میرا نام سلونی ہے چھوٹی سی تھی کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا پھر دادی اور بابا نے ہی میری پرورش کی بابا نے کبھی مجھے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی دادی نے ان سے دوسری شادی کا بہت کہا مگر وہ نہ مانے ماہ و سال یونہی گزرتے گئے کہ اک دن دادی بھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔

گھر کی ساری ذمہ داری اب مجھ پر تھی میں اسکول بھی جاتی اور گھر بھی سنبھالتی میں دسویں جماعت میں تھی۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ بابا کو میرے گھر بسانے کی فکر ستانے لگی تو وہ میرے رشتے دیکھنے لگے مگر لوگوں نے بابا کو ان کی تنہائی کا احساس دلانا شروع کر دیا کہ بیٹی رخصت ہو کر چلی جائے گی تو تم اکیلے رہ جاؤ گے ابھی عمر ہے بیٹی کے گھر بسانے سے پہلے اپنا گھر بسا لو۔ سلونی جائے گی تو تم اکیلے رہ جاؤ گے ابھی عمر ہے بیٹی کے گھر بسانے سے پہلے اپنا گھر بسا لو۔ سلونی کی نئی ماں لے آؤ۔'' اور پھر ایک دن بابا سچ میں میری نئی ماں لے آئے۔

اس دن میرا میٹرک کا رزلٹ آیا تھا۔ میں خوشی خوشی بابا کا انتظار کر رہی تھی کہ بابا کے ہمراہ اپنے سے چند برس بڑی شوخ و چنچل سی لڑکی دیکھ کر حیران ہوگئی مجھے بابا کی دوسری شادی پر اعتراض نہیں تھا مجھے افسوس ان کے انتخاب پر ہوا تھا وہ کسی طرح سے بھی میرے بابا کے قابل نہیں تھی۔ جس دن اس نے گھر میں قدم رکھا اسی دن میری خوشیاں مجھ سے روٹھ گئیں۔ اس کا رویہ بھی میرے ساتھ روایتی سوتیلی ماؤں جیسا تھا۔ میری پڑھائی بھی چھڑوا دی خود سارا دن سیر سپاٹوں پہ رہتی اور مجھ سے خوب کام کرواتی میری تو خیر تھی وہ بابا کا بھی ذرا خیال نہ رکھتی۔ بابا بیمار رہنے لگے تھے اور پھر ایک رات بابا سوئے تو پھر کبھی بھی نہ جاگے۔

میری تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی مجھے اپنا کچھ ہوش نہ رہا اور پھر ہوش اس دن آیا جب میں نے اپنی

سوتیلی ماں کو کسی سے اپنے متعلق بات کرتے ہوئے سنا اور میرے قدموں تلے زمین نہ رہی...... میری سوتیلی ماں نیلم کا تعلق وہاں سے تھا۔ جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں اور وہ اب مجھے بھی وہاں بھیجنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ سو میں گھر سے بھاگ نکلی مگر نیلم کے آدمی مجھے پکڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے مجھے کسی ویران جگہ پر قید کر دیا مگر میری قسمت اچھی تھی کہ میں انہیں چکما دے کر وہاں سے بھی بھاگ نکلی اور بھاگتے بھاگتے تھک کر تمہاری گاڑی میں چھپ گئی تھی اور پھر میرا سامنا تم سے ہوگیا۔ بس یہی ہے مجھ سیاہ بخت کی کہانی۔''

سلونی نے سیاہ پلو سے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے۔

''بہت دکھ ہوا تمہارے بارے میں جان کر پلیز رومت۔'' گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے افسردگی سے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' سلونی کو پہلی بار اس کے بارے میں جاننے کا خیال آیا۔

''سانول...... مجھے سانول کہتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر بتایا۔

''ہم کہاں جارہے ہیں سانول......'' سلونی نے پوچھا۔

''ماروی کے دیس۔''

☆......☆......☆

ان گنت مناظر پیچھے چھوڑ کر جانے کتنے راستوں کو ٹائروں تلے روند کر گاڑی سنہری ریت کے دیس میں داخل ہو چکی تھی۔ لہراتا بل کھاتا ہوا راستہ گاڑی کو کبھی اونچائی پر لے جاتا تو کبھی ایک دم سے ٹائر ڈھلوان سے پھسلنے لگتے زندگی کی ڈگر میں بھی تو ایسے ہی نشیب و فراز آتے ہیں۔ کبھی زندگی انسان کو اس قدر بلندی پر پہنچا دیتی ہے کہ اغیار بھی یاد ہونے کا دعویٰ کر کے سر پر بیٹھا لیتے ہیں اور جب بھی یہی زندگی انسان کو بلندی سے پستی میں دھکیلتی ہے تو اپنے بھی اپنے پیروں تلے روند کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ اپنے پرائے کی پہچان خوب کرواتی ہے یہ زندگی......

کسی سے کیسا گلا کہ تاریکی میں تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے ساتھ نہیں چھوڑتی تو مقررہ وقت سے پہلے زندگی حالات چاہے جیسے بھی ہوں زندگی اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہتی ہے وہ راہ کی کٹھنائیوں سے گھبرا کر ہار نہیں مانتی وہ تاریکی میں کہیں نہ کہیں سے کوئی نہ کوئی امید کا جگنو ڈھونڈ لاتی ہے جیسے سلونی کے لیے سانول کی صورت میں ڈھونڈ لائی تھی۔

''ای سٹھی چھوکری تو کھے مھنجے دیس مہ بھلی کری آئین۔'' سانول نے خوشدلی سے کہا۔

(اے اچھی لڑکی تمہیں میرے گاؤں میں خوش آمدید)

وہ جو صحرائے تھر کی خوبصورتی میں کھوئی ہوئی تھی۔ سانول کے سندھی زبان میں ادا کیے گئے جملے پر چونک کر نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔

''جی میں نے کہا خوش آمدید۔'' سانول نے کہا۔

''شکریہ۔'' وہ ممنونیت سے مسکرا دی اور پھر رُخ موڑ کر باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہونے لگی۔

سڑک کے کنارے بہت سی عورتیں دلکش رنگین چولی گھاگھرے چنری پہنے پانی سے بھرے مٹکے اٹھائے۔ قطار در قطار چلی جارہی تھیں۔ بارش خوب برس کر تھم چکی تھی۔ ٹیلے سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ فضا میں پھیلی جنگلی پودوں و پھولوں کی مخصوص مہک احساس میں جذب ہو کر

طویل سفر کی تمام تر تھکن ہواؤں میں تحلیل کرگئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ تھر فطرت کا میوزیم ہے اور آج وہ اس بات پہ ایمان لے آئی تھی۔ خاموش پُروقار خوبصورت صحرائے تھر کے رنگ دھیرے دھیرے نمایاں ہوکر سلونی کو اپنے سحر میں جکڑ رہے تھے۔ شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ جب سانول نے سڑک کے کنارے اک چھوٹے سے جھونپڑے نما ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی اور کہنے لگا۔

''سلونی...... یہ گاڑی میری نہیں ہے...... وڈیرے سائیں کی ہے ان کے ہی کسی کام سے میں شہر گیا تھا کہ مجھے تم مل گئیں۔'' آخری الفاظ معنی خیز انداز میں آہستگی سے ادا کیے گئے تھے۔

''مجھے اب حویلی جاکر سائیں جی کو گاڑی واپس کرنی ہے...... مگر میں تمہیں ساتھ لے کر حویلی نہیں جاسکتا۔''

''کیا...... کیا مطلب تو پھر میں کہاں جاؤں گی سانول پلیز مجھے یوں تنہا چھوڑ کر مت جاؤ۔'' سلونی نے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے سانول کا بازو تھام کر بے چینی سے کہا۔ سانول نے چونک کر سلونی کی جانب حیرانگی سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں بالکل وہ خوف نمایاں تھا۔ جو میلے کی بھیڑ میں گم ہوجانے کے خدشے کے سبب کسی بچے کی آنکھوں میں ہوتا ہے، ایک لمحے کو تو وہ کچھ بول ہی نہ پایا تب سلونی نے جھینپ کر ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ دیا وہ مسکرا دیا تو وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''سلونی میں تمہیں یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا...... تم میرے ساتھ میرے گھر جاؤ گی مگر......'' سلونی کا اطمینان بھرا سانس ''مگر'' پہ اٹک گیا۔

''مگر کیا سانول......؟''

''تمہیں یہاں کچھ وقت کے لیے ڈھابے پہ رُکنا ہوگا۔ گھبراؤ مت یہ ہوٹل میرے جگری یار کا ہے مطلب میرا ہی سمجھو تمہیں یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں یوں گیا اور بس یوں واپس آیا۔'' سانول نے چٹکی بجائی اور رُخ موڑ کر اپنے دوست کو آواز دی سلونی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر خاموش رہی۔

''ادا اصغر اِدھر آؤ میری بات سنو......''

''جی حکم کرو ادا سانول خیریت تو ہے ناں؟'' اس نے ایک نظر سانول کے پہلو میں بیٹھی اجنبی لڑکی پر ڈال کر کہا۔

''ہاں اصغر ادا خیر ہے...... یہ میری مہمان ہیں شہر سے آئی ہیں...... ان کو تھوڑی دیر کے لیے بھاجائی کے پاس لے جاؤ...... میں یہ سائیں کی گاڑی حویلی چھوڑ کر آتا ہوں۔'' سانول نے کہا۔

''بسم اللہ سانول تیرے مہمان میڈے مہمان فکر نہ کرو۔''

''آؤ ادی سائیں میڈے غریب خانے پہ آؤ، آپ کو چائے شربت تھادل وغیرہ پلواتا ہوں۔'' اصغر نے خالصتاً مقامی لہجے میں خوشدلی سے سیاہ لباس میں ملبوس دھان پان سی سلونی سے کہا جس نے کوئی جواب نہ دیا صرف بے بسی سے سانول کی جانب دیکھا وہ سانول سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھی تب ہی اصغر نے اس کی مشکل حل کردی۔

''سانول تو بھی آناں تیری بھاء جائی بھی تجھے یاد کررہی تھی۔ آجا یار اکٹھے چائے پیتے ہیں...... اور یہ گاڑی کی فکر نہ کر اندر ہوٹل میں وڈیرے سائیں کا ڈرائیور آیا بیٹھا ہے اتفاق سے اسے دے دے گاڑی کی چابی گاڑی حویلی وہ

لے جائے گا۔''

اصغر کی بات سن کر سلونی کا چہرہ کھل اٹھا۔ جسے سانولی محسوس کر کے مسکرا دیا۔

''ٹھیک ہے ادا اصغر مگر میں چائے نہیں تھادل (تھر کا خاص مشروب) پیوں گا اور ہماری مہمان بھی یہی پیے گی۔'' سانول نے کہا۔

وہ گاڑی سے نکل کر چلتے ہوئے ڈھابے کے سامنے ایک درخت تلے بچھی چارپائی پہ آ بیٹھے...... ٹھنڈی میٹھی سی نم ہوا کے نرم جھونکے سلونی کے چہرے پر بکھیری چند آوارہ لٹوں سے کھیلنے لگے۔ تھادل کا گلاس پی کر اس کے منتشر ذہن کو سکون ملا تھا۔

''سلونی وہ سامنے دیکھو۔'' سانول نے کہا تو سلونی نے چونک کر سامنے دیکھا۔

قطار در قطار اونٹوں کا قافلہ جارہا تھا ان کے گلے میں بندھی گھنٹیاں سُر بکھیر رہی تھیں۔ اس مدھر موسیقی میں اب سانول کی بانسری کے سُر بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایک پُر کیف سے احساس نے سلونی کے دل کو چھوا...... اس قدر حسین شام اس کی زندگی میں پہلے کبھی نہ آئی تھی۔

☆......☆......☆

سانول کی کل کائنات اس کی ماں اور بڑی بہن سکھاں سلونی سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ چند دنوں میں ہی وہ ایک دوسرے سے اس قدر مانوس ہو گئی تھیں کہ جیسے صدیوں کی آشنائی ہو ان کے درمیاں اور اب جدائی سہنا ناممکن...... اماں کو سلونی سانول اور سکھاں سے بڑھ کر پیاری ہو گئی تھی، انہیں معلوم تھا کہ سلونی ان کی مہمان ہے اور جلد ہی وہ اپنی خالہ کے پاس شہر چلی جائے گی۔ سلونی کے واپس چلے جانے کا خیال اماں کو اُداس کیے جارہا تھا اور اُداسی تو انہوں نے کسی اور کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی جب ہی تو وہ کچھ سوچ کر سانول کے پاس آئی تھیں۔

''سانول پتّ تو جاگ رہا ہے؟'' سانول نیم دراز چونرے کی جالی دار چھت سے جھانکتی چاندنی سے محو گفتگو تھا موضوع وہی ساحرہ تھی جس کے ہر انداز نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ اماں کی پکار سے وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

''جی...... جی اماں جاگ رہا ہوں۔ نیند اب ان آنکھوں کو نصیب کہاں۔'' آخری جملہ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں ادا کیا۔ جسے اماں سن نہ سکی اور اس کے سرہانے آ بیٹھی۔

''مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔''

''جی اماں کہیے کیا بات ہے سب خیریت تو ہے ناں؟'' سوالیہ نگاہیں سانول نے فکرمندی سے اماں کے چہرے پر گاڑیں۔

''ہاں...... ہاں سب خیر ہے وہ دراصل......'' چند لمحوں کے توقف کے بعد اماں دوبارہ گویا ہوئیں۔

''سانول میں نے تیرے لیے سلونی کو پسند کیا ہے میں اسے تیری کنوار (دلہن) بنانا چاہتی ہوں۔''

اماں کی بات سن کر جہاں وہ حیران ہوا وہیں اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اسے لگا وہ خواب دیکھ رہا ہے۔

''ہائے اللہ اماں سچی سلونی میری بھاء جائی بن جائے گی۔'' اس سے پہلے کہ سانول اماں کو جواب دیتا سکھاں دودھ کا گلاس لیے اندر آ ٹپکی تھی اور خوشی سے چہک رہی تھی۔

''ادی تم بھی نا...... وہ سن لے گی تو کیا سوچے گی۔'' سانول نے گھبرا کر باہر کی جانب دیکھا تو اماں اور سکھاں ہنس دی۔

''سانول تو میری بات کا جواب دے تجھے

سلونی کیسی لگتی ہے، تو کہیے تو میں اس سے بات کروں۔'' اماں نے پوچھا۔

''اماں آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر مجھے کوئی اعتراض نہیں...... مگر اماں کہیں وہ کوئی غلط مطلب نہ لے لے یا برا نہ مان جائے کہاں وہ شہر کی پڑھی لکھی لڑکی اور کہاں میں گاؤں کا مڈل پاس گنوار...... وہ تو صاف انکار کر دے گی۔'' سانول نے قنوطیت سے کہا۔

بند دروازے کی جھری سے جھانک کر قیاس آرائیاں کر کے بدگمان ہونے سے بہتر تھوڑی ہمت جتا کر دروازے پر دستک دے کر حقیقت شناس ہونا ہے۔ آگے اللہ کی رضا ہوئی تو آپ کی خوشیوں کا دروازہ کھل بھی سکتا ہے۔ یوں بنا کوشش کیے ہار نہیں ماننی چاہیے آپ بھی مایوس نہ ہوں ادا سائیں انشاءاللہ سلونی مان جائے گی۔''

سکھاں نے مسکرا کر کہا تو اماں نے اس کی بلائیں لے ڈالیں اور کہنے لگیں۔

''تمام گھنو (بہت خوب) میری دھی رانی تو بہت سیانی ہوگئی ہے خوش بھنجو۔''

''ہاں بالکل......'' سانول نے بھی اماں کی ہاں میں ہاں ملائی تو وہ ہنستے ہوئے باہر کی جانب سلونی سے بات کرنے کو چل دی تو سانول تشکر سے اس کی پشت تکتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

''ادی سکھاں نے بتایا کہ تم مجھ سے شادی کے لیے رضا مند ہو...... لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اب بھی سوچ لو...... یہاں زندگی بہت مشکل ہے۔ تھر میں زندگی کا انحصار بارشوں پر ہے بارشیں نہ ہوں تو خشک سالی کے باعث زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ کھیت کھلیان تباہ ہو جاتے ہیں۔ چارے کی عدم دستیابی کے باعث مویشی مرجاتے ہیں۔ دو گھونٹ پانی کے لیے میلوں سفر کر کے بھی اکثر لوگ پیاسے رہ جاتے ہیں۔ تم نے ابھی اس جنت میں چھپی جہنم نہیں دیکھی سلونی......''

یہاں کے باسی ہر دوسرے تیسرے برس اپنے ہونے کے جرم کی سزا قحط کی صورت میں جھیلنے کے عادی ہیں۔ کیا تم جھیل پاؤ گی یہ سب؟ کر سکو گی برداشت غربت، بھوک، پیاس......؟

سانول نے سوالیہ نظروں استفسار کیا تو وہ نہایت اطمینان سے کہنے لگی۔

''غربت، بھوک' پیاس صرف روپیہ روٹی پانی کی عدم موجودگی کا نام نہیں ہے کچھ لوگ رشتوں کے غریب، عزت کے بھوکے اور محبت کے پیاسے ہوتے ہیں سانول...... اور میں انہی کچھ لوگوں میں سے ہوں مجھے محبت اور عزت کے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے تمہارا ساتھ منظور ہے میں وعدہ کرتی ہوں سانول حالات چاہے جیسے بھی ہوں میں آخری دم تک تمہارا ساتھ نبھاؤں گی...... مول ملی توں سا محبت آہی......

☆......☆......☆

آج اس نے پہلی بار تھر کا روایتی لباس قوس و قزح سے رنگوں والا چولی گھاگھرا سانول کی فرمائش پر پہنا تھا مگر اب وہ ان کپڑوں میں سب کے سامنے جانے سے ہچکچا رہی تھی۔

''پتا نہیں مجھے یہ ڈریس سوٹ بھی کر رہا ہے یا نہیں...... کہیں سانول میرا مذاق اڑا کر ہنسنے ہی نہ لگے۔'' وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی انہی سوچوں میں گم تھی کہ سکھاں کی آواز پر چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سلونی بھاجائی کہاں ہو...... سانول اور اماں تمہارا کھانے پر انتظار کر رہے ہیں پتا ہے آج میں نے اپنے ہاتھوں سے مشروم کا سالن بنایا

ہے۔'' سکھاں بے دھیانی میں کہتے ہوئے چونرے میں داخل ہوئے تو اسے سجا سنورا دیکھ کر وہیں ٹھٹک گئی۔

''ماشاء اللہ میری بھاجائی تو بہت سوہنی لگ رہی ہے...... میں صدقے میں واری اللہ سائیں نظر بد سے بچائے۔ سانول دیکھے گا تو بس دیکھتا رہ جائے گا۔'' سکھاں نے ہنستے ہوئے کہا تو سلونی نے شرما کر اپنا ست رنگی چنری کا پلو دانتوں تلے داب لیا۔

''بس بھاجائی سنگھار میں ایک کمی رہ گئی۔'' سکھاں نے اس کا سرتا پا جائزہ لے کر کہا۔

''جی وہ کیسے سکھاں ادی۔'' سلونی نے ناسمجھی سے اسے دیکھتے ہوئے معصومیت سے پوچھا تو وہ بولی۔

''وہ ایسے کہ تم نے 'بانہیں' نہیں پہنی۔''

''بانہیں کیا ادی میں سمجھی نہیں۔'' سلونی نے کہا تو سکھاں ہنستے ہوئے بولی۔

''ارے پگلی ہمارے ہاں 'بانہیں' کلائیوں میں پہنی جانے والی سفید چوڑیوں کو کہا جاتا ہے۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ کلائی سے کہنی تک 'موہڑ' کہا جاتا ہے اور کہنی سے کندھے تک پہنی جانے والی چوڑیاں 'بنڈ' کہلاتی ہیں۔ یہ بندھن کی علامت ہیں۔ بیوہ عورتیں انہیں اُتار کر چونرے کی دیوار پر سجا دیتی ہیں۔ اور لڑکیاں جو چوڑیاں پہنتی ہیں ان کو 'گورلا' کہتے ہیں۔ سکھاں نے کھڑے کھڑے اسے چوڑیوں کے متعلق اچھی خاصی معلومات فراہم کر دی تھی۔

''ادی میرے پاس 'بانہیں' نہیں ہیں مجھے بھی بانہیں پہننا ہیں۔'' سلونی نے اپنی سونی کلائیاں سامنے کر کے فرمائش کی۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں بانہیں دے دوں گی مگر ابھی پہلے آ کر کھانا کھا لو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' وہ سکھاں کی ہمراہی میں باہر آئی تو سانول اسے اس روپ میں دیکھ کر پلکیں جھپکانا بھول گیا سانول کی آنکھوں میں عیاں ستائش اور چاہت کے رنگ سلونی کو اندر تک مسرت سے سرشار کر گئے۔

خدا نے ان کے آنگن میں پھول کھلایا تو انہوں نے بہت چاؤ سے اس کا نام بلاول رکھا۔ بلاول کی آمد سے زندگی حسین تر ہو گئی تھی۔ چہار سو خوشیوں کے گل کھل اٹھے تھے مگر موسموں کے خدا نے گلزار رہگزاروں میں بدل دیے، کئی برس ہونے کو آئے تھے پیاسی دھرتی کو ایک بوند بھی باش کی نصیب نہ ہوئی تھی۔ گگن کی جانب بادلوں کی تلاش میں اٹھتی نگاہیں مایوسی سے بنجر زمین پہ جھک جاتیں تو یوں لگتا۔ جیسے دھرتی پہ پڑی دراڑیں اپنی اور بلا رہی ہوں۔ ریت کے دیس کے باسیوں کی زندگی ان کے ہاتھوں سے ریت کی مانند پھسل رہی تھی۔ کتنے ہی بچے اور بڑے صاف پانی اور غزا کی قلت کے باعث لقمہ اجل بن چکے تھے اور بن رہے تھے۔ صحرائے تھر ارباب اقتدار کی بے حسی پر تھر تھر کانپ رہا تھا۔

تھر کی ثقافت پہ فیسٹیول منانے والے وہاں کی دستکاریاں ٹکوں میں خرید کر ہزاروں میں بیچنے والے لوگ...... دلکش چولی چنری کے قوس قزح سے رنگ، سرسبز ٹیلوں کے درمیان پر پھلائے ناچتے موروں کے پروں کے رنگ، خودرو پودوں و پھولوں کے رنگ کینوس پر اُتار کر شاہکار بنا کر دنیا بھر میں اپنا نام بنانے والے مصور لوگ...... ہرن کے گوشت کی دعوتیں اڑانے والے لوک گیتوں پر سر دھننے والے لوگ اور سیاحت کے لیے آنے والے سنہری ریت کے طلسماتی حسن کو کیمرے کی آنکھ سے قید کرنے والے لوگ بے حس و خود غرضی کی انتہا پہ تھے۔

قحط کے سبب بہت سے لوگ نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وبائی امراض پھیلنے سے بہت سے لوگ بیمار ہو کر ہلاک ہوئے۔ اماں بھی پیٹ کی بیماری کے باعث چل بسی تھی۔ اماں کی موت نے سلونی کو بہت خوف زدہ کر دیا تھا کیونکہ ڈاکٹر نے اماں کی بیماری کی وجہ کھارا غلیظ پانی بتایا تھا۔

''سانول ایک بات کہوں۔''

''ہاں کہو۔'' سانول نے سوئے ہوئے بلاول کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

''سانول ہمارے گھر کے قریب جو کنواں ہے وہ کھارے پانی کا ہے اور...... اور اماں بھی تو یہی کڑوا پانی پینے کی وجہ سے......'' سلونی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''سلونی تم کہنا کیا چاہتی ہو صاف کہو۔'' اماں کے ذکر پر وہ اُلجھا۔

''سانول میں بہت ڈر گئی ہوں...... کہیں بلاول کو کچھ ہو نہ جائے...... یہاں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں...... ہم...... ہم یہاں سے کہیں دور چلے جاتے ہیں سانول۔'' سلونی نے وحشت زدہ لہجے میں کہا تو سانول اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''پاگل ہو گئی ہو تم سلونی...... مجھے اسی دن کا ڈر تھا کہ تم ایک دن وعدہ خلافی کرو گی۔ گھبرا گئی نا تم۔'' کرب سانول کے لہجے سے جھلک رہا تھا۔

''نہیں سانول نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ رو دی۔

''تمہارا جو بھی مطلب ہو میری بات غور سے سن لو...... میرا جینا مرنا اسی ریت کے نام ہے...... میں کہیں نہیں جاؤں گا یہاں سے اور نہ اپنے جیتے جی بلاول کو کچھ ہونے دوں گا...... تم اسی کھارے پانی سے خوف زدہ ہو ناں؟''

''فکر مت کرو اب سے تم مت جانا کھارے پانی کے کنویں پر میں لے کر آؤں گا صاف اور میٹھا پانی......'' سانول نے پُرعزم لہجے میں کہا اور سلونی کی بات سنے بنا گھر سے صاف پانی کی تلاش میں نکل گیا۔

☆......☆......☆

آگ برساتے سورج کی کرنیں گھاس پھونس کی بنی چونرے کی جالی دار چھت سے اپنا عکس دیکھا رہی تھیں۔ اس جھونپڑے نما چھوٹے سے کمرے کی پانچ فٹ کی دیواریں سانول نے خود اپنے ہاتھوں سے تعمیر کی تھیں اور دیواروں کو چھوٹے چھوٹے رنگین شیشوں سے سلونی نے سکھاں کے ساتھ مل کر سجایا تھا۔

اَن گنت حسین یادیں وابستہ تھیں اس چونرے سے جب ہی تو سلونی کو یہ بہت عزیز تھا یہاں آ کر وہ ہمیشہ ہی پُرسکون ہو جایا کرتی تھی۔ مگر ابھی اس گھڑی وہ شدید گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ سانول کے انتظار میں اس کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ اسے اگر بلاول کی فکر نہ ہوتی تو وہ خود سانول کی تلاش کو نکل جاتی۔

''پانی...... پانی دو ماں۔'' بلاول کی پکار پر وہ سانول کے خیالوں سے باہر آئی اور ایک نظر اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بلاول کو دیکھا جو پیاس سے نڈھال ہو رہا تھا۔ سلونی نے جلدی سے مٹکے سے کٹورے میں پانی انڈیلنا چاہا تو وہ مٹکا خالی تھا۔

سلونی نے بے بسی و ندامت بھری نظروں سے بلاول کو دیکھا اور اس کے ننھے وجود کو بانہوں میں بھر لیا۔ اس کی آنکھوں سے چشمہ پھوٹ پڑا تو اس کے خشک لبوں پر کربناک مسکان ابھری اور اس نے جلدی سے اپنی بھیگی پلکیں اپنے لختِ جگر کے پیاسے لبوں پر رکھ دیں۔

"سانول آ گیا سلونی......" سکھاں کی اطلاع پر سلونی نے سر اٹھا کر سکھاں کو حیرت و مسرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ دیکھا۔

"سانول...... میرا سانول آ گیا...... کہاں ہے سانول؟" سلونی کے سوال کے جواب میں سکھاں زار و قطار رونے لگی تو سلونی کے قدموں تلے زمین رہی اور نہ سر پر آسمان رہا...... وہ بلاول کو سینے سے لگائے دیوانہ وار بھاگتی ہوئی باہر آئی تپتی ریت پر ننگے پاؤں تلے کئی خار دار جھاڑیوں کو روند کر لوگوں کی بھیڑ کو چیر کر سانول تک پہنچی اور ساکت رہ گئی۔

عورتیں اسے دیکھ کر بین کرنے لگیں اور کچھ باتیں...... "بیچاری بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی۔"

سلونی کے پیروں سے لہو بہہ رہا تھا کانٹے اس کے پاؤں میں پیوست ہوگئے تھے مگر کسی کی نظر اس کے پیروں کی جانب نہیں گئی تھی سب کی توجہ کا مرکز اس کی بنجر آنکھیں تھیں۔ جہاں اب اشکوں کا قحط پڑا تھا۔

وہ سکتے کے عالم میں یک ٹک تمام تکلیفوں سے بے نیاز ابدی نیند سوئے ہوئے سانول کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسے ارد گرد کی کوئی پروا نہ تھی۔

گاؤں کی عورتوں نے اس کے بازوؤں سے 'باہنیں' اُتارنا شروع کردیں۔ بندھن کی علامت 'موہڑا' اب دیوار کی زینت تھیں۔

سانول پانی کی تلاش میں بہت دور نکل گیا تھا اور جب پانی ملا تو وہ راستہ بھٹک گیا صحرا کی تیز ہواؤں نے ریت پر اس کے قدموں کے نشان مٹا ڈالے تھے۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ پانی اس کے پاس تھا مگر اس نے پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق سے نہیں اُتارا۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا اسے اپنی پیاس سے زیادہ اپنے پیاروں کی پیاس کی فکر تھی۔ پیاس کی شدت سے وہ نڈھال ہوکر بے ہوش ہوکر گر پڑا اور اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔

"جتنی جلدی تدفین ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے۔" مجمع سے آواز آئی تھی۔

"آہ...... بے چارے سانول کو کیا خبر تھی کہ جو پانی وہ پیاس بجھانے کے لیے بھر رہا ہے وہ پانی اس کے آخری غسل پر استعمال ہوگا۔" کسی نے کہا اور سلونی کا سکتہ ٹوٹ گیا۔

"نہیں! ماں میت کھی غسل ڈین کون دیندس۔"

(نہیں...... میں میت کو غسل نہیں دینے دوں گی)۔

سلونی نے پوری قوت سے چلا کر کہا تو سب کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا...... کچھ کو اس پر رحم آیا تو کچھ عورتیں سرگوشیوں میں باتیں بنا کر لعن طعن کرنے لگیں۔

"توبہ کرو بی بی ہم مسلمان ہیں بنا غسل کے دفن نہیں کرتے۔" کسی نے کہا تو وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"بھوکے پیاسے کو مذہب سے مطلب نہیں ہوتا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو سلونی۔" سکھاں نے کہا۔

"ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ادی......"

"میں پانی کو میت کے غسل پہ ضائع نہیں ہونے دوں گی کیونکہ یہاں پانی کی ضرورت لاشوں سے زیادہ چلتی پھرتی زندہ لاشوں کو ہے۔"

"میں سانول کو غسل نہیں دینے دوں گی۔"

"میں بلاول کو پیاس سے نہیں مرنے دوں گی۔"

"نہیں مرنے دوں گی......" وہ کہتے کہتے زار و قطار رونے لگی ہر آنکھ اس کے درد پر اشک بار ہوئی تو برسوں بعد آسمان بھی اپنا ضبط کھو بیٹھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

"بس کردو رضیہ بہن اب اور کتنا رووَ گی ان کمبختوں کو۔ یہ تو تم خوش قسمت ہو کہ نائمہ کو نوکری مل گئی اور وہ وہیں سیٹ ہو گئی۔ ارے میں تو کہتی ہوں اچھا ہوا بروقت جان چھوٹ گئی۔ ان لالچی لوگوں سے سچ پوچھو تو بٹیا کے قابل ہی نہیں تھے وہ۔ پھر اپنی......

''بس رشیدہ بہن اس بار جو لوگ میں ڈھونڈھ کے لائی ہوں۔تم چراغ لے کر بھی تلاش کرتیں تو نہ مل پاتے۔

فرشتہ صفت ہیں فرشتہ صفت۔'' الفت بی ہمیشہ سے زیادہ پُر جوش نظر آ رہی تھیں۔ارم نے چائے اور سموسے الفت بی کے سامنے رکھے جو ہر بار کی طرح اپنے لائے ہوئے رشتے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے پے تلی ہوئی تھیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے الفت آپا، لیکن مسئلہ پھر وہ ہی ہے۔ہماری حیثیت کا تمہیں پتا ہے ہم زیادہ لمبا چوڑا جہیز نہیں دے سکتے۔رشتے تو پہلے بھی اچھے ہی تھے۔لیکن بات وہیں آ کر ختم ہوتی ہے۔اچھا رشتہ اچھا جہیز مانگتا ہے اور وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔'' رضیہ بیگم ملول ہو کر بولیں۔

''یہ کوئی دسواں رشتہ تھا جو الفت بی ارم کے لیے لے کر آئی تھیں۔لیکن بات بنتے بنتے رہ جاتی۔

''ہوں...... ہوں...... اس کی تو تم فکر ہی نا کرو۔'' الفت بی نے منہ میں ٹھونسا ہوا سموسہ نگلا۔

''اب کی بار ایسا نہیں ہوگا ارے یہی تو میں تمہیں بتا رہی ہوں لڑکے کی ماں نے تو اُلٹا یہ شرط رکھی ہے کہ جہیز والی لڑکی ہی نہیں چاہیے۔الفت بی آنکھیں پھاڑ کے یوں بول رہی تھیں جیسے اسے خود بھی یقین نا آ رہا ہو۔ان کے دل کی آواز کو رضیہ نے زبان دی۔

''حیرت ہے آج کل کے دور میں ایسے لوگ...... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔بہن تم نے خود لڑکا تو دیکھا تھا نا اپنی آنکھوں سے۔میرا مطلب ہے بڑی عمر کا یا خدانخواستہ معذور تو نہیں ہے نا۔'' رضیہ بیگم کو وسوسے ستانے لگے۔چائے میں بسکٹ ڈبوتے ہوئے الفت بی کے چہرے پے ناگواری کی لہر دوڑ گئی۔

''اے بہن تم نے کیا مجھے باؤلی سمجھ رکھا ہے۔کہ ایسے ہی اٹھ کے رشتہ کرانے چل دوں گی۔بھئی میں تو لڑکا،لڑکی جب تک اپنی آنکھوں سے نا دیکھ لوں بات آگے نہیں بڑھاتی۔کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہو جائے نام تو میرا ہی برا ہوگا۔''

''ہاں ایک بار لڑکے اور لڑکی کے گھر والوں کی ملاقات ہو جائے پھر وہ جانیں ان کا کام۔'' الفت بی نے کوئی چھٹا بسکٹ منہ میں ڈالا اور برقعے سے ہاتھ صاف کر لیے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔تم لے آؤ انہیں، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔آخر لڑکی بیاہنی تو ہے نا کتنا بھی ٹھونک بجا کے رشتہ کرو، دکھ، سکھ تو سب نصیب میں ہوتا ہے۔'' رضیہ بیگم ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔کچھ توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوئیں۔

''نائمہ کا رشتہ کتنے چاہ سے کیا تھا میں نے۔اچھے بھلے دیکھے بھالے لوگ رشتے کی پھوپی لگتی تھیں اس کی۔

کیسے غیروں کی طرح پردیس میں جا کر طلاق دے دی میری بچی کو۔رات کی تاریکی میں گھر سے دھکے دے کر نکال دیا ایک بار بھی رحم نہ آیا میری بچی پر۔'' رضیہ بیگم بڑی بیٹی کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئیں۔

''بس کر دو رضیہ بہن اب اور کتنا روؤ گی ان کمبختوں کو۔یہ تو تم خوش قسمت ہو کہ نائمہ کو نوکری مل گئی اور وہ وہیں سیٹ ہو گئی۔ارے میں تو کہتی ہوں اچھا ہوا بر وقت جان چھوٹ گئی۔ان لالچی لوگوں سے سچ پوچھو تو بٹیا کے قابل ہی نہیں تھے وہ۔پھر اپنی نائمہ جیسی ہیرا لڑکی جس گھر میں جائے اس کے نصیب کھل جائیں۔

قدر نہیں کی شمسہ نے اس کی۔'' پھر الفت بی کھسک کر رضیہ بیگم کے قریب آ ئیں اور راز داری سے بولیں۔

''سنا ہے بیٹا کوئی انگریزنی بیاہ کے لایا ہے اور نئی بہو بیگم نے ساس کو گھر سے نکال دیا۔ اب یہاں آ رہی ہے اگلے ماہ بڑی بہو کے پاس، وہ تو ابھی سے سوچ کے بیٹھی ہے ایک دن ٹکنے نہیں دے گی اپنے گھر میں۔

کہہ رہی تھی چھوٹی کا گھر توڑ کے اب اس کا توڑنے آ رہی ہے۔''

روز جھگڑے ہوتے ہیں انور میاں سے اس بات پر۔ اچھا ہے، کچھ اسے بھی سزا ملے اب دردر کی ٹھوکریں کھائے گی تو قدر ہوگی نائمہ کی کہ کیسی بہو کو اپنے ہاتھوں بے گھر کیا۔ اپنی بات ختم کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اچھا بہن اب چلتی ہوں۔ اتوار کی شام پانچ بجے وہ لوگ آئیں گے یاد رکھنا......'' الفت بی برقعہ سنبھالتی باہر نکل گئیں اور رضیہ بیگم کو نئی امید دے گئیں۔

☆......☆......☆

اتوار کے روز الفت بی بڑی مسرور سی ایک دو خواتین کے ساتھ تشریف لے آئیں۔ آنے والی دیورانی جٹھانی تھیں۔

اچھا لباس، سونے کی موٹی موٹی انگوٹھیاں اور چہرے کی بشاشت سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اچھے خاصے مالدار لوگ ہیں۔

رضیہ بیگم کو زیادہ امید نہیں تھی۔ اتنے امیر لوگ ہیں تو اپنی حیثیت کی ہی لڑکی بیاہ کے لائیں گے۔ وہ گھبرا رہی تھیں پتا نہیں کیا ہوگا۔

''یا اللہ میری ارم کا نصیب اچھا کر دے۔'' وہ دعا کرنے لگیں۔ ارم چائے لے آئی۔ سعیدہ بیگم توصیفی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگیں۔

''بہت پیاری بیٹی ہے آپ کی ماشاء اللہ۔'' سعیدہ بیگم نے ارم کے سر پر پیار کرتے ہوئے اسے اپنے پاس بٹھایا۔

''شکریہ......'' رضیہ بیگم کے دل میں امید کی کرن جاگی۔

میرے آذر کے ساتھ جوڑی بہت پیاری لگے گی۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ سعیدہ بیگم نے ارم کا چہرہ تھوڑی سے اوپر اٹھا کر دیکھا۔ انہیں دل سے پسند آئی تھی۔ رضیہ بیگم کے رگ وپے میں اطمینان در آیا۔

''پھر ہم کب آئیں شادی کی تاریخ لینے۔'' سعیدہ بیگم ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کے چکر میں تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اتنی جلدی......'' رضیہ بیگم کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔

''ارے بھئی میرا بس چلے تو کل ہی بیاہ کے لے جاؤں سچ پوچھیں تو بہن اب مجھ سے تنہا نہیں رہا جاتا۔ بہو آئے گی تو گھر میں کچھ رونق بڑھے گی۔'' سعیدہ بیگم نے چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھا۔

''ہاں......ہاں کیوں نہیں اب تو یہ آپ ہی کی بیٹی ہے۔ لیکن میں ذرا پہلے ارم کے ابا سے مشورہ کرلوں، پھر ہی کوئی جواب دے پاؤں گی۔'' رضیہ بیگم متانت سے بولیں۔

''ارے ہاں...... ہاں کیوں نہیں آپ بھائی صاحب سے مشورہ کر کے بتائیے گا۔ لیکن ذرا جلدی ہم بقرعید سے پہلے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ بس فیصلہ ہمارے حق میں ہونا چاہیے۔ مجھے نا نہیں سننی۔

سعیدہ بیگم کے اپنائیت بھرے لہجے پر رضیہ

نہال ہوگئیں۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن اتنی جلدی آخر کچھ تو ٹائم دیں۔ بیٹی کی شادی ہے۔ تھوڑا وقت تو لگے گا تیاری میں۔'' رضیہ بیگم بوکھلا اٹھیں۔

''میں آپ سے کہہ چکی ہوں جہیز کے نام پہ ہمیں ایک تنکا بھی نہیں چاہیے۔ سیدھی سادھی نکاح کی رسم ہوگی اور دو دن بعد ولیمہ جیسے ہمارے پیارے نبی کی سنت مبارکہ ہے۔ میں ان پہ قربان...... سعیدہ بیگم نے دونوں ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ رضیہ بیگم ان کی اعلیٰ ظرفی سے بہت متاثر ہوئیں۔

بڑی چیزیں نا سہی چھوٹی موٹی چیزیں تو ہوں گی ناہم نے تو ابھی ایک سوئی تک نہیں لی۔ یہی ارادہ تھا تاریخ طے کرنے کے بعد ہی خریداری شروع کریں گے۔'' رضیہ بیگم ہچکچاتے ہوئے بولیں۔

ارے میں تو کہتی ہوں چار جوڑے دلہن کے اس کے پہنے کو ساتھ دے دیں۔ باقی کی شاپنگ شادی کے بعد اپنی مرضی سے کرلے گی۔ ویسے بھی لڑکیوں کی شاپنگ تو ختم ہوتی نہیں ہے۔ جہیز ویسے کا ویسا دھرا رہتا ہے اور یہ نئے کپڑے خریدنے میں لگی رہتی ہیں۔''

سعیدہ بیگم نے ہلکے پھلکے انداز میں آج کل کی دلہنوں کا نقشہ کھینچا تو سب کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ارے بھئی ہمارے زمانے میں تو لڑکی پیدا ہوتے ہی اماں جہیز جوڑنا شروع کردیتی تھیں۔ خود ہماری اماں نے پچاس جوڑے ہمیں جہیز میں دیے تھے۔ تھوڑے پہنے باقی پرانے فیشن کے کہہ کر اِدھر اُدھر بانٹ دیے۔ فضول کا خرچہ ہوا اماں کی سالوں کی محنت ضائع گئی۔'' سعیدہ بیگم کی دیورانی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''ارے بہن میں تو کہتی ہوں ہمیں ان فضولیات سے نکل کر اپنے اسلامی طور طریقے اپنانے چاہیں۔

لڑکے اور لڑکی والے دونوں کے لیے آسانیاں رہیں گی۔ سعیدہ بیگم کی خوش گفتاری جاری تھیں۔ رضیہ بیگم دل سے ان کی معترف ہوچکی تھیں۔ ارم کا نصیب واقعی اچھا تھا۔ ان کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔

☆......☆......☆

''کیسی ہو نائمہ میری جان اور ماہ نور کیسی ہے۔'' رضیہ بیگم کے لہجے میں بیٹی اور نواسی کے لیے محبت سمائی ہوئی تھی۔ آج کئی دن بعد ان کی اسکائپ پر نائمہ سے بات ہورہی تھی۔

''ٹھیک ہوں امی آپ سنائیں کیسے لگے وہ لوگ۔'' نائمہ نے گل گوتھنی سی ماہ نور کا منہ ٹشو سے صاف کیا۔ جو اپنی دھن میں مگن کسی کھلونے سے کھیلنے میں مشغول تھی۔

''ارے ماں صدقے میری پیاری جان ماہ نور...... وہ بیٹی کو بھلا کے نواسی کو پچکارنے میں لگ گئیں۔

امی میں پوچھ رہی ہوں ارم کو جو لوگ دیکھنے آئے تھے کیسے لگے آپ کو۔'' نائمہ نے اپنی بات دہرائی۔

''بہت اچھے لوگ تھے بیٹا نیک شریف خاندانی آج کل ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ میری ارم کی قسمت کھل گئی جو اتنے اچھے لوگ ملے۔'' رضیہ بیگم ارم کے سسرال والوں کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

''رہنے دیں امی آپ تو ہر دوسرے انسان سے متاثر ہوجاتی ہیں۔ لوگ اتنے اچھے نہیں

ہوتے جتنے دیکھنے میں لگتے ہیں اور ابھی آپ کی ان سے ملاقات ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کھل جائیں گے یہ بھی رفتہ رفتہ نائمہ تلخی سے بولی۔

کم عمری میں اتنا بڑا دھوکا کھانے کے بعد لوگوں پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔

''نا بیٹا ایسے نہیں کہتے دنیا میں اچھے برے ہر قسم کے لوگ ہیں۔ ضروری نہیں ہر بار ایک جیسے حالات ہوں بس تم دعا کرو ارم کے لیے۔ لو ارم کا نام لیا اور وہ آبھی گئی۔''

''امی آپ نے دوائی لے لی۔ ارم نے جھانک کر پوچھا، پھر انہیں باتیں کرتا دیکھ کر ادھر ہی چلی آئی۔

دبلی پتلی نازک سی ارم اُن کی لاڈلی اور فرمانبردار بیٹی تھی۔ انہیں لگا ارم کو بیاہ کر وہ ایک دم سے اکیلی ہو جائیں گی۔

''کس سے بات ہو رہی ہے۔'' ارم شوخی سے بولی اور لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ماہ نور کو دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔ وہ محبت سے ننھی ماہ نور کو دیکھ رہی تھی آخر خالہ بھی وہ ماہ نور کی۔

''بیٹا ارم کی شادی کے بعد میں اکیلی رہ جاؤں گی تمہارے ابو کہہ رہے ہیں نائمہ کو کہو اب واپس آجائے۔ ماہ نور کو دیکھنے کے لیے بھی ترس رہے ہیں۔ تم نے کیا سوچا پھر آنے کا۔'' رضیہ بیگم نے بیٹی کو آس بھری نظروں سے دیکھا۔

''امی ابھی نہیں، ابھی تو ان لوگوں پہ کیس چل رہا ہے۔ پھر مجھے نیشنلٹی ملنے میں بھی کچھ ٹائم لگے گا۔ میں ایسے نہیں آسکتی۔'' نائمہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''تمہیں کیا ضرورت ہے نیشنلٹی کی کون سا ہمیشہ وہاں رہنا ہے اور کیس کیوں کیا چھوڑ دو اللہ خود ہی ان کو سزا دے گا۔ کیس کا سن کر وہ گھبرا گئیں کہیں دشمنی نہ ہو جائے۔

امی آپ لوگوں کی اسی نرمی کی وجہ سے تو ایسے لوگوں کو ہمت ہوتی ہے دوسروں کی زندگی سے کھیلنے کی۔

''بیٹا تم اور ماہ نور ہم پر بھاری نہیں ہو پھر کیوں وہاں تنہائی جھیل رہی ہو۔ ہم یہاں تمہارے اور ماہ نور کے لیے تڑپ رہے ہیں۔''

رضیہ بیگم رونے لگیں۔ ارم بھی پریشان ہوگئی۔

''امی بس کر دیں۔ باجی بہتر جانتی ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اب رو کر انہیں کمزور مت کریں۔'' نائمہ کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ وہ آنسو ضبط کر رہی تھی۔

''میں بعد میں بات کروں گی۔'' نائمہ آف لائن ہوگئی۔

ارم نے دکھ سے بہن کو دیکھا۔ وہ اب یقیناً وہاں رو رہی ہوگی سات سمندر پار اکیلی ایک سال کی ماہ نور کے سہارے وہ صرف اس لیے رُکی ہوئی تھی کہ اپنے سسرال والوں کو سزا دلوا سکے تاکہ آئندہ کوئی کسی کی بیٹی کو یوں برباد نا کرے اور یہاں آکر وہ کرتی بھی کیا۔ ہمارے معاشرے میں قصوروار ہمیشہ عورت کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔ لوگوں کے طنز، نفرتیں اور سوالیہ نشان اس کے بعد اس کی بیٹی کو بھی سہنے پڑتے۔

وہ بضد تھی کہ ارم کی شادی کے بعد امی ابو اس کے پاس چلے جائیں۔ لیکن وہ دونوں پاکستان چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔

☆......☆......☆

آج نکاح کا دن تھا۔ گھر پر ہی چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گھبراہٹ کے مارے رضیہ بیگم کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ ایک

عرصے سے ارم نے گھر داری سنبھالی ہوئی تھی اب دلہن بنی بیٹی کو دیکھ کر انہیں احساس ہوا وہ تو گھر داری بھول ہی گئی ہیں جیسے۔ اچانک اتنے لوگوں کی میزبانی کے فرائض انجام دینا انہیں کھانا کھلانا اوپر سے دولہا والوں کی جلدی جلدی کی رٹ وہ چکرا کے رہ گئیں۔ لڑکے والوں کی طرف سے لائے گئے مٹھائی کے ٹوکرے اسٹور میں رکھوا کر وہ باہر کی جانب لپکیں۔

نکاح کی رسم شروع ہونے والی تھی۔ ایک نظر باورچی خانے پر ڈالی جہاں کھانے کی دیگوں سے خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ نظیراں ایک حکم کے اشارے پر بیٹھی تھی اِدھر وہ کہتیں اُدھر وہ کھانا لگا دیتی۔ نکاح کے دوران بار بار ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

رہ رہ کے نائمہ کا خیال آ رہا تھا۔ صرف دو سال پہلے اسے ایسے ہی رخصت کیا تھا۔ کیا پتا تھا اس کے نصیب میں اتنے دکھ لکھے تھے۔ دل بار بار ارم کے لیے دعا کر رہا تھا۔ یا اللہ جیسا سمجھ کے ان لوگوں کو رشتہ دیا ہے۔ انہیں ویسا ہی رکھنا۔ اب دوسرا دکھ سہنے کی ہمت نہیں مجھ میں۔

☆......☆......☆

شروع شروع کے دن گزرتے پتا ہی نہیں لگتا۔ آزر واقعی بہت اچھے انسان تھے۔ وہ دل سے ان کی معترف ہوگئی۔ لیکن خوشی کے یہ دن بہت جلدی ہوا ہو گئے بمشکل پندرہ دن رہ کر وہ ہزاروں وعدے اس کے پلو میں باندھ کر سعودی عرب چلے گئے۔

وہ اُداس تو تھی لیکن خوش بھی تھی ساس نندوں نے اب تک ہاتھ کا چھالا بنائے رکھا تھا۔ ارم تشکر سے بچھی بچھی جاتی۔ پہلے سے زیادہ مستعدی سے سارے کام نمٹاتی۔

اگر خوش قسمتی سے اسے اچھے لوگ مل ہی گئے تھے تو ان کی قدر کرنی چاہیے۔ ساس تو ایسی فرشتہ صفت تھی کہ ہر آئے گئے کے سامنے بہو کی تعریف میں زمین، آسمان ملا دیتی۔ ارم مسکرا دیتیں۔

''بس کر دیں امی آپ تو حد کر دیتی ہیں۔ کیا ضرورت ہے۔ سب کو بتانے کی، ارم نے یہ کیا ارم نے وہ کیا۔'' ارم شرمندہ ہو جاتی۔

''ارے کیوں نا کروں لوگوں کو بھی تو پتا چلے کتنی پیاری بہو ڈھونڈ کے لائی ہوں میں۔'' وہ پیار سے کہتیں تو ارم کی جیسے تھکن اُتر جاتی۔

☆......☆......☆

امی ابو تہارہ کرتنگ آ چکے تھے۔ ارم کو تو اب فرصت ہی نا ملتی ان کے ہاں چکر لگانے کی۔ ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد جاتی بھی تو ایک آدھ گھنٹے میں واپس آ جاتی۔ اس بیچ ساس بار بار فون کر کے ایک ایک چیز پوچھتیں۔

''بہو مہمان آئے ہیں فلاں چیز کہاں رکھی ہے۔'' ان کی گھبراہٹ دیکھ کے امی خود ہی کہہ دیتیں۔

''تم جاؤ ارم میں خود ہی چکر لگاؤں گی کل تک۔'' اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی چلی آتی۔

نائمہ اپنی ضد پہ اڑی ہوئی تھی لہٰذا تھک ہار کر امی ابو نے ہار مان لی اور گھر کو بڑا سا تالا لگا کے نائمہ کے پاس کینیڈا چلے گئے۔ ان کے جانے سے ارم کا دل خالی خالی سا ہو گیا۔ چاہے نا بھی ملیں ایک ہی شہر میں ہونے کا یقین تو تھا۔ دونوں واپس آنے کے کتنے ہی وعدے اس کے دامن میں ڈال کر گئے تھے۔

دونوں کو نائمہ کی بہت فکر تھی اس کی طرف سے مطمئن ہو کر جا رہے تھے۔ بہت بدقسمت ہوتے ہیں ایسے لوگ جن کو اپنے دکھ شیئر کرنا نہیں

آتے وہ بھی انہی میں سے تھی۔

☆☆......☆

ارم چائے لے کر ساس کے کمرے میں جانے لگی۔ اندر ان کی کوئی رشتہ دار خاتون آئی ہوئی تھیں۔ صبح سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ الٹیاں ہو رہی تھیں ڈاکٹر نے اسے کل ہی خوش خبری سنائی تھی۔

لیکن اپنی حالت کے پیش نظر وہ خوش بھی نا ہو پائی تھی۔ لگتا تھا الٹیاں کر کر کے جان نکل جائے گی۔ ابھی بھی وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ جب چھوٹی نند نے آ کر مہمانوں کا بتایا۔ ساتھ چائے لانے کو بھی کہا۔ اسے طوہاً و کرہاً اٹھنا پڑا۔

''سنا ہے بہو تو بہت اچھی بیاہ کے لائی ہو خوب خوب خدمتیں کر رہی ہے۔'' رشتہ دار خاتون نے حسد ملے لہجے میں پوچھا۔

''بس اللہ کا شکر ہے اس نے میری سن لی۔ ایک ہی بیٹا تھا بہت گھبرا رہی تھی پتا نہیں کیسے لوگ ملیں۔ آج کل کی بہوؤں کے قصے سن کر تو پریشان ہو جاتی تھی۔ بس پھر اللہ بھلا کرے الفت بی کا جس نے گر بتا دیا بہو ڈھونے کا۔ سعیدہ بیگم فخر سے بتانے لگیں۔

''ارے میں بھی تو سنوں کل کو مجھے بھی چار چار بہوئیں لانی ہیں۔ ایسا کیا گر بتایا الفت بی نے...... رشتہ دار خاتون متجسس ہوئیں۔

''ایک تو یہ کہ بہو ہمیشہ خود سے کم حیثیت کے گھر سے لاؤ ہمیشہ دب کے رہے گی۔''

اور ارم کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ سعیدہ بیگم جیسی خاتون اور یہ ہتک آمیز لہجہ۔ ایسا غرور نہیں میں نے شاید کچھ غلط سنا ہے۔

''دوسرا یہ کہ لڑکی والوں سے جہیز مت لو ساری عمر وہ احسان میں دبے رہیں گے۔ اور بہو بھی ساتھ رہے گی۔ بھئی انہیں دو چار چیزوں پر تو لڑکی اتراتی پھرتی ہے۔ آتے ہی الگ گھر کا ڈھول پیٹنے لگتی ہے۔ اب میرا اکلوتا بیٹا بہو آ کر لے اڑتی تو میں تو ہاتھ ملتی رہ جاتی۔

آخر دو دو بیٹیوں کی شادی کرنی ہے ان کا جہیز بھی بنانا ہے۔ عائشہ کی ساس تو کہہ رہی تھیں دونوں بہنیں دیوارنیاں ہی بنے گیں۔ الگ الگ چیزیں دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ٹی وی ایک فرج دے دو دونوں ساتھ مل کے استعمال کر لیں گی۔

میں نے تو صاف منع کر دیا۔ بھئی میری بیٹیاں کل کو کسی کی محتاج کیوں بنیں۔ اپنی ضرورتوں کے لیے دوسرے کا ہاتھ تکتی رہیں۔ بھئی میں تو سوئی سے لے کر سونے تک دوں گی دونوں کو الگ الگ، اور سچ تو یہ ہے ابھی جتنا آزر سے نکلوا سکتی ہوں اتنا تو دے دوں کل کو بھائی بھاوج کے اپنے بچے ہو گئے۔ تو میری یتیم بیٹیوں کو کون پوچھے گا۔

ارم کو لگا اس کی ٹانگیں اب مزید بوجھ نہیں اٹھا سکیں گی۔

اُس کو محسوس ہو رہا تھا جیسا جو کچھ اس نے سنا وہ حقیقت نہیں بلکہ کوئی بہت ہی ڈراؤنا خواب تھا۔

چائے کی ٹرے اس کے ہاتھوں میں کپکپا رہی تھی۔ اُس کو یہ دکھ مارے ڈال رہا تھا کہ اس کے ساتھ محبت اور خلوص کا رویہ محض ڈھونگ تھا۔ اس کو اپنے سے کم تر جان کر بہو کے مرتبے پر بٹھایا گیا تھا۔ اور بس اس سے زیادہ وہ کچھ اور نہ سوچ سکی اور لہرا کر ساس کے دروازے پر ہی ڈھیر ہو گئی۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

احمد سجاد بابر

مشال اور شنو

''کیا غریبوں والی باتیں شروع کر دیتی ہو رخشی تم بھی، جلدی آیا کرو......اور ہماری کلاس میں دن رات کو شروع ہوتا ہے، پتہ بھی ہے تمہیں اور مشال کا تو ہے سب کچھ، اس کے لیے ہی محنت کر رہا ہوں، اسی وجہ سے دیر ہو جاتی ہے۔'' شمیم نے ذرا......

بندے کو رب سے ملاتا، ایک یادگار ناولٹ

''شنو کی ماں، روٹی لے آ، وڈی بھوک لگی ہے۔''

اللہ وسایا نے سر سے صافہ اتار کر چہرہ صاف کیا اور جھلنگا سی چارپائی میں گر سا گیا۔

''سوہنے ربا، دو بوند اس پاسے بھی بھیج دے، سانس بھی نہیں لیا جاتا اب تو، ڈنگر ڈھور سب پیاسے ہیں مالکا۔''

اللہ وسایا نے آسمان کی طرف دیکھ کر خود کلامی کی۔

''شنو کے ابا، کیا سوچا پھر تم نے''

حاجراں نے چنگیری میں تازہ روٹی، اچار کی کٹوری، دال اور کٹے پیاز اپنے شوہر کے آگے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کس بارے پوچھ رہی ہو شنو کی ماں''

اللہ وسایا نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب زیادہ بھولا نہ بن وسو، وہی رات والی بات کا پوچھ رہی ہوں''

حاجراں جب غصے میں ہوتی تو شوہر کو نام سے مخاطب کیا کرتی تھی۔

''اوئے میں سات نسلوں سے لوہار، لوہا کوٹتے عمر گزر گئی میرے باپ دادا کی، زیادہ سُفنے نہ دکھا مجھے، کمہار ہی رہنا ہے ہم نے، سمجھ گئی نا تُو۔۔۔موری کی اینٹ چوبارے نہیں لگ سکتی، چل اب دماغ نہ کھا میرا''

اللہ وسایا نے پانی پی کر گلاس پٹخا۔

''دیکھ شنو کے ابا، نکڑی کی گل من لے، آٹھ پاس کر لی ہے اس نے، داخل کرا دے نال والے پنڈ میں، شوق ہے اس کا، اس کی ساری سہیلیاں اگے داخلہ لے رہی ہیں، گل من میری، ضد چھوڑ دے۔''

حاجراں نے لجاجت سے کہا، اکلوتے کوٹھے میں کواڑ کے پیچھے کھڑی شہناز کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''او بھلا آئے جائے گی کیسے، میں بھٹی میں سارا دن بھاہ جلاؤں گا کہ تیری دھی کی چاکری

کروں گا، بتا مجھے۔۔۔''

اللہ وسایا نے اپنی طرف سے حاجراں کا راستہ بند کر دیا۔

''تجھ پہ کوئی بوجھ نہیں ہوگا شنو کے ابا، ساری بالڑیوں نے مل کر طافو رشکے والے سے بات کر لی ہے، وہ سکول چھوڑ بھی آیا کرے گا اور ٹیم پہ لے بھی آئے گا''

حاجراں نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔

''سارا کام تو پہلے ہی تیار ہے تو مجھ سے پوچھنے کی کیا لوڑ تھی، کر لو تم ماں دھی اپنی مرضی، مگر میں قاری صاب سے پوچھے بنا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔۔۔''

اللہ وسایا نے گھور کے اسے دیکھا اور صافہ اٹھا کے نلکے کی طرف چل پڑا، کچے کمرے کے دروازے سے لگی شہناز نے مارے خوشی کے چیخ ماری اور بھاگ کر ماں سے لپٹ گئی، اسے یقین تھا کہ قاری صاحب منع نہیں کریں گے۔

☆......☆......☆

''اعتماد ہی وہ ستون ہے جو بیٹیوں کی شخصیت مکمل کرتا ہے، ان پر اعتماد کیا جائے، ان کی خواہش نہ ٹالی جائے، ان کو جھڑکا نہ جائے، ورنہ وہ چور راستے تلاش کریں گی۔۔۔''

رخشندہ انصاری نے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بات مکمل کی۔

''مگر میم کیا اندھا اعتماد نقصان دہ ثابت نہیں ہو سکتا۔۔۔؟''

پہلی رو میں بیٹھی واصفہ نے سوال کیا۔

''اچھا سوال ہے، اس کا سادہ سا جواب ہے کہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ دیکھو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ علم نفسیات کے اصولوں پر بچوں کی تربیت کی جائے اور وہ بگڑ جائیں، یہ تو وہ علم ہے کہ جس نے انسان کے اندر تک جھانک لیا ہے، شخصیت کی ساری پرتیں کھول کر رکھ دی ہیں، شعور اور تحت الشعور کا ہر راز دیوار پر لکھ دیا ہے، تو بھلا کیسے ممکن ہے کہ آپ کا بچہ یا بچی راہ سے بھٹک جائے، اس علم نے تو انسان کو کھلی کتاب کی مانند بنا دیا ہے، ایک ایک لفظ واضح، ایک ایک سطر نمایاں، جس اینگل سے چاہے پڑھ لو''

پروفیسر رخشندہ انصاری نے ایم اے نفسیات فائنل کی کلاس کی سٹوڈنٹ واصفہ توحید کو ٹھوس انداز میں جواب دیا۔

''میڈم، اگر خواہش ناجائز ہو تو کیا وہ بھی پوری کر دی جائے؟''

فیصل نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا، وہ ہمیشہ سے ہی پروفیسر رخشندہ کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتا تھا اور یہ بات پروفیسر رخشندہ بخوبی جانتی تھیں، جبھی اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''جائز اور ناجائز کے پیمانے ہر طبقے کے اپنے ہیں، ہو سکتا ہے بچے کی خواہش پوری نہ کر سکنے کی وجہ سے ہم اس پر ناجائز کا ٹھپہ لگا دیتے ہوں''

رخشندہ انصاری نے فیصل کے بیک گراونڈ پر طنز کیا، وہ رحیم یار خان کے ایک گاؤں سے تعلق رکھتا تھا۔

''جائز ناجائز کا پیمانہ کوئی خاص طبقہ نہیں بلکہ مذہب ہے جو جائز ناجائز کی توجیح پیش کرتا ہے۔۔۔''

فیصل نے تحمل سے جواب دیا۔

''جائز ناجائز کی یہ سو کالڈ ڈیفی نیشن بھی ہماری اپنی اختراع ہے''

میڈم رخشندہ نے فیصل کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''سوری میڈم، ہماری نہیں بلکہ پاک کتاب اور سنتِ نبوی نے یہ رہنمائی ہمیں دی ہے، ہم لاکھ پڑھ لکھ جائیں مگر اندر کے مسلمان کو کیسے کھرچیں، کیسے مٹائیں روح میں رچے بسے ایمان کو، چاہے وہ جتنا بھی کمزور ہے، موجود تو ہے نا۔''

فیصل اڑا ہوا تھا۔

قریب تھا کہ پروفیسر رخشندہ انصاری پھٹ پڑتیں کہ وانیہ نے مداخلت کی جو پریویس کی پوزیشن ہولڈر تھی، اس کے سوال ہمیشہ سوچ و بچار پر مبنی ہوتے تھے۔

اس وقت بھی اُس نے فیصل پر کیے گئے طنز کو تحلیل کرنے کے لئے بات تبدیل کی۔ اسے پتہ تھا کہ فیصل سخت جواب ضرور دے گا جس کا نقصان فیصل کو ہی پہنچے گا۔

''مگر میم کسی بھی علم کی حد تو ہے ہی نہیں، کیا پتہ تا حال کتنا کچھ آشکار ہونا باقی ہے، ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جو اصول آج ٹھیک ہیں وہ آنے والے کل میں بھی درست ہی ہوں گے''

''یہ بات تمہاری ٹھیک ہے۔۔۔ مگر کوئی بھی علم جزوی طور پر تو غلط ہو سکتا ہے، کبھی بھی کلی غلط کیسے ہو سکتا ہے، آج سائنس نے ڈی این اے کھول لیا ہے، پیدائش سے پہلے ہی بیماریوں کا علاج ممکن ہو گیا ہے، من چاہی شکل کا بچہ حاصل کرنا ممکن ہو گیا ہے، انسانی سوچ کی گنجلک گتھیوں

کو سلجھا لیا ہے، سگمنڈ فرائڈ جیسے دیوانوں نے ساری عمر دان کر دی اس علم کے لئے، بھلا کیسے ممکن ہیں کہ ان ماہرین کی تھیوریز غلط ہوں۔۔"

پروفیسر رخشندہ نے جھنجلا کر کہا۔ وہ اندر سے ابھی تک فیصل کے سوال پر کھول رہی تھی اور فیصل کا دل چاہ رہا تھا کہ میڈم کا نام ہی "سگمنڈ فرائڈ" رکھ چھوڑے۔

کلاس میں ایک گھمبیر تا سی چھا گئی، کچھ سٹوڈنٹس کے چہرے پر سوچوں کے گھنے جال بُنے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کلاس کا ٹائم ختم ہو گیا۔

☆......☆......☆

"ویکھ مری دھی رانی، سدھا جانا ہے، سدھا گھر آنا ہے، وڈی مشکل سے اجازت دی ہے ترے پیو نے، جانتی ہے ناں تو، تیری غریب ماں تجھے اور تو کچھ نہیں دے سکتے پر تجھے پڑھائے گی ضرور جب تک تو پڑھنا چاہے گی، اور اچھا اچھا خوب سارا پڑھنا ہے، دھیان نال"

حاجراں نے شہناز کی کس کر چوٹی بناتے ہوئے نم آلود آواز میں کہا۔ حاجراں کو اپنی بیٹی میں اپنا بچپن نظر آتا تھا، اسے بھی پڑھنے کا بہت شوق تھا مگر غربت اس کے سارے خواب نگل گئی۔

شنو کو ماں کی باتیں تو سمجھ نہ آئیں مگر اس کو اتنا سمجھ آ گیا کہ ماں کو دکھ نہیں دینا، اس نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔ باہر سے رکشے کا ہارن سنائی دیا تو شنو جلدی جلدی بستہ سنبھالنے لگی۔

"جا میری دھی رانی، رب راکھا، اللہ دے حوالے، خیر نال جا، خیر نال آ میری بکڑی۔۔"

حاجراں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، یہی ایک فصل تو وا فراگتی ہے غریب بنجر سرزمینوں پر۔۔!!

"شنو رک ذرا۔۔"

حاجراں نے حیرت سے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا تو اللہ وسایا آتا دکھائی دیا، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ سو رہا ہے، اسی وجہ سے دکان سے بھی لیٹ ہے، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے روتا رہا ہے، اس نے ایک مُڑا تڑا دس روپے کا نوٹ شنو کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''کیا خالی جائے گی میری پتر، جا شے کھا لینا کوئی، چل میں تجھے رکشے میں بٹھا کے آتا ہوں، پریشان نہ ہونا، اڈھے گھنٹے کا تو سفر ہے سارا، چل شاباش''

اللہ وسایا نے بیٹی کا بستہ اٹھالیا اور اس کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف بڑھا۔

''شنو پُتر، محنت کرنا، اپنی استانیوں کی عزت ماں باپ سے بڑھ کر کرنا۔ مری نکڑی، تیرے باپ نے صرف عزت کمائی ہے، اس کی لاج رکھنا مری بچی''

اللہ وسایا کو معلوم تھا کہ ان میں سے کچھ باتیں ابھی شنو کو سمجھ نہیں آئیں گی، مگر یہ باتیں اس کے اندر نقش ضرور ہوں گی اور کسی مشکل گھڑی روشنی کی طرح اس کو راستہ دکھائیں گی۔ قاری صاحب بھی کہا کرتے تھے بچوں کے سامنے دہرائے گئے الفاظ بظاہر ہواؤں میں گم ہوتے نظر آتے ہیں مگر وہ ان کے اندر کنڈلی مار کے بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے موسم میں انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتے ہیں۔ لفظ اپنی نسل بڑھاتے ہیں، اچھے لفظ رائیگاں نہیں جاتے۔

حاجراں کی آنکھوں سے جیسے چھاجوں پانی برس رہا تھا اور شنو بھی حیرت سے کبھی باپ کو دیکھتی، کبھی مٹھی میں دبے پرانے دس کے نوٹ کو، اس نے بھلا کب یہ منظر دیکھا تھا گھر میں۔

''دروازہ بند کر لے شنو کی ماں، دکان سے پہلے ہی گھنٹہ لیٹ ہوں میں اور آئندہ لیٹ ہی دکان کھولا کروں گا میں۔۔۔''

''مری بچی رب سوہنے کی امان، سچے رب کی چھتری کے حوالے۔۔۔''

حاجراں کے لب ایک ہی گردان کیے جا رہے تھے۔۔!!

☆......☆......☆

کرماں والی رحیم یار خان کی تحصیل لیاقت پور کا ایک دور افتادہ گاؤں تھا جس کی آبادی چند سو نفوس پر مشتمل تھی۔ زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی سے منسلک تھے، اسی گاؤں میں اللہ وسایا کا خاندان کئی نسلوں سے مقیم تھا، اللہ وسایا اپنے پیشے کی وجہ سے وسّو لوہار کے نام سے مشہور تھا۔

گاؤں کے درمیان برگد کے گھنے درخت کی چھاؤں میں اس کی بھٹی لگی ہوئی تھی جہاں وہ صبح سویرے ہی اپنے اوزار سمیت آ بیٹھتا تھا، سارا دن وہ بھٹی جھونکتا، درانتیاں، پھاوڑے، ہل، ترپھالی، کلہاڑیاں، چھریاں، چارا کاٹنے والے ٹوکے دہکا کر کوٹتا رہتا جس کے بدلے میں اسے تھوڑے بہت معاوضے کے علاوہ چند گھروں کی طرف سے گندم کی فصل کے موقع پر کچھ اناج مل جاتا تھا جو تین افراد پر مشتمل اس کے گھرانے کے لئے کافی تھا۔ وہ مزاجاً وہ ایک حساس مگر صابر و شاکر اور اللہ پر توکل رکھنے والا بندہ تھا اور اپنے حال میں خوش تھا۔ کبھی کبھی کسی واقعے کی وجہ سے وہ افسردہ ہوتا تو اس کی یہ اداسی کئی دن تک برقرار رہتی تھی۔

اس کی کھلی دکان پر سارا دن گاؤں کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا، گاؤں کے بچے بڑے سب کا وہ مرکزی ٹھکانہ تھی، بزرگ بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے اور گزرے وقت کو یاد کر کے آہیں بھرتے

رہتے، بچے ایک طرف کھیلتے رہتے یا پھر بھٹی میں دہکتی سرخ آگ کی لپلپاتی زبان کو حیرت اور خوف سے دیکھتے رہتے، کسی وقت کوئی ماں اپنے بچے کو ڈھونڈتی وہاں آنکلتی اور پھر صلواتیں سناتی بچے کا بازو پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی وہاں سے لے جاتی۔

کرماں والی میں پچاس سال سے ایک دینی مدرسہ کام کر رہا تھا، اس کے مدرّس ''قاری صاحب'' ہی اس کے بانی تھے، جانے بھٹکتے ہوئے کہاں سے آئے، یہیں ڈیرے ڈال لئے اور تمام عمر کرماں والی کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کردی، کسی دیوتا کی طرح ان کی عزت کی جاتی تھی، جانے کہاں کہاں سے لوگ ان کے پاس آتے اور دعاؤں کا خزانہ سمیٹ لے جاتے، وہ ملحقہ مسجد میں امامت کرتے، فجر اور عصر کے بعد بچوں کو سیپارہ پڑھاتے اور نماز، کلمہ، دعائیں یاد کراتے، دن بھر وہ اپنے حجرے تک ہی محدود رہتے اور اشد ضرورت کے علاوہ باہر نہ آتے، ان ہی کی کوششوں سے کرماں والی میں لڑکیوں کے لئے مڈل سکول بنا تھا، ساتھ کے گاؤں کوٹلہ میں ہائی سکول قائم ہونے کے بعد پہلی میٹرک کلاس شروع ہو چکی تھی، غرض کہ کرماں والی گئے زمانوں کی خستگی اور آنے والے دور کی جدت کے درمیان کھڑا حیرت سے پلکیں جھپک رہا تھا، اس معصوم بچے کی طرح کہ جو میلے میں والدین سے بچھڑ گیا ہو اور اب ایک طرف کھڑا رو رہا ہو۔ اسے سمجھ نہ آرہی ہو کہ کدھر جائے۔۔۔!!

اللہ وسایا کی ایک ہی بیٹی تھی، شہناز، جسے وہ پیار سے شنو کہتا تھا۔ مڈل کا امتحان اس نے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا، اسے پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا، اللہ وسایا چاہتا تھا کہ شنو خوب سارا پڑھے، جگر چوستی آگ کی بھٹی سے چھٹکارے کا یہی ایک راستہ تھا مگر گاؤں کے بڑے بوڑھے حقے کے کش لیتے ہوئے جب موجودہ دور کی بے راہ روی کا ذکر چھیڑتے، تعلیم کے ساتھ بدکرداری کو لازم و ملزوم ٹھہراتے اور بیت چکے ان پڑھ زمانے کی خوبیاں گنواتے تو اسے تعلیم سے ڈر لگنے لگتا، وہ کڑا ارادہ کر لیتا کہ شنو کو آگے داخلہ نہیں دلوانا مگر حاجراں کی آنکھوں میں جلتی امید اور بیٹی کی اداسی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دے اور پھر اس نے اپنا فیصلہ بدل بھی ڈالا، حاجراں یا شنو کے بھروسے پر نہیں بلکہ اس نیلی چھتری والے پر بھروسہ کرتے ہوئے جس کے آگے وہ دن میں جانے کتنی بار ماتھا ٹیکتا تھا۔ یہی بات اس سے قاری صاحب نے کی تھی۔

☆......☆......☆

''ارے بھئی میڈم جی، کیا بات ہے، آج بڑی اپ سیٹ نظر آرہی ہیں۔۔۔؟''

شمیم انصاری نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے رخشندہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کچھ خاص نہیں، آگئے آپ۔''

رخشندہ انصاری نے ہڑ بڑا کر کہا، سوچوں میں گم اسے پتہ ہی نہ چلا کہ شمیم کب آئے۔

''آپ آج جلدی نہیں آگئے۔''

اس نے دیوار گیر کلاک پر نظر دوڑائی۔

''ہاں بیگم، آج رات کو ڈنر ہے فارن ڈیلیگیشن کے ساتھ، اس وجہ سے جلدی آ گیا، بنگلہ دیش میں گارمنٹ سیٹ اپ کا سوچ رہا ہوں، ٹیکس کی چھوٹ ہے، مزدور اور بجلی سستی ہے، اس کے علاوہ انہیں یورپ میں ڈیوٹی فری رسائی بھی حاصل ہے تو ایکسپورٹ سستی پڑے گی''

شمیم انصاری نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''مشال کا کیا سوچا آپ نے، کہاں ایڈمیشن

دلوانا ہے، دن گزرتے جا رہے ہیں"
رخشندہ نے ملازم کو چائے کا کہنے کے لئے بیل دی۔
"بھئی اس میں بھلا سوچنے کی کی بات ہے، مشال کی اپنی خواہش بھی سینٹ پال میں ایڈمیشن کی ہے، اس کی تمام کلاس فیلوز بھی وہیں جا رہی ہیں۔ پھر سسٹم ہے اس ادارے کا، برینڈ نیم ہے، کوالیفائڈ فیکلٹی ہے، لاکھوں میں فیس ہے تو ڈیلیور بھی کرتے ہیں، زیادہ سوچنے کی بھلا کیا ضرورت ہے"
شمیم انصاری نے سارا مسئلہ چٹکی بجاتے حل کر دیا۔
"ہاں کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں، چلو ٹھیک ہے، میں شیڈول پتہ کرتی ہوں ان کا، میری ایک کولیگ کا بیٹا وہاں پڑھتا ہے، میں معلوم کرتی ہوں اس سے"
رخشندہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ یہ مسئلہ کئی دن سے اسے پریشان کر رہا تھا۔ شمیم رات گئے گھر آتا تو اس سے ملاقات نہ ہو پاتی۔ جس کی وجہ سے ابھی تک مشال کسی سکول نہ جا سکی تھی۔
شمیم انصاری شہر کے بڑے صنعت کار تھے، ان کی بیگم رخشندہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھی، یہ شوق بھی وہ ضد کر کے جاری رکھے ہوئے تھی ورنہ شمیم اس حق میں نہیں تھا لیکن رخشندہ محض سٹیٹس سمبل کے طور پر یہ جاب کر رہی تھی۔ بہاولپور کینٹ میں شاندار وسیع و عریض کوٹھی "مشال ولا" آن بان سے سر اٹھائے امارت کی داستان سنا رہی تھی۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی "مشال انصاری" جس کو وہ دل و جان سے زیادہ چاہتے تھے، اس کی کوئی خواہش ہونٹوں پر آنے کے بعد تشنہ نہ رہتی۔
رخشندہ اپنی بیٹی کی تربیت مثالی طریقے سے کرنا چاہتی تھی۔ ساری عمر دوسروں کے بچوں کی رہنمائی کرتے، مشورے دیتے گزری، اب اپنی بیٹی کو وہ ایک رول ماڈل بنانا چاہتی تھی۔ نفسیات کی پروفیسر ہو کر اپنی بچی کی تربیت میں کمی رہ جائے تو اس کے علم پر بٹہ لگ جانا تھا جو اسے گوارا نہ تھا، اسے نفسیات کے علم پر جنون کی حد تک اعتماد تھا۔
"مشال ہے کہاں، اس سے تو ملاقات کوئی دن گزر جاتے ہیں"
شمیم انصاری نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے پاؤں پھیلائے۔
"اپنے کمرے میں ہے، موبائل پر شاید کسی دوست سے باتیں کر رہی ہے۔۔۔ آپ لیٹ گھر آتے ہیں، جلدی آئیں تو ملاقات بھی ہو جایا کرے"
"کیا غریبوں والی باتیں شروع کر دیتی ہو رخشی تم بھی، جلدی آیا کرو۔۔۔ اور ہماری کلاس میں دن رات کو شروع ہوتا ہے، پتہ بھی ہے تمہیں اور مشال کا تو ہے سب کچھ، اس کے لئے ہی محنت کر رہا ہوں، اسی وجہ سے دیر ہو جاتی ہے"
شمیم نے ذرا ناگواری سے کہا۔
"اچھا اچھا، پھر لمبی تقریر نہ شروع کر دیجیے گا، پتہ ہے مجھے کہ سب آپ کی بیٹی کا ہے"
رخشندہ نے چڑ کر کہا۔

☆......☆......☆

"شنو کے ابا، آج رشکے والا چھٹی پہ ہے۔۔۔"
حاجراں نے ڈرتے ڈرتے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، اسے جھاڑ پڑنے کا پکا یقین تھا مگر

اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔

''او بھلیے لوکے، میں ہوں نا، میں خود چھوڑ بھی آوں گا اپنی نکڑی کو اور لے بھی آوں گا''

اللہ وسایا نے بالکل نارمل انداز میں کہا جیسے یہ عام سی بات ہو۔

''وسو، تو کتنا بدل گیا ہے۔۔۔''

حاجراں نے خوشی سے کہا۔

''اوئے پاگلے، جب ایک کام شروع کر دیا ہے تو اسے اچھے طریقے سے توڑ پہچانا چاہیے، میرا رب بھی خوش ہوتا ہے اس سے، پتہ ہے کل قاری صاب کیا کہہ رہے تھے۔۔۔ اپنے گھر والوں کا خیال رکھنا، ان پر خرچہ کرنا اوّل نمبر کا صدقہ ہے۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ گل پہلے سے میرے اندر تھی، مجھے پتہ تھا اس بات کا، کیسے پتہ تھا، یہ مجھے ملوم نہیں، پر مجھے پتہ تھا اس کا''

اللہ وسایا نے نلکے کی ہتھی زور زور سے چلاتے ہوئے کہا، گھر کے ویہڑے میں اس نے کچھ ترکاریاں بو رکھی تھیں، اس وقت انہی کو پانی دے رہا تھا۔

''تو کتنا اچھا ہے وسو۔۔۔ ہماری دھی پڑھ جائے گی تو سب کچھ بدل جائے گا، دیکھنا تم''

حاجراں نے خواب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو بھی رہی جھلی کی جھلی''

اللہ وسایا نے پیار سے کہا۔

''اوئے پاگل، اللہ بخشے دادا جی کو۔۔۔ بڑے سیانے انسان تھے، مجھے یاد ہے کہ مجھے سمجھاتے تھے کہ یہ جو پڑھائی ہوتی ہے نا، یہ عقل بڑھانے کے لئے ہوتی ہے، پیسہ کمانے کے لئے نہیں ہوتی، پیسہ تو ان پڑھ بھی کما لیتے ہیں۔۔۔ اس دور کے دو جماعت پاس تھے میرے دادا جی، اس ویلے تو مجھے ان کی گل پلّے نہیں پڑتی تھی مگر آج پوری طرح سمجھ آ گئی ہے''

اللہ وسایا خوشگوار موڈ میں تھا، اس موڈ میں اس کی باتیں کسی اور ہی جہان کی باتیں لگا کرتی تھیں حاجراں کو۔!!

''اچھا تُو بے فکری ہو جا۔۔۔ میں سیکل پہ چھوڑ آوں گا شنو کو اور لے بھی آوں گا''

شنو کو سکول چھوڑنے کے بعد اللہ وسایا نے برگد کے درخت کے نیچے اپنی دکان سجالی اور کام شروع کر دیا، گندم کٹائی کے دن قریب تھے تو کام کا رش تھا، اسے پتہ ہی نہ لگا کہ کیسے دن گزر گیا، اچانک اسے ظہر کی نماز یاد آئی تو ہڑبڑا کر کام چھوڑ کر اٹھ گیا، ساتھ ہی لگے نلکے سے وضو کیا اور ایک سائیڈ پر بنے چبوترے پر بچھی صف پر کھڑا ہو کر نماز کی نیت کرنے ہی لگا تھا کہ چھم سے اس کے دماغ میں شنو کو سکول سے لانا یاد آ گیا، وہ بوکھلا کر گرتا پڑتا چپل پہن کر سائیکل کی طرف بھاگا، اس وقت اس کے حواس پر بس شنو سوار تھی۔

''اوئے وسو، کہاں بھاگ پڑا ہے تُو، اوئے کھوتے دے کھر نماز تو پڑھ لے''

ایک بزرگ نے ہانک لگائی۔

''چاچا رحمت، نماز قضا ہو گئی تو مل جائے گی، اللہ نہ کرے کہ میری بیٹی مجھ سے قضا ہو، اس کا کوئی مول نہیں۔۔۔''

اللہ وسایا نے سائیکل کے پیڈل مارتے مارتے جواب دیا۔

☆......☆......☆

اولیول میں میتھ کی کلاس جاری تھی، سبھی طالب علم گروپس بنا کر پریکٹس میں مصروف تھے۔ مس مناہل اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی سٹوڈنٹس کا جائزہ لے رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھی اور ٹہلتی ہوئی پیچھے بیٹھے گروپس کی طرف گئی۔

''مشال، ذرا مجھے چیک کرائیں، کہاں تک کام مکمل کر چکیں آپ''

ٹیچر نے مشال سے مخاطب ہو کر کہا۔

''وہ ٹیچر۔۔۔ دراصل۔۔۔''

مشال نے ہڑبڑا کر کہا۔

''آپ باہر آئیں ذرا نوٹ بک کے ساتھ''

کلاس کام چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ تھی۔

''آپ لوگ پلیز اپنا کام کریں''

ٹیچر مناہل نے نرمی سے سٹوڈنٹس کو کہا۔ مشال کی نوٹ بک پر ایک بھی پرابلم حل نہیں کیا گیا تھا۔ ٹیچر کا دماغ غصے سے کھول اٹھا۔

''کیا کر رہی تھیں آپ آدھے گھنٹے سے، بتائیں مجھے''

ٹیچر نے ضبط کرتے ہوئے لہجہ معتدل رکھا مگر مشال نے کوئی جواب نہ دیا۔

''آپ بتائیں رمشاء، کیا کر رہی تھی مشال''

ٹیچر مناہل نے اس کے گروپ کی دوسری سٹوڈنٹ سے پوچھا

''وہ میم۔۔۔''

رمشاء ہچکچا رہی تھی

''جو میں آپ سے پوچھ رہی ہوں وہ بتائیں''

اب ٹیچر کا لہجہ سخت ہو چلا تھا۔

''میم یہ سیل فون میں مصروف تھی۔''

رمشاء نے نا صرف بتا دیا بلکہ اس کے بیگ کے نیچے رکھا سیل فون بھی نکال کر ٹیچر کے حوالے کر دیا، غصے کے مارے جس کے ماتھے پر شکنیں اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

''آپ کے پیرنٹس سے بات کرنا پڑے گی مشال، یہ پہلی دفعہ نہیں ہے''

ٹیچر مناہل کا دماغ کھول رہا تھا۔ وہ سیدھی پرنسپل آفس کی طرف چل دی۔

''اٹس او کے ٹیچر۔۔۔''

مشال نے لاپروائی سے کندھے اچکائے

''دیکھیں مناہل، ہمیں اگنور کرنا پڑے گا، مجبوری ہے ہماری، ہم افورڈ نہیں کر سکتے پیرنٹس کو ناراض کرنا''

مسز فیضان نے مناہل کو سمجھایا۔ اسے اپنی سیٹ عزیز تھی۔

''میڈم ہو سکتا ہے کہ مشال کے پیرنٹس کو نا بتایا جائے تو وہ اس بات کو مائنڈ کر لیں کہ انہیں آگاہ کیوں نہیں کیا گیا''

مناہل بھی اسی سسٹم کا حصہ تھی اور سمجھتی تھی کہ کون سی رگ دبانے سے پرنسپل پر کیا اثر ہوگا۔

''ہاں، بات تو آپ کی ٹھیک ہے، اوکے، میں کرتی ہوں رابطہ، دیکھا جائے گا''

مناہل کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

☆......☆......☆

''مسز فیضان، ہم اتنی ڈونیشن، اتنی فیسز اس وجہ سے نہیں دے رہے کہ آپ ہمیں بلا کر یہاں بٹھا لیں، اتنا ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔۔۔ اور آپ کو جرأت کیسے ہوئے میری بیٹی کے سیل فون پر اعتراض کرنے کی، آپ لوگوں نے گلی محلوں کے غریب غرباء والے تھرڈ کلاس سکولز والی حرکت کی ہے۔۔۔''

غصے کے مارے رخشندہ انصاری کی آواز کانپ رہی تھی، اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

''سوری میڈم، وہ دراصل ہم نے مناسب سمجھا کہ آپ کو بتا دیا جائے۔۔۔''

پرنسپل نے لجاجت سے کہا۔

''شٹ اپ۔۔۔آپ کیا کہنا چاہتی ہیں کہ ہماری بیٹی کے سیل فون کا ہمیں علم نہیں ہے؟ ہم نے خود سیل لے کر دیا ہے اسے اعتماد ہے ہمیں اپنی بیٹی پر۔

میں سائیکلوجی کی پروفیسر ہوں، مجھے پتہ ہے کہ اعتماد توڑنے والیاں کن علاقوں میں رہتی ہیں، ان کا تعلق کس طبقے سے ہوتا ہے، جو سات پردوں میں یارانے لگاتی ہیں۔ میری بیٹی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ صاف، شفاف، اجلی''

رخشندہ انصاری کا سانس پھول گیا، اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑنے کو ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک ان پڑھ جاہل عورت کی طرح لڑ رہی تھی۔

''میڈم، ہم معافی چاہتے ہیں۔۔۔ سوسوری، پلیز فار گیٹ اٹ۔۔۔ اونلی دِس ٹائم، پلیز''

پرنسپل کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، اسے اپنی نوکری، اپنا مستقبل سب تاریک دکھائی دے رہا تھا، وہ دل ہی دل میں اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے مناہل کی بات مانی تھی، آج مناہل بھی چھٹی پر تھی ورنہ وہ سارا ملبہ اس پر ڈال کر سائیڈ پر ہو سکتی تھی۔ مگر اس وقت اس کی جان پر بن آئی تھی۔

''میں اس مرتبہ نظر انداز کر رہی ہوں، مگر یاد رکھنا کہ آئندہ میری ایک کال تمہیں گھر بھیج دے گی، اور خبردار، میری بیٹی پڑھے نا پڑھے، تمہیں ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں، اسے ضرورت بھی نہیں ڈگریوں کی، انڈرسٹینڈ''

رخشندہ انصاری نے چیخ کر کہا اور طوفانی انداز میں باہر چل دی، پرنسپل ماتھے سے پسینہ پونچھتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

مشال نے سکول میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو اسے اپنا گروپ نظر آ گیا، اس نے دائیں ہاتھ میں جدید ایپل آئی پیڈ تھا ما ہوا تھا، وہ مہنگے لباس، تیکھے نین نقوش، گورے رنگ، براؤن بالوں اور سبز آنکھوں کی وجہ سے پرکشش نظر آتی تھی، اس کا سرکل دولت مند لڑکیوں پر مشتمل تھا، وہ عمر کے چودہویں سال میں قدم رکھ چکی تھی، اس کے چہرے سے معصومیت چھلکتی تھی۔

''ہائے مشال، جلدی آؤ، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے''

بدریا نے آواز لگائی۔

''پرنسس، آپ کی رعایا منتظر ہے، تشریف لائیے''

ہانیہ کھلکھلائی، سبھی ہنس پڑے۔

''آج لیکچر نہیں لے رہیں تم سب''

مشال نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہمارا دماغ خراب ہے جو آتے ہی کلاس روم میں گھس جائیں''

ہانیہ کی بات پر پھر ہنسی کے فوارے پھوٹے۔

''اصل میں آج ایک چیز دکھانی تھی تمہیں، اس وجہ سے تمہارا انتظار سب بے چینی سے کر رہے تھے''

نمرہ نے آواز کی پچ ذرا دھیمی کی۔

''کیوں سسپنس پھیلا رہے ہو، بتا بھی چکو یار''

مشال نے لاپروائی سے کہا۔

''چل بدریا، ذرا مال نکال۔۔۔''

ہانیہ چہکی۔ مشال کے چہرے پر اب تجسس تھا۔

بدریا نے اپنا آئی پیڈ نکالا اور اس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

''یہ دیکھو مشال۔۔۔ایک نئی تھرل تلاش کی ہے ہم نے''

بدریا نے آئی پیڈ مشال کے گھٹنے پر رکھ دیا، یہ کچھ تصویریں تھیں، جیسے جیسے تصویریں آگے بڑھتی گئیں، مشال کا چہرہ سرخ اور کانوں سے جیسے دھواں نکلنے لگا، مرد و زن کا یہ تعلق بھی ہوتا ہے، یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا، اس کا جسم سُن ہو چکا تھا، حلق میں خشکی اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ اس کا دماغ اسے روک رہا تھا کہ بس، مزید نہیں، آگے مت دیکھو، مگر جو کچھ بھی تھا، اچھا لگ رہا تھا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مناظر جاری رہیں، اس کے اندر جیسے آتش فشاں جل اٹھے تھے، تصویریں جانے کب ختم ہوئیں مگر وہ گم صم بیٹھی تھی، اس وقت وہ کسی ٹرانس، کسی اور ہی کیفیت میں تھی۔ اسی وقت ہانیہ نے بدریا کو آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا اور بدریا نے آئی پیڈ اٹھالیا۔

نمرہ نے مشال کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''کیا ہوا مشال، یار یہ تو کچھ بھی نہیں، کہو تو کلپ دکھائیں، اسی میں تو اصل زندگی ہے، وہ زندگی جس کے لئے ہم اس دنیا میں آئے ہیں''

مشال جیسے کسی خواب سے بیدار ہوئی، اس کا جسم ابھی تک بے جان تھا، ایک نشہ تھا، ایک سنسنی تھی جو انگ انگ میں بہہ رہی تھی، آنکھوں کے پردے پر وہی مناظر چل رہے تھے۔

''کہاں سے آیا یہ سب کچھ''

مشال نے جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

''ارے نیٹ پر سب موجود ہے، روم لاک کرو اور ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاؤ، پیرنٹس سمجھیں گے سٹڈی جاری ہے، ہم تو کافی عرصے سے انجوائے کر رہے ہیں، تمہیں پہلی دفعہ دکھایا ہے ہم نے، ویسے بدریا کو تمام سٹف اُس کے منگیتر حسن نے دیا ہے''

ہانیہ نے تفصیل بتائی۔

''حسن نے۔۔۔مگر غلط ہے یہ سب۔۔۔''

مشال بڑبڑائی۔ اس کی نظریں اپنے پاؤں کے انگوٹھے پر جمی تھیں۔

''کیسے غلط ہے، ہوگا غلط، مگر ہمارے لئے جائز ہے، مجھ سے پوچھو، مہینوں مجھے اپنے باپ کی شکل نظر نہیں آتی، مام آدھی رات کو پارٹیوں سے واپس آتی ہیں، میرے سکول کے کسی فنکشن میں آنے کے لئے پیرنٹس کے پاس ایک لمحہ نہیں، کیا میں دولت سے ماں کا لمس، باپ کی شفقت خریدوں؟۔۔۔میرا بیڈ لاکھوں کا ہے مگر وہ مجھے کاٹتا ہے، مجھے نیند نہیں آتی۔۔۔تو کیا میں وہ سب نا کروں جو مجھے اس تکلیف سے دور لے جائے، حسن پیار کے دو بول بول کر مجھے ہر طرح سے حاصل کر چکا ہے، مگر میں کیا کرتی مجھے تو پتہ ہی نا تھا کہ پیار کا بول ہوتا کیسا ہے، مجھے تو قطرہ بھی سمندر لگا، مجھے تو جگنو بھی سورج لگا مشال، جن بیٹیوں کے ماں باپ اولاد کو تنہا کر دیں وہ بہت سستی بکتی ہیں مشال، میں کیا کرتی۔۔۔کیا کرتی میں۔۔۔''

بدریا کی آنکھیں کرب سے سرخ ہو چکی تھیں اور وہ سسک رہی تھی، ہر طرف خاموشی اور اندر سوچوں کا طوفان تھا۔

☆......☆......☆

اللہ وسایا قاری صاحب کے حجرے میں دری پر آلتی پالتی مارے ادب سے بیٹھا ہوا تھا۔ دری کا اصل رنگ جانے کب کا اُڑ چکا تھا، جگہ جگہ سے دھاگے اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ قاری صاب آنکھیں بند کئے گہرے مراقبے میں تھے، ان کی

انگلیاں تسبیح کے دانوں پر پھسل رہی تھیں۔ حجرے میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا، آخر پندرہ منٹ بعد قاری صاحب نے آنکھیں کھولیں، وہ نورانی چہرے، سرخ و سفید رنگت، سفید براق داڑھی، سادہ سے چغے میں ملبوس بارعب شخصیت کے مالک تھے، ان کی نظریں چپ ہو کر بھی بولتی محسوس ہوتی تھیں۔

''کہو اللہ وسایا، کیسے آنا ہوا؟''

''قاری صاحب، آپ تو جانتے ہیں کہ نکڑی کو آپ کے کہنے پر سکول داخل کرا دیا تھا، اسی کے لئے دُعا کروانے حاضر ہوا تھا، سوہنے رب سے دعا کر دیں قاری صاب کہ میری نکڑی کو اپنی امان میں رکھے، اس کو کامیاب کرے، آپ کا بڑا احسان ہوگا مجھ شودے پر''

اللہ وسایا نے ادب سے کہا۔

''میاں اللہ سے براہِ راست تعلق اور دعا سے بڑھ کر مجرب نسخہ کوئی اور نہیں ہے، مزید تسلی چاہتے ہو تو ہر جمعہ کی نماز کے بعد الحمد شریف، سورہ الفلق، سورہ الناس، سورہ اخلاص تمام سات سات مرتبہ پڑھا کرو، اللہ حفاظت فرمائے گا۔''

''قاری صاب، مجھے بڑا ڈر لگتا ہے، ادھر میری دکان پر سارا دن یہی باتیں ہوتی رہتی ہیں کہ آج کا دور بالڑیوں کو سکول کالج بھیجنے کا نہیں ہے، وہ بگڑ جاتی ہیں، نہ چاہتے ہوئے بھی بھٹک جاتی ہیں، شکاری دبوچ لیتے ہیں معصوم ہرنوں کو، قاری صاب، بہت دل ڈرتا ہے''

اللہ وسایا نے لرزتے لہجے میں کہا۔

اس کی بات سن کر قاری صاحب تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے، پھر بات شروع کی۔

''تمہارا ڈر بھی ٹھیک اللہ وسایا، مگر حفاظت تو مالک کریم نے کرنی ہے نا، تو وہ کر لے گا حفاظت، اگر تم کہو گے اُسے تو ضرور حفاظت کرے گا۔۔۔ اللہ وسایا، اللہ پاک کی پاک کتاب میں ایک سورہ ہے، سورہ انفال، اس میں دشمن سے لڑنے کے لئے ہتھیار اور گھوڑے تیار رکھنے کا حکم آیا ہے نا، کیا سمجھتے ہو تم اس حکم سے؟''

قاری صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میرا کوڑھ دماغ تو یہی کہتا ہے قاری صاب کہ دشمن سے مقابلے کے لئے چیزیں جمع کرو، ہتھیار، توپ، ٹینک، اسلحہ بارود۔۔۔''

اللہ وسایا منمنایا

''بات ٹھیک ہے تمہاری وسّو۔۔۔ مگر یہ بہت جامع حکم ہے، تعلیم بھی اسلحہ ہے۔۔۔ جہالت کے خلاف، مہنگائی کے خلاف، حالات کی ابتری کے خلاف، معاشی بے یقینی کے خلاف۔۔۔ تو میرے بچے تم اپنی بیٹی کو پڑھا کر اسے تیار کر رہے ہو ان دیکھے دشمنوں سے لڑنے کے لئے، تم تو سوہنے رب کا حکم مان رہے ہو، اس لئے تم یہ مت سوچو کہ لوگ کیا کہتے ہیں''

اللہ وسایا جیسے وسوسوں اور خدشات کے بھنور سے باہر نکل آیا، وہ حجرے سے نکلا تو ہوا کی طرح ہلکا ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

بہار کی شام اپنے پر پھیلا رہی تھی، اللہ وسایا صحن میں چارپائی پر لیٹا نیلے آسمان کو دیکھ رہا تھا، ابابیلوں کے غول کے غول آسمان کی وسعتوں میں اٹکھیلیاں کر رہے تھے، دور کہیں ڈیزل انجن سے چلنے والے ٹیوب ویل کی ''چک چک'' کا تسلسل فضا میں گونج رہا تھا، حاجراں تنور گرم کر

رہی تھی تاکہ شام کی روٹیاں ڈال دے۔ شنو تار پر اپنی یونیفارم دھوکر ڈال رہی تھی۔

''ابا، کل ہمارے امتحان کا نتیجہ نکلے گا، وڈی استانی نے بولا ہے کہ اپنے گھر سے کسی کو ضرور لے کے آنا، فنکشن ہوگا، قاری صاحب بھی آئیں گے کل، تُو چلے گا نا ابا؟''

شنو کی آنکھوں میں امید کی جوت جل رہی تھی، وہ بہت پُر جوش تھی۔

''ضرور جاؤں گا تیرے ساتھ میری نکڑی، کیوں نہیں جاؤں گا، تُو فکر نہ کر بلکہ تیری ماں بھی چلے گی''

اللہ وسایا نے بیٹی کے سر پر پیار سے ہلکی سی چپت لگائی۔

شنو خوشی سے اچھل پڑی

''بڑا مزہ آئے گا ابا''

شنو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اپنی خوشی کا اظہار کرے۔

''مجھے کیوں گھسیٹ رہا ہے تُو وتو، خود چلے جانا اپنی دھی کے ساتھ''

حاجراں نے تنور میں سے روٹی نکالتے ہوئے کہا، وہ پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔

''اوئے کبھی پوری حیاتی میں کہیں اکیلا گیا ہوں میں؟ اگر گیا ہوں تو بتا دے، کل بھی اکیلا ہی چلا جاؤں گا''

اللہ وسایا نے محبت سے سرشار لہجے میں حاجراں کو چھیڑا۔

''اچھا اچھا زیادہ مکھن نہ لگا مجھے، چل پڑوں گی تیرے ساتھ، کیا یاد کرے گا وسو تُو بھی۔''

حاجراں نے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ شرما کر کہا۔

اگلی صبح حاجراں نے اللہ وسایا کی نئی لُنگی اور بوسکی قمیض پر جلدی جلدی گیلا ہاتھ کر کے مارا تاکہ سلوٹیں دور ہو جائیں، ساتھ والے گاؤں کے چوہدری کا انعام میں دیا ہوا تلّے والا کھُسا ایسے موقعوں کے لئے سنبھال کر رکھا تھا، اسے نکال کر صاف کیا، سفید صافہ سر پر باندھ کر اللہ وسایا شان سے تیار ہوا۔

''ابا تُو بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

دھلی دھلائی یونیفارم میں ملبوس شنو نے اپنے ابا کو فخر سے دیکھا، آج وہ بہت پُر اعتماد محسوس کر رہی تھی۔

''حاجراں جلدی کر، رشکا آنے والا ہے''

اللہ وسایا نے آواز لگائی۔

تھوڑی دیر میں رکشے کا ہارن سنائی دیا اور وہ لپک کر باہر نکلے۔

آج لڑکیوں والے سکول کی سج دھج دیکھنے والی تھی، اسمبلی گراونڈ میں بڑا شامیانہ لگا ہوا تھا، بہار کے موسم کی وجہ سے ہر طرف سبزہ لہلہا رہا تھا اور پھول کھلے ہوئے تھے، مین گیٹ پر خوش آمدید کا بینر اور شامیانے پر جگہ جگہ تعلیم کی اہمیت بارے چارٹس آویزاں تھے، خواتین کے لئے الگ پورشن بنایا گیا تھا، سٹیج خوبصورتی سے سجا ہوا تھا، سٹیج پر ترتیب سے آٹھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں، یہ اس سکول کا پہلا یوم والدین تھا جسے سالانہ رزلٹ کے ساتھ منسلک کر دیا گیا تھا۔ اللہ وسایا اور حاجراں کو لگ رہا تھا کہ وہ کسی حیرت کدے میں پہنچ گئے ہیں، ہر طرف سکول کی رضا کار بچیاں یونیفارم پر بیجز لگائے گھوم رہی تھیں اور مہمانوں کو ان کی نشتوں پر بٹھا رہی تھیں، پنڈال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا، گاؤں والوں کے لئے تو یہ میلے کا سماں تھا، خاص مہمانوں میں گاؤں کا چوہدری نیاز اور قاری صاحب شامل تھے، شروع میں طالبات

نے مختلف فن پارے پیش کیے، تلاوت، نعت، ٹیبلو ، ڈرامے کو گاؤں والوں نے دانتوں میں انگلی دبائے حیرت اور شوق سے دیکھا، آخر کار کارروائی شروع ہوئی، طلباء کے نتائج کا اعلان کیا جانے لگا، پوزیشن لینے والے طلباء کے لئے خصوصی گفٹ پیک چوہدری صاحب خود لے کر آئے تھے۔ اللہ وسایا اور حاجراں اشتیاق سے جب نویں جماعت کے نتیجے کا اعلان کیا گیا تو ''شنو'' کا نام اول پوزیشن پر پکارا گیا، اللہ وسایا کے کانوں اور دماغ نے اس نام کو قبول ہی نہ کیا، وہ غائب دماغی کی کیفیت میں بیٹھا ہوا تھا، مگر جب اس نے تالیوں کی گونج میں اپنی دھی، اپنی نکڑی شنو کو سٹیج پر جاتے دیکھا تو جیسے وہ ہوش میں آ گیا، اس نے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے حاجراں کی طرف دیکھا تو وہ رو رہی تھی

''یہ تو اپنی نکڑی ہے، اپنی شنو ہے حاجراں''

مارے خوشی اور حیرت کے اللہ وسایا کی آواز لرز رہی تھی۔

''یہ کیا کر دکھایا میری دھی نے، تیرا فیصلہ درست تھا حاجراں، درست تھا تیرا فیصلہ۔۔۔''

خوشی کی شدت سے اللہ وسایا کے الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔

ہیڈ مسٹریس نے خاص طور پر شنو کی ذہانت اور اساتذہ کے ادب کی تعریف کی، اللہ وسایا ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔

''میرے سوہنے رب، میرے مالکا، کیسے ادا کروں تیرا شکر، میں اس قابل تو نہیں تھا میرے ربا''

بار بار وہ آسمان کی طرف دیکھ کر یہی گردان کیے جا رہا تھا، آج اسے اپنی زندگی با مقصد نظر آ رہی تھی۔ اُس رات وہ سکون سے سویا۔

☆......☆......☆

مشال کی نیند اڑ چکی تھی، وہ اپنے بڑے سے بیڈ روم میں اکیلی تھی، حسب معمول اس کے والدین گھر پر نہیں تھے، اس کے جسم میں آگ دہک رہی تھی، اس کی کیفیت ایسی ہو رہی تھی جیسے نئے نشئی کو نشے کی اوور ڈوز دے دی گئی ہو، وقت سے پہلے کی آگہی آگ پر پٹرول کا کام کر رہی تھی، وہ اندر سے بھڑک رہی تھی، اس کے دماغ کے پردے پر وہی مناظر چل رہے تھے جو اس نے تصویروں میں دیکھے تھے، آج سے پہلے کئی بار ایسے ہوا تھا کہ نیٹ پر کوئی انٹرٹینمنٹ سائٹ سرچ کرتے ہوئے، کوئی نیم عریاں تصویر، بوس و کنار کے مناظر نظر آ جاتے تھے کیونکہ اب نیٹ کی ہر سائٹ مختلف مصنوعات کی کمپنیوں کو اپنی سائٹ ہر پروڈکٹ کی تشہیر کے لئے جگہ فراہم کرتی ہے اور اس کے عوض معاوضہ وصول کرتی ہے، یہ ایڈورٹائزمنٹ کا نیا اور جدید انداز مقبول ہوا ہے، جس سے کمپنی کی پروڈکٹ عالمی لیول پر متعارف ہو جاتی ہے، اس کے لئے ہر قسم کی تصاویر، مووی کلپس اور جملوں کا سہارا لیا جاتا ہے، مشال ایسی تصاویر کو نظر انداز کر دیتی تھی مگر آج جو کچھ اس نے دیکھا وہ ''ذومعنی'' نہیں بلکہ ''کھلم کھلا'' تھا، اس کے اندر سے ابھرنے والی اور روکنے والی آواز اب دھیمی پڑتی جا رہی تھی، اور وحشت اور جنون کی کیفیت حاوی ہو کر اکسا رہی تھی کہ ''کچھ اور، کچھ اور'' وہ ''کچھ اور'' جو صرف ایک ''فنگر کلک'' پر تھا، گھر پر کوئی نہ تھا اور اگر کوئی ہوتا بھی تو والدین کو کیا معلوم کہ سیل فون یا آئی پیڈ پر کیا دیکھا جا رہا ہے، یہی ''آسانی'' اسے مجبور کر رہی تھی کہ لذت کے سمندر میں چھلانگ لگا دو۔

''جب مام، ڈیڈی، سب اپنی من پسند زندگی گزار رہے ہیں تو مجھے انتخاب کا حق کیوں نہیں؟''
مشال کے اندر سے آواز ابھری۔
''اور محض کچھ بھی دیکھنے سے کیا ہوتا ہے، ایک بار، صرف ایک بار۔۔۔''
شر کی طاقتوں نے اسے اکسایا۔
اس کے اندر معصومیت اور فطرت کی مزاحمت دھیمی پڑتی جا رہی تھی، وہ ڈوب رہی تھی مگر اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے کوئی نہ تھا۔۔۔ نہ کوئی جملہ، نہ کوئی نصیحت، کوئی آیت، ماں کا کوئی پیار بھرا لمس، باپ کا شفقت بھرا ہاتھ۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے پاس جو اسے بچانے آتا، جو اسے روکتا۔۔۔!!
مشال ہار گئی!!
اس نے اپنا آئی پیڈ اٹھایا، وائی فائی کے سگنل اس وقت پہلے سے بھی زیادہ طاقتور آ رہے تھے، اس نے گوگل میں اپنے مطلوبہ الفاظ درج کیے اور کیف و نشاط میں ڈوبتی چلی گئی۔
''اب تک میں کہاں تھی''
اس نے لذت بھری سسکاری بھری!!

☆......☆......☆

رخشندہ انصاری نے بیٹی کو غور سے دیکھا۔
''کیا بات ہے مشال، کچھ ویک ہو گئی ہو تم، سکول سے چھٹیاں کر لو کچھ دن بیٹا''
''کچھ نہیں مما، سب ٹھیک ہے، سکول میں بہت ضروری اسائمنٹ چل رہی ہیں، چھٹی سے بہت نقصان ہو جائے گا مما''
مشال نے اپنے آئی پیڈ سے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا (بدریا کے لائے مصالحہ کلپس مِس کرنے کا نقصان میں افورڈ نہیں کر سکتی مام)
''آنکھوں کے گرد بلیک سرکلز بھی پڑ گئے ہیں مشال، لگتا ہے سٹڈی بڑھ گئی، نیند پوری نہیں ہو رہی تمہاری یا پھر تمہیں سٹڈی کی ٹینشن ہے''
رخشندہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔
''اوہ نو مام، آل از اوکے، ڈونٹ وری''
مشال آئی پیڈ کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی۔
''کیا کوئی خاص چیز دیکھی جا رہی ہے مشال''
رخشندہ نے اس کی آئی پیڈ میں محویت کو دیکھ کر خوش ہو کر کہا۔
(میری بیٹی جدید دور کی ٹیکنولوجی سے یوزڈ ٹو ہے، پراؤڈ آف یو بیٹا)
''مما، وہ اسائمنٹ وٹس ایپ کی تھی نمرہ نے''
مشال نے بہانہ کیا۔
''اوکے اوکے، اچھا یوں کرو کہ اگر تمہیں سٹڈی کی زیادہ ٹینشن ہو رہی ہے تو میں یزدانی صاحب سے بات کروں، دو چار سیشن لے لو ان سے، ملک کے نامور سائیکا تھراپسٹ ہیں، سڈنی یونیورسٹی سے کلینکل سائیکولوجی میں پی ایچ ڈی ہیں، دو ماہ سے پہلے تو ٹائم نہیں ملتا ان سے، مگر تمہیں پتہ ہے کہ میرے فیملی فرینڈ ہیں، انکار نہیں کریں گے۔''
رخشندہ انصاری نے فخر سے کہا۔
''نہیں مما، میں ٹھیک ہوں، آپ ٹینشن لیتی رہیں تو آپ کو انکل یزدانی کے سیشنز کی ضرورت نہ پڑ جائے''
مشال نے ماں کو ٹالا۔ وہ واپس بیڈ روم میں جانا چاہتی تھی، جہاں اس کے لئے کیف و سرشاری کا سامان موجود تھا۔
''اوکے۔''
رخشندہ انصاری نے کندھے اچکائے۔

جانے کیا بات تھی کہ اب مشال یکسانیت کا شکار ہونا شروع ہوگئی تھی، وہ اس سے بڑھ کر چاہتی تھی، کچھ ایسا جو سابقہ سرور سے بھی بڑھ کر ہو۔

''کیا کیا جائے۔''

مشال سوچوں کے بھنور میں گم تھی۔

☆......☆......☆

اللہ وسایا کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اتنی بڑی خوشی کو کیسے منائے۔ وہ سکول سے جیسے ہواؤں میں اڑتا گھر پہنچا۔ شنّو کو ملنے والی انعامی ٹرافی اس نے کسی فاتح کی طرح اٹھائی ہوئی تھی، رکشہ سے وہ کرماں والی سے باہر ہی اُتر گیا، گھر پہنچنے تک اس نے ملنے والے ہر مرد، عورت، بوڑھے، بچے کو شنّو کی فرسٹ پوزیشن کے بارے میں بتایا، شیدا گلقند (شروع میں وہ گلقند بیچا کرتا تھا تو یہی لفظ اس کی پہچان اس کے نام کا لازمی حصہ بن گیا کیونکہ ایک اور شیدا بھی تھا جو شیدا پہلوان کے نام سے مشہور تھا) کی دکان سے دس کلو گڑ اور پانچ کلو بتاشے لے کر اس نے گھر گھر تقسیم کرائے۔ اگلے پورے ہفتہ وہ ٹرافی اور میڈل ساتھ لے جاتا رہا اور برگد کے تنے پر نمایاں کر کے لٹکا دیتا، شنّو کی پوزیشن اس کی زندگی کا پہلا فخر تھا ورنہ اس نے معاشرے سے ہمیشہ تضحیک ہی سمیٹی تھی، اس کے لیے وہ اپنی بیٹی کا احسان مند بھی تھا جس نے لوگوں کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش کی پرچھائیاں پیدا کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی ایک لمحے کو نہ بھولا تھا، کبھی وہ بہت پیار سے اللہ سے باتیں کرتا تو کبھی گڑگڑا کر دعائیں مانگتا، کبھی اللہ کا شکریہ ادا کرتا جس نے اسے معتبر کیا۔

شنّو کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا، کرماں والی کی عورتیں ان کے گھر آ کر مبارک باد دے رہی تھیں، اس کے باپ کو اس پر فخر تھا، اب تک جانے کتنی بار اللہ وسایا اسے بازوؤں میں اٹھا کر گھما چکا تھا، اس کا ماتھا چومتا تھا، اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتا تھا، اس کا باپ اس سے خوش تھا، اس کی ماں کی آنکھوں میں روشنی کا جہان اتر آیا تھا۔

''کیا زندگی میں اس سے بڑھ کر بھی کچھ اچھا ہوسکتا ہے۔''

شنّو نے سوچا۔

اس نے اللہ میاں کا ڈھیر سارا شکریہ ادا کیا جس کی ذات سے اس کی آشنائی اللہ وسایا نے بہت پہلے کروادی تھی۔ قاری صاحب بچپن سے اس پر مہربان تھے، قرآن پاک ناظرہ شنّو نے قاری صاحب سے ہی پڑھا تھا، اس کے خمیر میں اللہ رچ بس گیا تھا۔ اُسے وہ دن یاد تھا جب اللہ وسایا نے اسے نصیحت کی تھی کہ خوب دل لگا کر پڑھنا ہے، اور وہ اس امتحان میں پورا اتری۔

اس نے اور زیادہ محنت شروع کردی، آگے بورڈ کا امتحان تھا، اس نے سُن رکھا تھا کہ یہ امتحان مشکل ہوتا ہے اور پرچے بھی شہر میں ہوتے ہیں، چوہدری نیاز اور قاری صاحب نے کوشش کر کے شہر سے دو ٹیچرز کا ذاتی معاوضے پر انتظام کر دیا تھا جو ان کو انگلش اور میتھ کی تیاری کرواتیں، چوہدری نیاز کا ذاتی تانگہ شہر سے ان کو چھوڑتا اور لے آتا تھا۔ یوں زندگی اپنے ڈھب سے رواں دواں تھی کہ اچانک اس میں ایک پتھر آ ٹکرایا اور زندگی کی سطح مرتعش سی ہوگئی۔ اس دن سکول سے واپسی پر رکشہ جب گاؤں سے پہلے بڑی نہر کے پُل پر سے گزرا تو شنّو نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ بیٹھی راشدہ نے کلثوم کو ہلکی سی

کہنی ماری، پھر دونوں ہنسنے لگیں، راشدہ نے کلثوم کے کان میں کچھ سرگوشی کی، پھر ہنسی کے فوارے بلند ہوئے، شنو نے ان کی نظروں کا تعاقب کیا تو ان کی نگاہوں کا مرکز حسو ٹھیکیدار کا لڑکا تھا جو تازہ تازہ شہر سے چھٹیوں پر آیا تھا، وہاں ہاسٹل میں رہتا تھا، شکل صورت اور قد کاٹھ کا اچھا تھا۔۔۔۔
کہانی مانگتی جوانی شکار کی تلاش میں نکلی تو سکول کے پروگرام میں شنو کو سٹیج پر دیکھ کر دل سینے میں رکتا محسوس ہوا، ضبط نہ ہوسکا تو چھٹی ٹائم رکشے کی گزرگاہ پر باقاعدگی سے کھڑا ہونے لگا، رکشے کی ہر لڑکی نے یہی خوش فہمی پالی کہ نظرِ انتخاب اس پر ہے، بس خبر نہیں تھی تو اسے نہیں تھی جو واقعی نظروں میں بسی تھی۔

''راشدہ یوں نہیں ہنستے، چپ کرو''
شنو نے راشدہ کو ٹوکا۔
''تجھے کیا تکلیف ہے، سڑتی ہے تو ہم سے''
کلثوم نے دل کی وہ تمام بھڑاس ایک جملے میں نکال پھینکی جو وہ شنو کی مقبولیت کی وجہ سے دل ہی دل میں پال رہی تھی۔
''کلثوم، میری بہن، یہ ٹھیک نہیں ہے، کیا سوچیں گے دیکھنے والے''
شنو نے تحمل سے کلثوم کو سمجھایا۔
''وڈی آئی نیک پروین، دو نمبر کیا لے لئے، سر پر ہی چڑھ بیٹھی ہے، چل کم کر اپنا، سانوں لوڑ نہیں تیری نصیحتوں کی''
راشدہ نے انگارے برسائے۔ اس کے سینے میں تو جیسے نفرت کے بھانبڑ جل رہے تھے
شنو خاموش ہوگئی مگر اسے ان کی باتوں سے دلی رنج پہنچا تھا۔

☆......☆......☆

''مشال، کچھ بور سی لگ رہی ہے، خیریت تو ہے جانِ من''
بدریا نے مشال کو چٹکی کاٹی۔
''یار، اب مزہ نہیں آتا''
مشال نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا
''اوہ۔۔۔۔''
گروپ کی تمام لڑکیوں نے یک آواز ہو کر ''اوہ'' کو لمبا کیا۔
''تو ملوا دو نہ اسے بھی حسن سے، کر لو نا منگیتر شیئر، کچھ نہیں ہوتا بدریا، دوست ہے آخر تمہاری''
ہانیہ نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔
''بکومت ہانی، فضول میں بولتی رہتی ہو کچھ بھی''
مشال نے جھڑکا مگر اندر سے اسے کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔
''یار حسن نہیں تو کوئی اور سہی، صدقِ دل سے ڈھونڈا جائے تو کوئی مل ہی جائے گا، لڑکے تو بے تاب ہی پھر رہے ہوتے ہیں، اشارہ کیا اور پیچھے پیچھے چل پڑے''
نمرہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، اس کی بات پر سب اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے۔
''فیس بک ٹرائی کرو، وہاں تو ایک ڈھونڈو ہزار مل جائیں گے''
ہانیہ نے دوبارہ پھر پھلجھڑی چھوڑی۔
''سٹاپ اٹ ہانی، اٹس ٹو مچ''
مشال نے مصنوعی خفگی سے کہا۔
گناہ جب عام ہو جائے، جب اس کا ذکر عام انداز اور معمولی چیز کے طور پر ہونے لگ جائے، جب وہ فخر بن جائے، جب وہ چاروں طرف کی زندگی کا حصہ بن جائے تو وہ چھوٹا لگنے لگتا ہے!!

☆......☆......☆

مس بلقیس میتھ پڑھا کر باہر نکلیں تو شنو کلاس

روم سے باہر آئی، اسے پیاس لگ رہی تھی، لیکچر کے دوران تو اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ کلاس سے باہر نہ جائے، حلق خشک ہو رہا تھا، کوریڈور میں ٹھنڈے پانی کے لئے واٹر ڈسپنسر ہیڈ مسٹرس سلطانہ کریم کی ذاتی کاوشوں سے کسی این جی او نے لگوا کر دیا تھا، جسے مڈل اور میٹرک کلاس کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

''باجی باجی، یہ آپ کے لئے ہے۔۔۔''

وہ چمکیلی آنکھوں والی پیاری سی بچی شاید کلاس ٹو کی تھی کیونکہ اس کے شولڈرز پر مخصوص کلر کی پٹیاں موجود تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کے فولڈ کیے ہوئے چند صفحے تھے جو بہت احتیاط سے تہہ اندر تہہ بند کیے گئے تھے۔ شنّو کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔

''یہ کیا ہے، کس نے دیا ہے تمہیں۔۔۔''

اس نے وحشت بھرے لہجے میں کہا، کسی انہونی کا احساس اسے لرزا رہا تھا۔

''باجی، وہ میرے چاچے کا بیٹا ہے نا، اس نے کہا تھا کہ آپ کو دے دوں، اس نے کہا تھا کہ کسی کو بتانا بھی نہیں اور اس نے مجھے میٹھی ٹافیاں بھی دی تھیں، اب وہ مجھے آئس کریم بھی کھلائے گا''

بچّی نے بھولپن میں سب کچھ اگل دیا۔

شنّو نے بہتر یہی سمجھا کہ اس سے یہ خط لے لے، یہاں کھڑے ہو کر تفتیش کرنے یا انکار کرنے میں خطرہ تھا کہ وہ کسی اور کے ہاتھ بھی لگ سکتا تھا۔

''اچھا تُو جا۔۔۔''

شنّو نے اس کے ہاتھ سے خط اچکتے ہوئے کہا۔

واش روم میں جا کر اس نے خط کھولا تو اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے، اس کے روم روم سے ٹھنڈے پسینے بہہ رہے تھے، خط ایک روایتی سا محبت نامہ تھا، جس میں شنّو سے محبت کا اظہار، مرنے جینے کی قسمیں اور مل نہ سکنے کی صورت میں خودکشی کی دھمکی دی گئی تھی، ساتھ ہی جواب کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔

شنّو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، وہ ان تمام باتوں سے کوسوں دور تھی، اس کی ساتھی لڑکیاں الگ بیٹھ کر کھسر پھسر کرتیں تو وہ کبھی ان کے ساتھ نہ بیٹھتی بلکہ ان کے پاس سے اٹھ جایا کرتی تھی، آج اس کی دیوارِ جاں کی بنیادیں تک ہل کے رہ گئی تھیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، اس نے وہ خط بہت احتیاط سے اپنے بیگ میں چھپا لیا اور کوشش کی کہ نارمل نظر آئے، اسے اتنا تو ادراک تھا کہ اگر اس بات کی بھنک راشدہ یا کلثوم کو پڑ گئی تو یہ بات کرماں والی کے گلی کوچوں میں پھیل جائے گی، اس کی آنکھوں میں اپنے باپ کا فخریہ چہرہ، اٹھی ہوئی گردن اور برگد کے تنے پر لٹکی ٹرافی اور میڈل گھوم رہے تھے۔

اپنی ماں کی امید کی جوت سے جگمگاتی آنکھیں ہر لحظہ اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس دن اسے معلوم ہوا کہ نہر کے پل پر کھڑا لڑکا اس کے لئے وہاں آتا ہے۔

وہ گھر جاتے ہی بخار کی لپیٹ میں آ گئی، اس کے دماغ پر سوچوں کا کوہ ہمالیہ کھڑا تھا جو اسے زمیں بوس کر گیا، وسوسوں کا طوفان اسے ڈرا رہا تھا، دو دن تک وہ سکول نہ جا سکی، اس کا باپ اور ماں اس کی چارپائی سے لگے بیٹھے تھے، جب بھی اس کا بخار کم ہوتا تو ایک شفقت بھرا ہاتھ اس کا ماتھے پر رکھا ہوتا جو اسے تحفظ کا احساس

دیتا، حاجراں ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہتی اور دعا مانگتی رہتی، حکیم جی کی دوا اور قاری صاحب کا دم کیا پانی بھی لگاتار پلایا جارہا تھا، اس کی ٹیچرز بھی ہیڈ مسٹریس کے ساتھ اس کی عیادت کو آئیں، وہ سوتی تو ڈراؤنے خواب اسے گھیر لیتے، خدا خدا کر کے تیسرے دن وہ ذرا بہتر ہوئی تو اللہ وسایا نے سکون کی سانس لی۔

''میری نکڑی، کیا ہو گیا تمہیں، میری دھی رانی تو بہت بہادر ہے۔ شاباش، بھلی چنگی ہو جائے گی دو دن میں، تپ تو اتر گئی ہے اب''

اللہ وسایا نے اس کا سر محبت سے تھپتھپایا۔

''ابا، تو کم پہ بھی نہیں گیا نا تین دن سے''

شتو نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے کہا۔

''چلا جاؤں گا کام پہ بھی، تیرے لئے تو کماتا ہوں، تو ہی بیمار ہے تو کام پہ کس لئے جاؤں، اب تو ٹھیک ہوگئی ہے تو دکان بھی چلالیں گے''

اللہ وسایا نے ہنس کر کہا۔

''اب تو ہنس رہا ہے وسّو، تین دن سے تو تیرہ چہرہ سرسوں جیسا ہوا پڑا تھا''

حاجراں نے اسے چھیڑا۔

''او مرن جوگیے، وہ تو میں دکان کے لین دین کا حساب سوچ رہا تھا''

اللہ وسایا نے بہانہ گھڑا۔

''شتو، مری نکڑی، ہوا کیا تھا تجھے، ایک دم بیمار ہوگئی تو''

حاجراں نے پیار سے شتو سے کہا۔

شتو اس وقت کشمکش کا شکار تھی کہ اپنے پیو، ماں کو بتائے یا نہ بتائے، ایسا نہ ہو کہ وہ اسے ہی مجرم سمجھ لیں، ایسا نہ ہو کہ اس کا ابا حسنو ٹھیکیدار کے گھر پہنچ جائے اور پنڈ میں شور شرابا ہو، پھر بات باہر نکل گئی تو گڑ بڑ ہو جائے گی۔

اس کے چہرے پر پھیلے سوچوں کے جال کو دیکھ کر اللہ وسایا سمجھ گیا کہ کوئی تو بات ہے، اس نے حاجراں کو اشارہ کیا کہ بات کا کھوج لگائے اور خود باہر جانے لگا تا کہ شتو کی جھجک دور ہو۔

''ابا، مجھے تم سے ایک گل کرنی ہے''

شتو کی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

''کیا بات ہے مری دھی، تو بے فکر ہو کے کر گل''

اللہ وسایا نے بیٹی کے پاس والی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ابا میرا کوئی قصور نہیں''

شتو کی آنکھیں بھر آئیں۔

''ماں قربان، ماں ری۔۔۔تو کیوں گھبراتی ہے، بتا تو سہی معاملہ کیا ہے''

حاجراں بے قرار ہوگئی۔

شتو چارپائی سے اٹھی اور اپنے بیگ سے وہ مڑا تڑا خط نکال کر لے آئی، اپنے باپ کے ہاتھ پر رکھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی، اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑا ہوا تھا، اس نے یہی بہتر سمجھا کہ معاملہ اپنے ماں پیو کے حوالے کر دے۔

اللہ وسایا نے خاموشی سے پورا خط پڑھا، شتو کسی مجرم کی طرح بیٹھی فیصلہ سننے کی منتظر تھی، اس کا رواں رواں سماعت بن چکا تھا۔

''شتو، مری دھی۔۔۔''

شتو نے سر اٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا تو اسے اس کے چہرے پر روشنی، خوشی، فخر نظر آیا، وہ حیران سی اسے دیکھنے لگی۔

''تو نے آج ثابت کر دیا کہ اللہ وسایا لوہار کمی ضرور ہے مگر بدنصیب نہیں ہے۔۔۔تیرے جیسی دھی جس کو مل جائے تو وہ شودا بدنصیب کیسے ہو سکتا ہے، تو نے آج مجھے وہ

خوشی دی ہے کہ جس کے سامنے بڑی سے بڑی خوشی بھی چھوٹی ہے، اب تو بے فکر ہو جا، یوں سمجھ کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔۔۔‘‘

اللہ وسایا کی آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔ حاجراں بھی رو رہی تھی، شنو نے باپ کی گود میں سر رکھ دیا اور بلک پڑی۔

اور پھر جانے اس کے ابا نے کیا کیا، دوبارہ کبھی جسو ٹھیکیدار کا بیٹا اسے راستے میں نظر نہ آیا۔

☆......☆......☆

مشال کو ایسا نشہ لگ گیا تھا جس سے وہ خود بھی تنگ آ چکی تھی، ہر پل بس دماغ کچھ نیا مانگتا رہتا تھا، ایسے میں اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کس سے مدد طلب کرے، اس کے گروپ فیلوز خود اسی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے، ماں کسی بھی وقت فرائڈ کی تھیوریز سے باہر نہیں آتی تھیں، ان کی ملاقات ہوئے کئی دن بیت جاتے، پڑھائی سے دل اچاٹ ہو چکا تھا، کوئی ستارہ، کوئی لائٹ ہاؤس نظر نہیں آ رہا تھا جب کہ اس کی زندگی کا کارواں گہرے بھنور میں پھنسا تھا، چاروں طرف گھنا گھور اندھیرا تھا، اس کا کوئی دوست نہیں تھا جو اس کا ہاتھ تھام کے اسے بچاتا، پیرنٹس اس سے صدیوں کی دوری پر کھڑے تھے، ایسے لمحات میں اس کے اندر سے بغاوت کی لہر اٹھتی اور وہ اپنے آپ کو اس نشے میں بہنے دیتی جس کی وہ عادی ہو چکی تھی مگر ستم یہ تھا کہ نشہ کوئی بھی ہو ایک سٹیج پر آ کر جسم اس کا عادی ہو جاتا ہے، پھر سرور بھی کم ہو جاتا ہے، پھر نشے کی ڈوز بڑھانے سے سابقہ لذت ملتی ہے، وہ بھی ایسی ہی سٹیج پر پہنچ چکی تھی جب اس کا دل کرتا تھا کہ جو کچھ وہ موویز یا تصویروں کی شکل میں دیکھ رہی ہے، خود اس کا حصہ بنے، موویز دیکھتے وقت بھی وہ ان کا حصہ بن جاتی اور کسی اور دنیا میں پہنچ جاتی، کبھی کبھی اسے ان سب سے نفرت بھی محسوس ہونے لگتی، اس کے اندر ابھی معصومیت اور وہ ازلی نور باقی تھا جو اللہ تعالیٰ ہر بچے کے اندر رکھ چھوڑتا ہے، جب برائی بار بار کی جائے یا برائی پر اصرار کیا جائے تو ہماری حفاظت پر مامور خیر کی طاقتیں بھی ہمیں اکیلا چھوڑ دیتی ہیں، مشال کے اندر سے کبھی کبھی آواز اٹھتی تھی جو اسے باور کراتی تھی کہ یہ سب گناہ ہے مگر مشال اس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی اور اسے دوست بھی ایسی ملی تھیں کہ اسے کسی نے گناہ وثواب، حلال وحرام، جائز وناجائز کا فرق بتایا ہی نہ گیا۔ وہ جنون اور وحشت کا شکار ہو چکی تھی، اوپر سے نیا مصالحہ اس آگ پر پیٹرول چھڑکتا رہتا تھا۔ اس رات بھی وہ گھر پر اکیلی تھی، پیرنٹس حسب معمول کسی ہائی فائی پارٹی میں گئے ہوئے تھے، جسم اسی آگ میں جل رہا تھا جس میں وہ روز جلتا تھا، اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے، کہاں جائے، آخر اسے ہانیہ کی بات یاد آئی، وہ فوراً اپنے فیس بک اکاؤنٹ سے لاگ ان ہو گئی، اس نے اپنے اصل نام سے اکاؤنٹ بنایا ہوا تھا، جس میں اس کی پروفائل پکچر، سکول کا نام سب کچھ اصل تھے۔ اکثر فرینڈ ریکوسٹ آتی رہتی تھیں جنہیں وہ اگنور کر دیا کرتی تھی مگر آج اس نے بطور خاص فرینڈز ریکوسٹس کو دیکھا، ایک ریکوسٹ شاید آج ہی آئی تھی، آئی ڈی ’’ہم تمہارے ہیں صنم‘‘ کے نام سے تھی، تصویر ایک ہینڈسم سے لڑکے کی تھی، امکان یہی تھا کہ وہ تصویر جعلی تھی، مشال کو لگا کہ شاید قدرت نے اس کے لئے مدد بھیجی ہے، اس نے وہ ریکوسٹ قبول کر لی، دوسری طرف لڑکا آن لائن ہی تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کے درمیان چیٹنگ شروع ہو گئی۔ لڑکا

بھی زیادہ ہی جلدی میں لگ رہا تھا، مشال کو لگا کہ یہاں اس کا کام بن جائے گا اور اس لڑکے کو بھی یہی لگ رہا تھا کہ یہی اس کی منزل ہے۔

☆......☆......☆

''اللہ کی مدد مانگنا کبھی نہیں بھولنا چاہیے اللہ وسایا، عقل، کلیے، تھیوریز، سب ساتھ چھوڑ جاتی ہیں، ایک ہی باپ کے بچوں میں کوئی شیطان ہوتا ہے تو کوئی رحمان جبکہ اس نے ایک ہی طریقے سے ان کی پرورش کی ہوتی ہے۔ہم عقل استعمال کرتے ہیں، اسی کو اپنا ان داتا سمجھ بیٹھتے ہیں جبکہ ایک جگہ، ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں عقل نہیں صرف اللہ کا کرم کام دیتا ہے''

قاری صاحب کی جلالی آواز رات کے سناٹے میں گونج رہی تھی۔اللہ وسایا ادب سے دو زانو بیٹھا ہوا تھا۔

''اللہ تعالیٰ کو ہماری ضرورت نہیں، ہمیں اس کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کو ہر لحہ کہتے رہو کہ اللہ تو نے بچانا ہے، اللہ تُو نے حفاظت کرنی ہے، پھر وہ اسباب بھی پیدا کرتا ہے اور حفاظت بھی کرتا ہے، تو اسی وجہ سے بچ گیا اللہ دسایا کہ تُو نے خود کو حقیر بنا کر اللہ کے قدموں میں گرا دیا، تُو نے خود کو بے بس مانا اور اللہ کو قادر مانا، یہ وہ باتیں ہیں کہ جو ہم سب کو معلوم ہیں مگر ہم ان پر عمل نہیں کرتے، ہم ان کو سسٹم کا حصہ نہیں بناتے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک مقام ایسا آتا ہے کہ ہم بے بسی سے کھڑے مدد کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں''

قاری صاحب اپنی رمز میں بہتے جا رہے تھے، ان کی باتیں اللہ وسایا کو کچھ سمجھ آ رہی تھیں اور کچھ اس کی ناقص عقل سے اوپر گزر رہی تھیں۔بس ایک تشکر تھا جو اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا۔

''میں تو مٹی کا روڑہ ہوں مرے مالک، تیری مہربانی کہ تُو نے ٹور شور بنا رکھی ہے''

دور کہیں مسجد سے ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' کی صدا گونج رہی تھی اور اللہ وسایا کی گردن جھکتی ہی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

''یار اب صبر نہیں ہوتا، ملتے ہیں نا کہیں''

مشال اور اسد اب بہت کھلی ڈلی باتیں کرنے لگے تھے۔

''مل لیں گے، جلدی کیا ہے، میں باتوں میں جتنی بھی ماڈرن سہی مگر میں ایک شریف لڑکی ہوں''

مشال نے بھرم رکھنے کی کوشش کی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ خود کو سستا پیش کرے یا پھر شاید وہ اسد کی آتشِ شوق کو بھڑکا رہی تھی۔

''پلیز مشال، ہم نے شادی کے بعد بھی تو سب کچھ۔۔۔۔''

اسد نے بات ادھوری چھوڑی۔

''نہیں یار۔۔۔۔''

مشال نے ہاں اور ناں کی کیفیت میں جواب دیا۔

''پلیز۔۔۔کچھ نہیں ہوتا''

اسد نے لجاجت سے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے، کیا یاد کرو گے، تمہاری محبت نے مجھے پگھلا دیا ہے اسد''

مشال نے نیم رضامندی ظاہر کی۔

''آئی لو یو مشال۔۔۔اب جلدی سے بتاؤ نا، کب، کہاں؟''

اسد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، وہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

''اچھا تم ہی بتاؤ نا کوئی جگہ''

مشال نے بے تابی سے کہا۔ اس کے رگ و پے میں تو الاؤ جل رہے تھے۔

''تمہیں پتہ ہے کہ میں اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ ایک کرائے کے فلیٹ میں رہتا ہوں، اس ویک اینڈ پر کوئی بھی نہیں ہوگا''

اسد نے ایک لمحے میں مسئلہ حل کر دیا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے اسد، میں پہلے کبھی کسی لڑکے کے ساتھ ڈیٹ پر نہیں گئی''

مشال نے ڈیٹ کا لفظ استعمال کر کے اپنے دل کو تسلی دی۔ جانے کون سی کشمکش اسے اب بھی روک رہی تھی۔

''جان مجھ پر بھروسہ رکھو نا۔۔۔ اعتبار نہیں ہے مجھ پر''

اسد نے آخری چال چلی۔

''اعتبار تو خود سے زیادہ ہے تم پر اسد، جبھی تو دل کی ہر بات کر لیتی ہوں تم سے''

مشال نے جذباتی ہو کر اسد کی توقع کے عین مطابق جواب دیا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے، سیچرڈے کو، شام 5 بجے، ہاکی سٹیڈیم کے مین گیٹ پر تمہارا انتظار کروں گا''

اسد نے بات فائنل کی۔

''ٹھیک ہے اسد میں آجاؤں گی۔''

مشال آخر کار مان گئی، اس کے دل و جان کی ہر مراد پوری ہونے والی تھی۔

☆......☆......☆

رخشندہ انصاری نے فون سائیڈ پر رکھا اور شاور لینے کے لئے اٹھی۔ اس نے گھر پر ایک گیٹ ٹو گیدر پلان کی ہوئی تھی، اس کے لئے کیٹرنگ والوں سے ملنا تھا۔ ہفتے کے دن یونیورسٹی تو جانا نہیں ہوتا تھا، اس لئے وہ بہت ریلیکس تھی، اس کی صبح کا آغاز بھی دو بجے ہوا تھا۔ شاور لے کر وہ ذرا فریش ہوگئی۔ مشال کسی دوست سے ملنے گئی ہوئی تھی، شمیم کی کاروباری میٹنگ تھی۔

اچانک اس کے سیل فون کی بیل بجی اور دماغ بھک سے اڑ گیا، اس کے اعصاب زلزلے کی زد میں تھے، اس نے فوراً مشال کا نمبر ٹرائی کیا مگر سیل آف جا رہا تھا۔

''اف، کیا کر دیا تم نے مشال۔۔ کون ہے یہ، مائی گاڈ''

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کا نروس سسٹم شل ہو رہا تھا۔ اسے معاملے کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

پہلے اس نے سوچا کہ اپنے شوہر کو اطلاع دے مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگئی کہ پہلے وہ خود اس معاملے کو دیکھے، ہوسکتا ہے محض بلف کیا ہو کسی نے۔ اس نے ٹائم دیکھا، پانچ بجنے والے تھے۔ وہ جلدی سے گاڑی کی طرف لپکی، بہاولپور کی سڑکوں پر ٹریفک کا بہاؤ کم ہوتا ہے، اسے امید تھی کہ وہ ٹائم پر دیئے گئے ایڈریس پر پہنچ جائے گی۔ وہ آدھے گھنٹے میں اس علاقے میں پہنچ گئی جہاں کا ایڈریس دیا گیا تھا، یہ پوش علاقہ تھا، زیادہ تر بنگلے اور کوٹھیاں تھیں، اکا دکا عمارتیں دو منزلہ تھیں جن میں کرائے کے لالچ میں فلیٹ بنوا دیئے گئے تھے۔ وہ بھی ایسی ہی ایک عمارت تھی۔ باہر ہی مشال کی گاڑی کھڑی دیکھ کر اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر سیکنڈ فلور پر پہنچی تو سامنے ہی مطلوبہ فلیٹ تھا، دروازے پر دباؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ فلیٹ میں ہو کا عالم طاری تھا، دائیں طرف پہلے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا، اندر کا منظر دیکھ کر اس کے رگ و پے میں غصے کا الاؤ دہک اٹھا، مشال کسی کی بانہوں میں تھی، ایک سرشاری اور بے خودی میں اس کی

آنکھیں بند تھیں، اس نے اپنے آپ کو اس اجنبی کے سپرد کر دیا تھا جس کی پشت رخشندہ کی طرف تھی۔

''مشال ---''

رخشندہ دھاڑی۔

مشال کے سر پر جیسے کسی نے ایٹم بم پھوڑ دیا، اس نے ہڑ بڑا کر خود کو اس لڑکے کی بانہوں سے الگ کیا، اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

''مام، آپ ---''

حیرت اور شرم کے مارے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے، وہ تمام خمار ہوا ہو چکا تھا جس میں وہ بہے جا رہی تھی۔ اس لڑکے نے رخشندہ انصاری کی طرف رخ موڑا تو اس پر حیرت کا دوسرا حملہ ہوا۔

''فیصل --- تم --- کمینے، شرم نہ آئی تمہیں ---''

رخشندہ انصاری جیسے ہپناٹائز ہو چکی تھی، جس چہرے سے وہ اتنی نفرت کرتی تھی، آج وہ اس کے سامنے فاتح کی حیثیت سے کھڑا تھا۔

''جی میڈم --- میں، آپ کا نالائق شاگرد، خادم کو فیصل حسن کہتے ہیں''

فیصل نے گردن کو خم دے کر کہا۔

رخشندی انصاری کے جسم سے جیسے کسی نے تمام توانائیاں نچوڑ لی تھیں، اس نے بے اختیار صوفے کا سہارا لیا۔

''یہ کیا کر دیا تم نے مشال، میرے اعتماد کو لہو لہو کر دیا تم نے''

وہ خوابیدہ انداز میں بڑبڑائی۔

''مشال سے کیا پوچھتی ہیں آپ، میں جواب دیتا ہوں آپ کو میڈم رخشندہ انصاری''

فیصل کی آواز اسے کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی، اس کے اندر زوردار دھماکے ہو رہے تھے۔

مشال حیرت سے کبھی ماں کو اور کبھی اسد کو دیکھ رہی تھی جس کو اس کی ماں فیصل کہہ رہی تھی۔

''کیوں کیا تم نے ایسا فیصل''

رخشندہ انصاری بوسیدہ عمارت کی طرح ڈھے چکی تھی۔ اس کی اکڑ، اس کا طنطنہ سب دھواں بن کر اڑ چکے تھے۔

''آپ کو یاد ہیں نا اپنے اصول، اپنے آدرش، اپنے ضابطے --- یاد ہی ہوں گے، کیوں کہ وہ تو آپ کی زندگی کا حصہ ہیں، انہی کو شکست دی ہے میں نے، چلو میں انہیں دہرا دیتا ہوں''

فیصل کا انداز طنزیہ ہو چکا تھا۔

''آپ ہی کہا کرتی تھیں میڈم انصاری کہ نفسیات کے ماہرین کی تھیوریز کی روشنی میں اولاد کی پرورش کی جائے تو وہ کبھی نہیں بگڑ سکتی، سائنس نے انسان کے اندر جھانکنا سیکھ لیا ہے، غلط اور صحیح کا آپ کا فلسفہ مغرب کی روشنی میں طے پاتا تھا، آپ نے تو یہ بھی کہا تھا کہ غریب لوگ اس چیز کو ناجائز کہہ دیتے ہیں جس کو وہ حاصل نہ کر پائیں ---

تو آج آپ ایک غریب کی طرح کیوں بی ہیو کر رہی ہیں؟ کیوں آپ کا بی پی لو ہو رہا ہے، آپ کی کلاس میں تو یہ عام سی بات ہے نا؟ --- اس کا جواب بھی میں بتا دیتا ہوں، میں نے آپ کو کہا تھا نا کہ ہم اندر کے مسلمان کو نہیں کھرچ سکتے، وہ مسلمان، وہ ایمان، چاہے کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، وہ انگڑائی لے کر بیدار ضرور ہوتا ہے، اسی خوابیدہ ایمان کی وجہ سے آپ آج بے اختیار یہاں تک پہنچی ہیں''

فیصل نے الفاظ کے کوڑے برسائے۔

''ہاں میں مانتا ہوں کہ میں نے پلان کیا مشال کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا۔۔۔مگر میرا سوال یہ ہے کہ مشال کو تباہ کس نے کیا؟ اگر اس کا جواب اب بھی معلوم نہیں تو میں دیتا ہوں اس کا جواب۔۔۔آپ نے۔۔۔آپ نے تباہ کیا اپنی بیٹی کو، کبھی آپ نے اس کے دکھ درد شیئر کیے؟ کبھی آپ نے اس کو روکا ٹوکا، کبھی آپ نے احساس دلایا کہ اکیلی نہیں ہے بلکہ ایک سائبان ہے اس کے سر پر، کبھی آپ نے اسے سرد راتوں میں، سیاہ اندھیرے میں، گرجتی بارش والی راتوں میں خود سے لپٹا کر سلایا، کبھی آپ نے اسے ممتا کی وہ چھایا دی جس میں سو کر بچہ بے فکر ہو جاتا ہے۔۔۔کبھی آپ نے اسے یہ احساس دیا کہ وہ سب سے قیمتی ہے۔۔۔کبھی آپ اس کے کسی فنکشن میں شامل ہوئیں، کبھی آپ نے اسے ٹوکا کہ بیٹا زیادہ سیل فون استعمال نہ کیا کرو۔۔۔کبھی نہیں، تو قاتل کون ہوا اس کے احساسات کا؟ اسے مشین آپ نے بنایا میڈم، آپ نے!!''

مشال کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا، رخشندہ انصاری بے جان ہو کر فرش پر بیٹھ گئی تھیں۔

''آپ کہتی تھیں کہ بچے کو اعتماد دیا جائے، اس پر روک ٹوک نہ کی جائے، یہ غریبوں کا، دھتکارے ہوئے، پسے ہوئے جاہل طبقے کا انداز ہوتا ہے۔۔۔میڈم بچے پر نظر رکھنا، اسے غلط صحیح بتانا، اس کو روپیہ پیسہ نہیں بلکہ توجہ، محبت اور وقت دینا ہی اصل تربیت ہے ورنہ پیار کے ترسے بچے کو جہاں سے پیار ملے گا، وہیں سے وہ اسے حاصل کر لے گا''

مشال کی سسکی فضا میں گونجی۔

''اور ایک سب سے بڑی چیز آپ نے کبھی سوچی ہی نہیں، وہ ہے اللہ کا کرم، آپ نے عقل پر بھروسہ کیا، اپنے علم کو اولیت دی، کبھی اللہ سے دعا نہیں کی کہ اللہ آپ کی عزت کی حفاظت کرے، آپ نے اللہ کو دوسرے نمبر پر تو کیا، کسی بھی نمبر پر نہیں رکھا، نتیجہ یہ ہے کہ اللہ نے بھی آپ کو بھلا دیا''

رخشندہ کا سر جھکتا ہوا فرش پر جا لگا تھا، اپنے جملے، اپنی باتیں، اپنا غرور، سب کچھ یاد آ رہا تھا۔

''آپ سے زیادہ تو گرماں والی کا وہ کمہار جانتا ہے جسے دنیا گمی کہتی ہے، جو آپ کی زبان مین جاہل اور تھرڈ کلاس ہے۔

مگر جس کا ہر جملہ اللہ سے شروع ہو کر اللہ پر ختم ہوتا ہے، جو ہر مشکل کو اللہ کے سپرد کر کے بے فکر ہو جاتا ہے، جس کے پاس ڈگریاں نہیں ہیں مگر جو رازِ حیات پا گیا ہے، جس نے اپنی بیٹی کے بچانے کے لئے مجھے صرف یہ کہا کہ میں اپنی بیٹی کو اللہ کی امان میں دے چکا ہوں، تم میں ہمت ہے تو اللہ سے لڑو۔۔اور میں اندر تک ہل کر رہ گیا۔۔۔''

فیصل کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

''مجھے صرف آپ کو اصل راستہ دکھانا تھا، یہ بتانا تھا کہ آپ کے خیالات غلط ہیں، اللہ کا کرم مانگا کریں، یہ کرم نہ ہو تو عقل بھی بے کار اور تدبیر بھی ناکارہ۔۔۔اب بھی وقت ہے مشال کو پالیں''

یہ کہہ کر فیصل دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے میں سسکیاں گونج رہی تھیں۔۔۔شرمندگی کی سسکیاں!!!

☆☆......☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

افسانہ

حنا اشرف

''کان کھول کر سن لیں میں اسید کے لیے کسی اچھے گھرانے سے لڑکی لے کر آؤں گی۔ جو بہترین جہیز بھی لائے گی۔ میرے بیٹے میں کیا کمی ہے جو شانزے کو اپنے سر پر سوار کرلوں۔'' ''آسیہ میں اپنے بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا اور وہ......

سب کون کسی کا ہوتا ہے
یہ سب جھوٹے رشتے ناتے ہیں
سب دل رکھنے کی باتیں ہیں
سب اصلی روپ چھپاتے ہیں
اخلاق سے خالی لوگ یہاں
لفظوں کے تیر چلاتے ہیں
ایک بار نگاہوں میں آ کر
پھر ساری عمر رُلاتے ہیں

☆......☆......☆

''میں نے کہا تھا آپ سے کہ بچپن کے رشتے ہمیشہ ناپائیدار ہوتے ہیں مگر آپ نے میری ایک نہ سنی اور جو جی میں آیا وہی کیا۔ اب دل کو مل گیا نا سکون؟ اب تو خوش ہوں گے آپ اپنی جان سے پیاری بیٹی کو یوں بکھرا دیکھ کر۔'' نورین بیگم نے گم صم بیٹھے وجاہت صاحب سے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''کتنا سمجھایا تھا میں نے آپ کو کاش آپ میری بات مان لیتے تو اب یوں خاندان میں رسوا نہ ہونا پڑتا۔ اب کس کس کو جواب دیں گے کہ وہ بے قصور ہے میری معصوم بیٹی کی زندگی تباہ کر دی آپ نے، آپ ہماری خوشیوں کے قاتل ہیں۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' کمرے میں بیٹھی شانزے تک اُن کی آواز آسانی سے سنائی دے رہی تھی۔ ماں باپ کی یہ حالت اس سے برداشت نہ ہو رہی تھی آنسو زار و قطار بہتے چلے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

وجاہت علی اور مختار علی دو بھائی اور اُن کی ایک بہن یاسمین تھیں۔ تینوں بہن بھائیوں میں بے مثال پیار تھا۔ وجاہت اور مختار اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے۔ دونوں جڑواں تھے جبکہ یاسمین ان سے چار سال چھوٹی تھیں۔ مختار کے دو بیٹے اسید اور اسفند تھے اور ایک بیٹی یمنہ جبکہ وجاہت کی صرف ایک بیٹی شانزے تھی۔ یاسمین کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ بہن کی گود سُونی دیکھ کر مختار نے اپنا چھوٹا سا اسفند انہیں دے دیا۔ وہ

بھائی کی محبت پہ مشکور تھیں ورنہ آج کے اس دور میں کون اپنا لخت جگر دوسروں کے حوالے کرتا ہے چاہے وہ سگے بہن بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔

یاسمین اسفند کے آنے پر ہمیشہ خوش رہیں۔ اسفند کو بھی معلوم تھا وہ یاسمین کا نہیں بلکہ مختار کا بیٹا ہے۔ شانزے اور اسید ہم عمر تھے۔ شانزے کی پیدائش پر ہی دونوں بھائیوں نے اسید اور شانزے کی نسبت طے کر دی تھی۔ تب محبتیں تھیں اور اپنائیت بھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس اپنائیت پر گرد پڑتی چلی گئی تھی۔

وجاہت صاحب سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ زندگی کا گزر بسر اچھا ہو رہا تھا۔ مختار صاحب نے چھوٹے پیمانے پر بزنس شروع کیا تھا جو کچھ عرصے بعد ترقی پا گیا اور اُن کی حالت بہترین ہوگئی۔ یاسمین کی شادی بھی اچھے خاصے امیر گھرانے میں ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ اسید کی بینک میں جاب اور یمنہ کی شادی ہوگئی اسفند نے حال ہی میں ایم بی اے کیا اور جاب تلاش کررہا تھا۔ شانزے کے شوق کو دیکھتے ہوئے وجاہت صاحب نے اسے اسکول میں جاب کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ نورین بیگم (شانزے کی ماں) شانزے کی جلد از جلد شادی کرنا چاہتی تھیں۔ بیٹیاں جلد ہی اپنے گھر کی ہوجائیں تو بہتر ہے۔ نورین کے دل میں انجانا خوف تھا۔ جو آسیہ (اسید کی ماں) کو دیکھ کر مزید بڑھ جاتا کیونکہ اونچے اسٹیٹس اور بے پناہ دولت نے انہیں کچھ زیادہ ہی مغرور بنا دیا تھا شانزے کی باتوں میں خامی نکالنا اس کی جاب سے متعلق عجیب طرح سے باتیں کرنا اُن کی عادت بن چکی تھی۔ نورین بیچاری اُن کے سامنے ہمیشہ خاموش رہتی۔ آسیہ کو دولت کا خمار تھا جو بڑھتا جارہا تھا۔

''مختار صاحب اسید کی شادی کی بھی کوئی فکر ہے کہ نہیں؟'' آسیہ کے کہنے پر اُن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ارے بھئی کیا جلدی ہے جب دل کرے گا شادی کی ڈیٹ فکس کردیں گے۔ (اسفند کی طرف سے وہ بے فکر تھے اس کی ساری ذمہ داریاں یاسمین کے سپرد تھیں) گھر کی بچی ہے جب چاہیں رخصت کروا آئیں پہلے اپنے بیٹے سے اجازت تو لے لو۔ میں بھی بھائی صاحب سے بات کرتا ہوں۔'' مختار کے جواب پر آسیہ نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔

''معاف کیجیے گا مختار صاحب میں اس رشتے کے لیے قطعاً راضی نہیں ہوں۔ وہ بچپن کا رشتہ ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے ان کے اور ہمارے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میرا تو اُن کے گھر میں جی گھبرانے لگتا ہے۔ میں اس رشتے کے حق میں بالکل بھی نہیں ہوں۔ ویسے بھی وہ ماں بیٹی بہت چالاک ہیں میں اپنے گھر میں پُرسکون ماحول چاہتی ہوں۔'' وہ اکھڑے لہجے میں کہتی چلی گئیں۔

''کان کھول کر سن لیں میں اسید کے لیے کسی اچھے گھرانے سے لڑکی لے کر آؤں گی۔ جو بہترین جہیز بھی لائے گی۔ میرے بیٹے میں کیا کمی ہے جو شانزے کو اپنے سر پر سوار کرلوں۔''

''آسیہ میں اپنے بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا اور وہ رشتہ تمہاری مکمل رضامندی سے ہی ہوا تھا میں اب انکار کر کے رسوا ہونا نہیں چاہتا۔'' اُن کے گھر میں آسیہ بیگم کا حکم ہی مانا جاتا تھا۔ جن کا شمار ایسی عورتوں میں ہوتا جو گھر کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتی ہیں۔ انہی کا فیصلہ اول و آخر ہوتا تھا۔

''بہر حال فیصلہ جو اسید چاہے گا آپ کو وہی کرنا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلی گئیں جبکہ مختار نے سر تکیے سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ انہیں معلوم تھا اُن کی کس بات کو اہمیت نہیں دی جاتی حتیٰ کہ یمنہ کے معاملے میں بھی کاش وہ کچھ ایسا کرسکتے جس سے بھائی کے سامنے رسوا نہ ہونا پڑتا۔

''کبھی کبھی تقدیر پلٹا کھاتی ہے اور وہ ہوجاتا ہے جو انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔''

☆......☆......☆

کمرے میں اس وقت مکمل سناٹا تھا۔ وجاہت صاحب ساکت سے بیٹھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے جبکہ مختار شرمندہ سے سر جھکا کر بولنے کو الفاظ تلاش کررہے تھے۔ کچھ دیر پہلے جو

تماشا ہوا تھا، اُس کے اثرات شاید کبھی زائل نہ ہوں، طوفان تھا جو سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ آسیہ نے کیا کچھ نہ کہا تھا۔ ان کا لہجہ ہر احساس سے عاری تھا۔

''لوگ بولنے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اُن کے الفاظ سے دوسروں کو کتنی تکلیف ہوگی، اُن کے منہ سے نکلے نفرت زدہ لفظ دوسروں کی روح کو زخمی کردیں گے۔ وجاہت سب کچھ سہہ سکتے تھے مگر کوئی اُن کی بیٹی کے کردار پر انگلی اٹھائے یہ انہیں گوارہ نہ تھا آسیہ شانزے کے کردار کو اچھالتے ہوئے یہ تک بھول گئی تھیں کہ اُن کی اپنی بھی ایک بیٹی ہے۔ وجاہت مجھے معاف کردو میں اس رشتے کو بچانے کے لیے کچھ نہ کرسکا میں نے پوری کوشش کی مگر ناکامی میرا مقدر بنی۔ شانزے مجھے بہت پیاری ہے میں اسے یمنہ کی طرح سمجھتا ہوں۔'' شاید اُن کے پاس الفاظ ہی نہیں تھے۔ بھائی کے سامنے صفائی پیش کرنے کے لیے۔

''بس کریں بھائی صاحب مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے، مجھ میں اب کچھ سننے کی تاب نہیں میرے دلیے یہی تکلیف کافی ہے۔ مگر آپ لوگوں نے بہت برا کیا ہے۔ میں کس کس کو صفائی دیتا ہوں پھروں گا لوگ میری بیٹی کو قصور وار جانیں گے' اُن کے لہجے میں شکستگی تھی۔

آسیہ بہت خوش تھیں جو چاہا تھا وہی مل گیا اسید اُن کی کہی کوئی بات نہ ٹالتا مختار سے بات منوانا کون سا مشکل تھا۔ یمنہ نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کسی کی سننے کو تیار نہ تھیں۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم! پھوپو کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں بیٹا آپ کیسی ہو؟'' اُسے گلے لگاتے ہوئے یاسمین نے پوچھا تھا۔ شانزے ابھی اسکول سے تھکی ہوئی آئی تھی۔ مگر سامنے پھوپو کو دیکھ کر اُس کی ساری تھکاوٹ ختم ہوگئی۔ اُسے اپنی پھوپو بہت پیاری تھیں وہ بہت کم اُن کی طرف آتیں مگر جب بھی آتی کچھ دن اُن کے پاس ضرور رہتیں۔ ہنس مکھ سی پھوپو سے باتیں کرتے اُسے ایسا لگتا جیسے وہ اپنی کسی سہیلی سے باتیں کررہی ہو۔ یاسمین کو اپنی یہ بھتیجی زیادہ پسند تھی۔ معصومیت کا پیکر سب کا خیال رکھنے والی پُرخلوص سی شانزے کو دیکھ کر ایسا لگتا جیسے وہ انہی کی بیٹی ہو۔

اسفند کے بعد شانزے ہی تھی جن سے وہ اپنے دل کی تمام باتیں کہتی۔

''پھوپو آج آپ یہیں رہیں گی نا؟'' اُس نے تصدیق چاہی تھی۔

''جی بیٹا میں اِدھر ہی ہوں آپ بے فکر ہوجاؤ۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ شانزے بھی مسکراتی ہوئی اپنے روم میں چلی گئی۔

''بھابی اب کیا سوچا ہے شانزے کے بارے میں۔' اُس کے جانے کے بعد یاسمین نے بات شروع کی۔

''سوچنا کیا ہے یاسمین وہی ہوگا جو فیصلہ تمہارے بھائی جان کریں گے۔'' انہوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا اور سامنے میز پر رکھے گلدان کو دیکھنے لگیں۔

اپنوں کی بے رخی کس قدر اذیت دیتی ہے۔ اس کا اندازہ سب کو ہی تھا۔ شانزے کو چہرے کے تاثرات چھپانے میں کمال حاصل تھا وہ پہلے سے زیادہ ہنستی بولتی جیسے اسے رشتہ ٹوٹنے کا کوئی دکھ نہ ہو۔ بچپن کا رشتہ تھا بڑے ہونے تک

ہر طرف یہی سننے کو ملا تھا کہ وہ اسید کی منگیتر ہے اُنسیت تو ہونی تھی۔

''بھابی ایک بات کرنی تھی آپ لوگوں سے۔'' یاسمین نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہاں تمہارے بھائی جان آنے والے ہیں ابھی کچھ دیر تک پھر کر لینا بات۔'' انہوں نے کہا اور اُٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔

☆......☆......☆

''وجاہت بھائی آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا میں نے بہت محبت سے آپ کے سامنے جھولی پھیلائی ہے شانزے کو مجھے دے دیں۔

''اسفند آپ کا ہی بیٹا ہے آج کل جاب کی تلاش میں ہے۔ شانزے بہت خوش رہے گی۔ آپ مجھے مایوس مت لوٹائیے گا۔'' آنکھوں میں نمی لیے یاسمین نے امید بھری نظروں سے اپنے بھائی اور بھابی کی طرف دیکھا تھا اُن کی خاموشی اس کے لیے اذیت کا باعث بن رہی تھی۔

''یاسمین جو کچھ ہو چکا ہے میں اسے بھلانا چاہتا ہوں۔ اسفند بھی آسیہ کا بیٹا ہے جب اس نے ایک بیٹے کے لیے میری بیٹی نہیں لی تو پھر میں دوسرے کے لیے کیوں دوں؟''

''بھائی جان اسفند میرا بیٹا ہے ہمیشہ میرے پاس رہا ہے اس کی تربیت میں نے کی ہے وہ اسید اور آسیہ سے بہت مختلف ہے میں اسفند کی رضا مندی لے کر ہی آپ کے پاس سوالی بن کر آئی ہوں۔ اس امید پر کہ آپ مجھے مایوس نہیں لوٹائیں گے۔''

''دیکھو یاسمین میں جانتا ہوں اسفند کی تربیت تم نے بہت اچھی طرح کی ہے وہ اسید سے بہت مختلف ہے مگر ہے تو میرا ہی بھتیجا...... اور پھر میں اپنوں کو آزما چکا ہوں اب غیروں کو آزمانے میں کوئی حرج نہیں باقی میری بیٹی کی قسمت۔'' وجاہت صاحب نے شکستہ لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

آسیہ بیگم آج کل ہواؤں میں اڑ رہی تھیں اسید کی شادی ہو چکی تھی۔ شادی میں صرف وجاہت صاحب نے ناچاہتے ہوئے بھی ذرا دیر کو شرکت کی تھی۔ شانزے کی وہی روٹین تھی۔ صبح اسکول واپسی پر گھر کے کام میں ماں کا ہاتھ بٹانا اور شام میں کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھانا، اللہ تعالیٰ ہم سے بہتر چیز لے کر ہمیں بہترین شے عطا فرماتا ہے۔ جو کچھ ہوا شاید اس میں کوئی بھلائی تھی، دل میں ذرا سی اُنسیت ہی تو تھی جس کا اب نام و نشان نہ تھا، والدین ہمیشہ اولاد کا بھلا چاہتے ہیں، وہی اولاد ہی نیک ہوتی ہے جو والدین کے ہر فیصلے پر فرمانبرداری سے سر جھکا دیں۔

اسید کی شادی کو بمشکل پندرہ دن ہی ہوئے تھے کہ اس کی بیوی نے اصلیت دکھانی شروع کر دی تھی۔ سارا سارا دن آؤٹنگ کے نام پر باہر رہنا بقول اس کے گھر میں بیٹھنے سے میرا دم گھٹتا ہے۔ آسیہ بیگم کو اپنے کہے الفاظ سننے کو ملتے تھے اور وہ اب سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

انہیں پچھتاوا سا ہونے لگا۔ بڑے گھر سے بہو لے کر آنے کا سارا خمار اُتر چکا تھا۔ اس سے بہتر تھا شانزے ہی آجاتی اس گھر میں کم از کم کچھ رونق تو ہوتی۔ آج انہیں شانزے کی قدر اور اپنے فیصلے پر پچھتاوا محسوس ہو رہا تھا۔

کاش فیصلہ کرنے سے پہلے ہم اچھی طرح سوچ لیں۔ انسان جب لالچ میں گھرتا ہے تو آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے۔

☆......☆......☆

بھابی اسید نے تانیہ کو طلاق دے دی ہے۔ یاسمین نے کال کر کے نورین کو بتایا جواباً دوسری طرف کچھ دیر کو خاموشی سی چھا گئی۔

''اسید کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ شادی کوئی کھیل نہیں جب جی چاہا اپنا لیا، اور جب دل کیا چھوڑ دیا۔'' نورین کے آہستگی سے کہنے پر یاسمین شکستہ لہجے میں مزید بتایا۔

''بھابی اب کیا بتاؤں آپ کو، جو کچھ ہو چکا اس کے بعد تانیہ کو نہ چھوڑنا بے غیرتی ہی تھا۔ اس چھٹانک بھر کی لڑکی کو اپنی عزت کی تو پروا نہ تھی اُس نے دوسروں کی عزت بھی خاک میں ملا دی اللہ سب کو ذلت سے بچائے، آسیہ بھابی نے اسید کی زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' یاسمین کے لہجے میں دکھ تھا نورین کے پاس بولنے کو الفاظ نہ تھے۔ ذرا سے توقف کے بعد انہوں نے کہا یاسمین ہم بس دعا ہی کر سکتے ہیں اللہ آسیہ کو ہدایت عطا فرمائے، مجھے تو رہ رہ کریمنہ کی فکر ہوتی ہے پتہ نہیں وہ اپنے گھر میں خوش بھی ہے کہ نہیں، کبھی کبھار لمحہ بھر کو آتی ہے اور واپس چلی جاتی ہے۔'' نورین کو ابھی بھی اُن کی فکر کھائے جارہی تھی۔

''کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے نکلے نفرت وحقارت کے الفاظ روح کو زخمی کر جاتے ہیں۔ وہ وقت کے ساتھ مندمل بھی نہیں ہوتے بلکہ اُن کی تکلیف ہمیشہ رہتی ہے۔ کال ختم ہونے کے بعد کافی دیر تک نورین گم صم سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

''مجھے معاف کر دیں بھائی صاحب..... بہت برا کیا تھا میں نے آپ لوگوں کے ساتھ، جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے مجھے سکون نہیں ملے گا۔ آنکھوں میں آنسو لیے آسیہ وجاہت صاحب کے سامنے ندامت کی تصویر بنی تھیں۔

''معاف کرنے والی ذات تو اللہ پاک کی ہے بھابی! آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ہمارے لیے یہی بہت ہے۔''

''میں بہت کم عقل تھی جو اپنوں کو ٹھکرا کر غیروں میں خوشیاں تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی، خوشیاں تو ہمیشہ میرے ارد گرد منتظر رہیں مگر میں نے انہیں نظر انداز کیا۔'' آنسو صاف کرتے ہوئے انہوں نے خاص شانزے کی طرف دیکھا تھا جو اس وقت سب کو چائے دینے وہاں آتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے وہ زبردستی مختار کو اپنے ساتھ انکار کرانے لے کر آئی تھیں اس بار وہ زبردستی معافی مانگنے اور اسید کے لیے شانزے کا دوبارہ رشتہ مانگنے کے لیے آئی تھیں۔

''نورین شانزے پہلے بھی میری بیٹی تھی اب بھی ہے جو کچھ نادانی میں ہو چکا وہ بھول جائیں۔'' آسیہ بیگم نے لہجے میں بشاشت لاتے ہوئے بہت اُمید سے دیکھا تو نورین جیسے شاکڈ رہ گئیں۔

''کیا بھول جانا اتنا آسان ہے آسیہ؟ جو زخم تم نے ہمیں دیے اب ان پر نمک چھڑکنے آئی ہو؟'' نورین کے غصے سے کہنے پر وجاہت صاحب نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''وجاہت آخری فیصلہ تمہارا ہوگا اور جو تم کہو گے مجھے دل وجان سے منظور ہوگا چاہے اقرار کرو یا انکار، شانزے مجھے بہت عزیز ہے میری دعا ہے وہ ہمیشہ خوش رہے۔'' مختار نے بڑی متانت سے

وجاہت سے کہا اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آسیہ بھی کچھ مایوس سی اُن کے پیچھے چل دی تھیں۔

☆......☆......☆

وجاہت صاحب اپنے فیصلے پر دلی طور پر مطمئن تھے۔ نورین نے تمام اختیارات انہیں دے دیے تھے۔ انہوں نے شانزے کو بلا کر اس سے بات کی، شانزے نے کہا تھا۔

''ابو جی آپ میرے لیے جو فیصلہ کریں گے مجھے وہ منظور ہوگا۔'' شانزے کے جواب پر انہیں دلی خوشی محسوس ہوئی۔ اب وہ مکمل طور پر آسودہ تھے۔

''بیٹی ایک ہو یا زیادہ اُس کے رشتے کی پریشانی ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ یاسمین آج اُن کی طرف آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مختار کو بھی بلا لیا تھا۔ مختار، آسیہ اور اسید جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے وہاں خوشگوار سی چہل پہل تھی۔ آسیہ نے حیرت سے سب مہمانوں کی طرف دیکھا تھا۔ یاسمین صوفے پر ایک خاتون اور شانزے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ نورین کی سج دھج ہی آج نرالی تھی جبکہ وجاہت کے چہرے پر نرم مسکراہٹ تھی۔ اُن لوگوں کو دروازے کے بیچوں بیچ دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''آؤ مختار وہاں کیوں ٹھہر گئے ہو۔ آؤ میں تمہیں شانزے کے سسرال والوں سے ملواؤں۔'' سب مہمان اُن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جبکہ وہ تینوں حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ آج شانزے کا نکاح ہے اور اگلے مہینے رخصتی، وجاہت مسلسل مسکرا رہے تھے۔

''مختار رات میں نے تمہیں بتایا تھا نا صبح جلدی آنا خوشخبری سنانی ہے تمہیں۔ یہی خوش خبری تمہاری منتظر تھی۔ زین احمد وجاہت کے دوست تھے وہ ساری بات سے واقف تھے انہیں شانزے اپنے بیٹے ڈاکٹر ابشام کے لیے بہت پسند آئی تھی۔ وہ اپنی خواہش کا اظہار ایک دو بار پہلے بھی کر چکے تھے۔ اب تو جیسے انہیں دوہری خوشی ملی تھی۔

مختار نے آگے بڑھ کر بھائی کو گلے سے لگا لیا تھا۔ جبکہ اسید نے دکھ بھری نظروں سے ماں کو دیکھا اور واپسی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ آسیہ بیگم بھی شکست خوردہ سی اُس کے پیچھے لپکی تھیں۔ مہمانوں سے تعارف ہو چکا تھا نکاح کے بعد مبارکباد کا شور سا اٹھا تو مختار نے شانزے کو پیار کیا اور محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ خوشیاں اُن کے آنگن میں اُتر چکی تھیں۔

☆......☆......☆

شانزے کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے۔ اُس کی ایک پیاری سی بیٹی (کبشہ ابشام) بھی تھی۔ اِدھر آسیہ کے گھر میں جیسے ویرانی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ اسید اب شادی کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا جبکہ یمنہ بھی بہت کم میکے آتی تھی۔ آج سب یاسمین کی طرف جمع تھے اسفند کے ولیمہ کا دن تھا چہار سو خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ شانزے کی کھلکھلاہٹیں واضح کر رہی تھیں وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے محبت کرنے والا سسرال ملا تھا جہاں سب شانزے کے گن گاتے تھے۔ ابشام نے اُسے اکیڈمی بنا کر دی تھی کہاں وہ چھوٹے سے پرائیویٹ اسکول کی ٹیچر تھی اور اب ایک بڑی اکیڈمی کی پرنسپل اُسے ہمیشہ سے اس بات پر یقین تھا اللہ تعالیٰ اگر ہم سے بہتر شے لے لیتا ہے تو اس کے بدلے میں بہترین چیز عطا فرماتا ہے۔

☆......☆......☆

سینئر صحافی شاعر اور ملکوں ملکوں گھومے تجزیہ کار
محمود شام کی زیر ادارت
ماہنامہ
انتہاؤں میں رابطہ
اطراف
کراچی
جولائی 2014 سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا
بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میگزین
☆ ہمارا عزم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، تحقیقی اداروں، تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا
☆ دُنیا بھر میں پاکستان اور عالم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کی تلخیص
☆ پاکستان کے سیاستدانوں، تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں کے بارے میں عالمی تحقیقاتی اداروں کی بے لاگ رپورٹیں، آسان اردو میں
☆ ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ این جی اوز کی سرگرمیوں سے سجا عوام نامہ
☆ مصوری
☆ سفارت کاری
☆ کتابیں
☆ کامیاب زندگی
☆ فن تعمیر
☆ تندرستی
☆ پاکستان کے اضلاع
☆ موسیقی
☆ ہم اور ہمارے بچے
☆ طنز و مزاح
☆ اردو ادب سے انتخاب
لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت
☆ نیوز ایجنٹس کو معقول کمیشن
جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے...... ماہ نامہ ’اطراف‘ میں ہے
Ph: 0092 21 32274661
Mob:0300-8210636
سوئیٹ نمبر 508، لینڈ مارک پلازا، آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی
Email: mahmoodshaam@gmail.com Web Site: www.atraafmagazine.com
نمونے کی مفت کاپی کے لیے خط لکھئے

منی ناول

نسرین اختر نینا

سپنے سہانے

''مگر ایسی کون سی آفت آگئی ہے۔ جو پاپا کو میری شادی کی اتنی جلدی پڑی ہے کہ مجھ سے پوچھے بنا خود ہی رشتہ طے کر دیا۔'' ''میں ایک تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی ہوں کوئی گائے بھینس تو نہیں کہ جب مرضی ایک کھونٹے سے کھول کر کسی اور کھونٹے سے......

معاشرے کے اُتار چڑھاؤ سے جڑا ایک بہت خاص ناول

''حرام خور بڈھی ہوگئی مگر ابھی تک ڈھنگ کا کھانا بنانا نہیں آیا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ اور محنت مشقت کے بعد گھر آؤ تو اپنی منحوس شکل لیے بدمزہ سالن اور موٹی جلی ہوئی روٹیاں یوں میرے سامنے پھنکتی ہے جیسے میں کوئی گلی کا کتا ہوں۔'' صدیق نے غصے سے کہا اور سالن کی پلیٹ اُٹھا کر سامنے دیوار پہ دے ماری۔ دیوار کے ساتھ ایک چارپائی پڑی تھی جس پہ سب سے چھوٹا دو سالہ حمیر سویا ہوا تھا۔ گرم گرم سالن کے چھینٹے اُس پر پڑے تو وہ نیند ہی میں بلبلا کر رونے لگا۔

''چپ کرواؤ اس پلے کو۔'' صدیق غصے سے دھاڑا تو صغراں بچے کو اُٹھا کر دوسرے کمرے میں اپنی ساس کے پاس چلی گئی۔ باقی بچے بھی اِدھر اُدھر سرک گئے اور صدیق بکتا جھکتا گھر سے باہر نکل گیا۔

سولہ سالہ انیلہ جو ایک طرف فرش پر بیٹھی میٹرک کے آخر پیپر کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ دونوں گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ یہ سین اس ایک کمرے کے مکین تقریباً ہر روز ہی رات کو دیکھتے تھے۔ صبح صبح تو صدیق تین پراٹھوں دو انڈوں اور دو بڑے بڑے مگ چائے پر مشتمل ڈٹ کر ناشتہ کر کے گھر سے نکل جاتا تھا اور رات گئے ہی گھر آتا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ رات کے کھانے میں بھی اُسے مرغی و گوشت ملے۔ مگر روزانہ ایک سو روپے جو وہ گھر میں دیتا تھا۔ اُس سے تو ڈھنگ کی ایک وقت کی ہانڈی بھی بننی محال تھی۔ وہ تو صغراں بے چاری سلائی کڑھائی کر کے کسی طرح گاڑی چلا رہی تھی۔ یہ شکر تھا کہ مکان کا کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا۔

موہنی روڈ کی ایک تنگ و تاریک گلی میں پانچ مرلے کا تین منزلہ مکان صدیق کے والد نے بھلے وقتوں میں بنالیا تھا۔ نچلی منزل پر دو کمرے، برآمدہ اور چھوٹا سا صحن تھا۔ برآمدے ہی میں ایک طرف کھانا بنانے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔

ایک کمرے میں صدیق کے بوڑھے والدین رہتے تھے جبکہ دوسرے کمرے میں صدیق اپنی بیوی صغراں اور پانچ بچوں کے ساتھ زندگی کے دن جیسے تیسے گزار رہا تھا۔ بڑی انیلہ اور اُس سے چھوٹی راحیلہ دادا دادی کے کمرے میں سوتی تھیں، کیونکہ اس چھوٹے سے کمرے میں تو صرف تین چارپائیاں ہی آسکتی تھیں۔

گھر کی دوسری منزل پر منجھلے چچا اور تایا ابو رہتے تھے۔

منجھلے چچا کے دو بچے تھے جبکہ تایا ابو کے چار بچے تھے۔ سب سے اوپر والی منزل پر ایک کمرہ، برآمدہ اور کچن تھا جس میں انیلہ کی بیوہ پھوپو اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ مقیم تھیں۔ اتنے چھوٹے سے گھر میں اتنے افراد کے رہنے کی وجہ سے ہر وقت چخ چخ ہوتی رہتی تھی۔

دادا، دادی کا وجود غنیمت تھا کہ وہ فریقین میں صلح، صفائی کروا دیتے تھے۔ یونہی دن گزر رہے تھے۔

انیلہ کے دو چچا مڈل ایسٹ گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے والدین کو اُن کے اخراجات کے لیے پیسے بھیج دیتے تھے۔ جس میں سے کچھ وہ اپنی بیوہ بیٹی کو دیتے تھے اور کچھ رقم گھر کے بلوں اور گھر کی عام قسم کی ٹوٹ پھوٹ مرمت پر خرچ کرتے تھے۔

صغراں چاہتی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرے۔ تاکہ وہ پڑھ لکھ کر اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر معاشرے میں ایک باوقار مقام حاصل کرسکیں۔ مگر گھر کے حالات اور لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے بچوں کو پڑھنے لکھنے کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت ماں باپ کے درمیان ہونے والے جھگڑوں کی وجہ سے جلتے کڑھتے رہتے تھے۔ سوائے انیلہ کے کوئی بھی بچہ پرائمری کلاسز سے زیادہ نہیں پڑھ سکا تھا۔ دونوں چھوٹی بہنیں ایک ایک کلاس میں کئی کئی سال فیل ہو کر گھر ہی میں ماں کے ساتھ سلائی کڑھائی اور گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھیں، جبکہ انیلہ سے چھوٹا بھائی ظفر آوارہ گردی میں پڑ گیا تھا پھر تنگ آ کر ماں نے اُسے گھر کے قریب واقع شاپ پر بٹھا دیا تھا تاکہ کم از کم مکینک ہی بن جائے۔

☆......☆......☆

''سامیہ بیٹی آج تمہارا آخری پرچہ تھا نا۔''

''جی امی......!''

''چلو شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ تمہارے سارے پرچے خیریت سے ہو گئے۔''

''مگر امی ابھی پریکٹیکل رہتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں وہ بھی چند دنوں میں ہو جائیں گے۔ خیر میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی امی......!'' سامیہ نے اپنے تراشیدہ سلکی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے حیرت سے سعدیہ بیگم کو دیکھا۔ جو کافی متفکر نظر آ رہی تھیں۔

''وہ...... وہ......'' سعدیہ بیگم ہچکچا کر ایک نظر اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی کے معصوم اور حسین چہرے پر ڈالی اور پھر بوجھ اتارنے والے انداز میں جلدی جلدی بولیں۔

''وہ دراصل تمہارے پاپا نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو تمہاری شادی ہے۔'' یہ کہہ کر سعدیہ بیگم نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

''ک...... کیا......؟'' سامیہ کا منہ حیرت

سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''امی ...... آپ ...... آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ ابھی میرے ایگزامز بھی مکمل نہیں ہوئے۔ اور آپ جانتی ہیں کہ میں نے ہمیشہ سے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھے تھے۔

''اور ...... اور آپ مجھے یہ ...... کیا خوش خبری سنا رہی ہیں۔''

''تمہارے مزید تعلیم حاصل کرنے پر کوئی قدغن نہیں ہوگی۔ تم جتنی مرضی اور جیسی تعلیم حاصل کرنا چاہوگی۔ اُس کی تمہیں اجازت ہوگی۔ تمہارے پاپا نے لڑکے والوں سے اس بات کی گارنٹی لے لی ہے۔''

امی نے بدستور نظریں جھکائے ہوئے کہا۔ یوں جیسے بیٹی سے نظریں چار کرنے کی اُن کی ہمت نہیں ہو رہی ہو۔

''مگر ایسی کون سی آفت آ گئی ہے۔ جو پاپا کو میری شادی کی اتنی جلدی پڑی ہے کہ مجھ سے پوچھے بنا خود ہی رشتہ طے کر دیا۔''

''میں ایک تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی ہوں کوئی گائے بھینس تو نہیں کہ جب مرضی ایک کھونٹے سے کھول کر کسی اور کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔'' سامیہ نے قدرے غصے اور جھنجلاہٹ سے کہا۔

''تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔ پریشان کیوں ہوتی ہو؟'' امی نے دھیرج سے کہا۔

''میری بچی، میری جان کوئی بھی والدین اپنی اولاد کے دشمن نہیں ہوتے۔ تمہارے پاپا نے جس شخص کو تمہارے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک اچھا انسان ہے اور تم انشاء اللہ ہمیشہ اُس کے ساتھ خوش رہو گی۔ امی نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے سامیہ کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تم اُسے بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ بلکہ اُس کی حیثیت اس گھر کے ایک فرد کی سی ہے۔ جس کے ہم پہ اس قدر احسانات ہیں کہ ہم زندگی بھر اُن کو نہیں اُتار سکتے۔''

''ک ...... کک ...... کیا مطلب ہے آپ کا؟'' سامیہ نے شدید حیرت سے کہا۔

''آپ ...... آپ وہاب انکل کی بات کر رہی ہیں وہ کالا بھجنگ موٹا بھدا شخص جو مجھ سے پورے بیس سال بڑا ہے۔ پاپا نے ایسا سوچا بھی کیسے؟''

''خیر کالا تو نہیں کہہ سکتے اُسے، ہاں ذرا سا سانولا ہے اور اتنا موٹا بھی نہیں ...... بس بھرا بھرا جسم ہے اُس کا ...... وہ بھی بے فکری اور خوشحالی کی وجہ سے ہے اور تمہیں کس نے کہہ دیا کہ وہ تم سے بیس سال بڑا ہے۔ دس بارہ سال ہی بڑا ہوگا اور اتنا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ تمہارے پاپا مجھ سے تقریباً پندرہ سال بڑے ہیں اور ہم نے ساری زندگی نہایت سکون سے گزاری ہے۔

بڑی عمر کے مرد بیویوں کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

امی نے سامیہ کے تمام اعتراضات کا جواب نہایت اطمینان سے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ کیوں نہیں کہتیں کہ آپ لوگوں نے وہاب انکل کے احسانات کا بدلہ چکانے کے لیے مجھے قربانی کا بکرا بنایا ہے۔'' سامیہ کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔

''قربانی کا بکرا کیوں، عیش کرو گی اُس کے گھر میں، اُس کا وسیع کاروبار ہے روپے پیسے کی ریل پیل ہے۔ کوئی لمبا چوڑا خاندان بھی نہیں اُس کا، بوڑھے ماں باپ ہیں دو بہنیں وہ شادی شدہ اور اپنے گھروں میں ہیں۔ بڑا بھائی والدین کے

ساتھ پرانے گھر میں رہے گا۔ تمہارے لیے نئی کوٹھی بنائی ہے بڑے گھر میں عیش کروگی۔''

''وہاب نے یہ سب کچھ تمہاری خاطر کیا ہے۔ کیونکہ وہ تمہیں اُس وقت سے پسند کرتا ہے جب تم دس گیارہ سال کی بچی تھیں۔ تمہاری خاطر ہی اُس نے اب تک شادی نہیں کی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ شخص تمہیں اس قدر شدت سے چاہتا ہے۔ ساری زندگی ملکہ بنا کر تمہیں رکھے گا۔''

''آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ مجھے روپے پیسے اور عیش و آرام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ میں ڈاکٹر بنوں۔'' سامیہ نے آنسوؤں سے بوجھل لہجے میں کہا۔

''تو تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ اگر تم نے ایف ایس سی میں اتنے نمبر لے لیے کہ تمہارا میڈیکل کالج میں داخلہ ہوسکے تو وہاب تمہیں ڈاکٹر بننے سے کبھی نہیں روکے گا۔ اور ہر طرح سے تمہاری مدد کرے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اُس نے اِس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرنے میں کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کرے گا۔''

''اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے، مجھے وہاب انکل ...... وہ ...... وہ وہاب سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔'' سامیہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

''مجھے یقین تھا کہ میری پیاری بیٹی اپنے والدین کا مان ضرور رکھے گی۔'' امی نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور سامیہ کو پیار سے گلے لگالیا۔

☆......☆......☆

''امی ...... امی کہاں ہیں آپ؟'' عالی نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے خوشی سے بھرپور آواز میں کہا۔

''کیا بات ہے بھائی بہت خوش نظر آرہے ہو۔'' صباحت نے بھائی کی آواز سن کر کچن سے نکلتے ہوئے استفسار کیا۔

''ارے واہ مٹھائی۔'' صباحت نے عالی کے ہاتھ میں پکڑے بڑے سے مٹھائی کے ڈبے کو دیکھ کر خوشی سے کہا۔

''عالی بیٹا تم آج جلدی کیسے گھر آگئے؟'' عفیرہ نے چھت سے اترتے ہوئے عالی سے پوچھا۔

''وہ ...... وہ امی بہت بڑی خوشخبری ہے۔ میرے پاس آپ کے لیے؟''

''کیا ......؟'' عفیرہ نے ایک لمحہ کے لیے رُک کر کہا۔

''کیا تمہاری ترقی ہوگئی ہے؟ اس سے بھی بڑھ کر منہ کھولیے اور مٹھائی کھائیے۔'' عالی نے ڈبہ کھول کر ایک برفی کا پیس ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی تو دو نا بھائی مٹھائی ......'' صباحت نے ڈبے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں میری بہنا۔ تمہاری اور امی ابو کی دعاؤں کی بدولت ہی تو آج میں نے یہ اتنی بڑی خوشی پائی ہے۔'' عالی نے پورا گلاب جامن صباحت کے منہ میں ٹھونس کر کہا۔

''اب کچھ بتائے گا بھی یا یونہی پہیلیاں ہی بجھوائے جائے گا۔'' عفیرہ نے پیار سے بیٹے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''امی ...... پیاری امی آپ کا یہ لائق فائق بیٹا سی ایس ایس کے امتحان میں کامیاب ہوگیا ہے۔'' وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔

''شکر ہے میرے مولا کا کہ اُس نے مجھ

غریب کی دعاؤں کو قبول فرمایا۔ بیٹا یہ تم نے بہت بڑی خوشی کی خبر سنائی ہے۔ اپنے ابا کو بتایا تم نے۔'' عفیرہ نے عالی کی پیشانی پر اپنے ممتا بھرے ہونٹ ثبت کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی امی میں نے انہیں آفس ہی سے فون کر دیا تھا۔''

عالی کا سانولا چہرہ جوش و مسرت سے گلنار ہو رہا تھا، اُس کی برسوں کی آرزو پوری ہوگئی تھی۔ اب اُس کا معاشرے میں ایک باوقار مقام تھا۔ اب وہ آفیسر بن چکا تھا اور یہی اُس نے ہمیشہ چاہا تھا۔

اگرچہ وہ انجینئر تھا۔ ایک پرائیویٹ فرم میں بہت اچھی پوسٹ پر تھا۔ مگر یہ اُس کی منزل نہیں تھی۔ اُس کی منزل تو سول سروس تھی۔ اُسے ملا بھی کسٹم گروپ تھا۔ جس میں میرٹ پر سلیکٹ ہونے کا وہ کبھی زندگی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر چونکہ اُس کا ڈومیسائل ایک پس ماندہ علاقے کا تھا۔ اس لیے اس علاقے کے لیے مخصوص کردہ کوٹے پر اُس کی سلیکشن ہوئی تھی۔ اس سے پہلے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ بھی اُس کا اسی علاقے کے کوٹے ہی پہ ہوا تھا۔ اور یونیورسٹی کی مہنگی تعلیم کے اخراجات کے لیے اُسے یونیورسٹی کی طرف سے اسکالرشپ ملا تھا۔ کیونکہ اُس کے والد اسی یونیورسٹی میں کلرک تھے۔ ٹیوشن فیس اُس کی ویسے ہی معاف ہوگئی تھی۔

آج ایک غریب کا بیٹا سی ایس ایس آفیسر بن چکا تھا اور اُن کے غریب گھرانے کے دلدر ہمیشہ کے لیے دور ہونے جا رہے تھے۔ ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد اُس کی سی ایس پی آفیسر کی حیثیت سے تعیناتی ہو جانی تھی۔ پھر وہ شہر کی اس تنگ گلی میں واقع چند مرلے کے ڈربے نما مکان سے کسی اچھی کالونی میں شاندار سی کوٹھی میں اپنے والدین اور بھائی بہن کے ہمراہ منتقل ہو جائے گا۔ وہ گھر کے در و دیوار پر ایک نظر ڈال کر سوچ رہا تھا۔

''بھائی کس سوچ میں ڈوب گئے۔ یہ چائے پیو، پھر میں تمہارے لیے کھانا بناتی ہوں۔'' صباحت نے عالی کے بیڈ کے پاس پڑی میز پر چائے کا بھاپ اڑاتا ہوا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

''امی کہاں ہیں، انہوں نے چائے پی لی کیا؟'' عالی نے چائے کا کپ لیتے ہوئے پوچھا۔

''وہ امی شکرانے کے نوافل ادا کر رہی ہیں۔'' صباحت کی بات سُن کر عالی کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اور ماں کی محبت کا احساس اُس کے دل میں کئی گنا بڑھ گیا اور اُس کے ہاتھ بے اختیار والدین کی صحت و تندرستی کے لیے خدا تعالیٰ کے حضور اٹھ گئے۔

''آؤ...... عفیرہ بہن کیسے آنا ہوا، تم تو اس گھر کا رستہ ہی بھول گئی ہو، کہاں ہوتی ہو آج کل......؟'' صغراں نے عفیرہ کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''بس گھر کے کام کاج ہی سے فرصت نہیں ملتی۔''

''ہاں تم صحیح کہتی ہو بہن، یہ گھر کے کام تو سارا دن ختم نہیں ہوتے۔ تھوڑی دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہو جاؤ تو سو کام اکٹھے ہو جاتے ہیں۔'' صغراں نے بھی عفیرہ کی تائید کی۔

''اچھا چھوڑو اب باتوں کو...... یہ لو منہ میٹھا کرو۔'' عفیرہ نے صغراں کی جانب رومال سے ڈھکی ہوئی مٹھائی کی پلیٹ بڑھائی۔

''یہ کس خوشی میں؟ صباحت بیٹی کا رشتہ تو نہیں طے کر دیا کہیں۔'' صغراں نے مٹھائی کی پلیٹ

لیتے ہوئے کہا۔
''نہیں بھئی...... وہ اپنا عالی بیٹا مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوگیا ہے خیر سے۔'' عفیرہ نے جواب دیا۔
''شکر ہے میرے مولا کا، بہت بہت مبارک ہو عفیرہ بہن...... میری طرف سے مبارک بھائی اور عالی کو بھی مبارکباد کہنا۔
ماشاء اللہ عالی بیٹا بہت محنتی اور ذہین ہے۔ آج اللہ تعالیٰ نے اُسے اس کی محنت کا شاندار صلہ عطا کیا ہے۔'' صغراں نے خلوص سے کہا۔
''کون آیا ہے صغراں بیٹی؟'' کمرے سے صغراں کی بوڑھی ساس نے آواز دی۔
''وہ اماں یہ عفیرہ بہن آئی ہیں مٹھائی لے کر۔'' صغراں نے وہیں کھڑے کھڑے اونچی آواز میں ساس کو جواب دیا۔
''عفیرہ بیٹی باہر کیوں کھڑی ہو۔ آؤ اندر آجاؤ۔'' ساس نے کمرے سے عفیرہ کو پکارا۔
''نہیں خالہ میں چلتی ہوں۔'' عفیرہ نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوکر صغراں کی ساس سے کہا اور پھر صغراں کو خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔
صغراں مٹھائی کی پلیٹ لے کر ساس کے کمرے میں داخل ہوگئی۔
''لو اماں مٹھائی کھاؤ۔'' صغراں نے پلیٹ اماں کے سامنے بستر پر رکھ دی۔
''میں کہاں میٹھا کھا سکتی ہوں۔ نامراد شوگر نے جینا حرام کررکھا ہے۔؟'' یہ کہہ کر اماں نے رس گلے کا ایک شیرہ ٹپکتا ہوا پیس اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔
''اور لیں اماں۔'' صغراں نے کہا۔
''نا...... نا بیٹی یہی بہت ہے۔ تم بچوں کو کھلا دو خوش ہوجائیں گے بے چارے۔'' اماں نے کہا۔
اُن بدنصیبوں کی قسمت میں خوشی کہاں...... جن کا باپ صرف اُن کو پیدا کرنے کی حد تک ہی ہے۔ ورنہ وہ جیتے ہیں یا مرتے ہیں اُسے کوئی غرض نہیں۔ صغراں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔
''زیادہ پریشان نا رہا کرو بیٹی بس خدا سے نماز میں گڑگڑا کر اس کے راہِ راست پر آنے کی دعا کیا کرو۔ انشاء اللہ وہ ضرور سدھر جائے گا۔'' اماں بی نے کہا۔
''بہت دعائیں مانگتی ہوں۔ شاید میری دعاؤں میں کوئی اثر ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ نہیں پا رہیں۔'' صغراں بہت دلگرفتہ ہو رہی تھی۔
''ایسا نہیں کہو بیٹی...... اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، کبھی نا کبھی ضرور تمہاری دعا قبول ہوگی۔''
''اللہ کرے وہ دن جلد آئے۔ اچھا میں ہانڈی روٹی کرلوں۔ شام ہورہی ہے انیلہ آج پارلر گئی ہے کہہ رہی تھی کہ جب تک میٹرک کا رزلٹ نہیں آجاتا۔ تب تک وہ بیوٹی پارلر میں کچھ کام سیکھ لے۔ اس طرح چھٹیوں میں وقت اچھا گزر جائے گا۔''
''اے ہاں...... وہ تمہاری چچیری بہن سعدیہ نے اپنے محلے والے پرانے گھر میں پارلر کھولا ہے نا۔ اچھا ہے انیلہ بیٹی اُس سے کام سیکھ لے۔ کل کو چار پیسے کمائے گی۔'' اماں بی نے چارپائی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اور صغراں مٹھائی کی پلیٹ اپنے کمرے میں لے گئی۔ جہاں سب سے چھوٹا بیٹا ایک جلنگا سی چارپائی پر سویا ہوا تھا۔ جبکہ راحیلہ اور جمیلہ بڑی محویت سے ٹی وی پر کوئی

ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔

''ارے لڑکیو...... تم ٹی وی دیکھ رہی ہو شام ہو رہی ہے کچھ ہانڈی روٹی کی فکر بھی ہے کہ نہیں؟''

صغراں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''بنا لیں گے اماں ہانڈی بھی...... دال ہی تو پکانی ہے۔ کون سے ہم نے مرغ پکانے ہیں۔'' تیز وطرار بجیلہ نے اپنی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر مرکوز کیے کیے کہا۔

''شکر کرو۔ دال بھی مل جاتی ہے۔'' صغراں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''یہ کیا ہے اماں؟'' راحیلہ نے ماں کے ہاتھ میں پلیٹ دیکھ کر پوچھا۔

''مٹھائی ہے عفیرہ بہن دے کر گئی ہیں۔''

صغراں نے پلیٹ راحیلہ کی طرف بڑھائی اور دونوں بہنیں ندیدوں کی طرح جلدی جلدی مٹھائی کے پیس اٹھا کر کھانے لگیں۔

''یہ عفیرہ خالہ کس خوشی میں مٹھائی بانٹ رہی ہیں؟'' بجیلہ نے پوچھا۔

''وہ عالی نے مقابلے کا امتحان پاس کر لیا ہے نا۔''

''واؤ مزہ آ گیا۔ انیلہ آپی کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ مزے سے اتنے بڑے آفیسر کی دلہن بنیں گی۔'' راحیلہ نے خوشی سے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پتہ نہیں عالی انیلہ سے اب شادی کرے گا بھی یا نہیں۔'' صغراں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں کریں گے۔ ہماری انیلہ آپی میں کیا کمی ہے۔ اتنی تو خوبصورت ہیں۔ پھر سارے خاندان کی دوسری لڑکی ہے جس نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ اور کیا چاہیے عالی بھائی کو بچپن کی منگیتر ہے اُن کی۔'' راحیلہ نے پُر جوش انداز میں کہا۔

''بچپن کی منگنی کی کیا اہمیت ہے۔ ہمارے اور اُن کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے اب، عالی کو اچھے سے اچھے گھر کی پڑھی لکھی لڑکی کا رشتہ مل سکتا ہے۔ پھر اُسے کیا پڑی ہے ایک غریب میٹرک پاس لڑکی کے بارے میں سوچے۔'' صغراں بہت مایوس ہو رہی تھی۔

''اماں تم نے کبھی بھی کوئی اچھی بات منہ سے نہیں نکالنی، ہر وقت بس روتی دھوتی ہی رہتی ہو۔''

آج عفیرہ خالہ کے حالات بدلے ہیں۔ کبھی نہ کبھی ہمارے بھی بدل ہی جائیں گے۔''

ڈراموں اور فلموں کی شوقین بجیلہ ہمیشہ ہی خوش گمانیوں میں مبتلا رہتی تھی۔ وہ یہی سوچتی تھی کہ جس طرح ڈراموں اور فلموں کے کرداروں کے دکھ اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد آخرکار اچھے دن آ جاتے ہیں اسی طرح اُن کے گھر کے حالات بھی پلٹا کھا جائیں گے۔ شاید اُس کی عمر ہی ایسی تھی۔ جہاں بچے مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھوئے رہتے ہیں اور یوں اپنے اردگرد کی بدصورتیوں اور غربت وافلاس بھری حقیقتوں سے نظر چرا لیتے ہیں۔

☆......☆......☆

''سعدیہ بیگم تم نے بات کی سامیہ بیٹی سے اُس کے رشتے کے سلسلے میں؟'' اعظم صاحب نے ریموٹ سے چینل بدلتے ہوئے کہا۔

''ہاں وہ تو میں نے کل ہی اُسے بتا دیا تھا۔''

''تو پھر کیا کہا اُس نے؟''

''پہلے تو کافی پریشان تھی۔ مگر جب میں نے

اُسے سمجھایا کہ وہ شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھ سکے گی تو پھر وہ مان گئی تھی۔''

''شکر ہے اللہ کا مجھے بڑی فکر تھی کہ میں وہاب کو زبان تو دے چکا ہوں۔ کہیں سامیہ بیٹی انکار کر کے میری سبکی نا کروادے۔''

یہ رشتہ بھی اُس نے خود نہیں مانگا تھا۔ بلکہ ہم دونوں کے ایک مشترکہ دوست کی والدہ کے ذریعے مجھ تک بات پہنچائی تھی۔ وہاب اچھا انسان ہے اور اپنے بھائی حارث سے تو بالکل مختلف ہے۔ اعظم صاحب نے تاسف سے تفصیل بیگم صاحبہ کے گوش گزار کی۔

حارث شوبزنس کا میگزین نکالتے ہیں اور آج کل لڑکیوں کی اکثریت شوبزنس میں نام بنانے کے چکر میں رہتی ہے اور یہ صاحب انہیں سنہرے سپنے دکھا کر اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔

کسی کو ماڈلنگ کا جھانسا دیا جاتا ہے۔ تو کسی کو فلم، ٹی وی اور ریڈیو میں چانس دلوانے کے وعدے کیے جاتے ہیں۔ اپنے میگزین میں اُن کی تصاویر لگا دیتا ہے۔ ٹی وی، فلم اور ریڈیو کے سرکردہ افراد سے دوستیاں ہیں۔ چھوٹے موٹے رول بھی دلوا دیتا ہے۔ کبھی کسی فیشن شو میں ماڈلنگ کا چانس دلوا کر اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ پتہ نہیں کس پہ گیا ہے یہ شخص۔ سارا خاندان اس قدر شریف ہے۔ سیدھے سادے لوگ ہیں۔ مگر اس کی وجہ سے بوڑھے والدین بھی شرمندہ شرمندہ سے رہتے ہیں۔'' اعظم صاحب نے ٹی وی کا سوئچ آف کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''خیر ہمیں اُس سے کیا لینا دینا۔ شکر ہے کہ وہ الگ تھلگ رہتا ہے۔ وہاب تو اُسے ویسے بھی زیادہ منہ نہیں لگاتے۔ ہماری بیٹی اپنے الگ گھر میں رہے گی اور ہمیں کیا چاہیے۔ ارے باتوں باتوں میں اتنا وقت گزر گیا۔ اچھا میں کچن سمیٹ کر آپ کے لیے دودھ کا گلاس گرم کر کے لاتی ہوں۔ آپ کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کر لیں۔'' سعدیہ بیگم نے کہا اور کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

سامیہ آپی کیا واقعی آپ کا رشتہ وہاب انکل سے طے ہوگیا ہے؟ سامیہ سے چھوٹی پندرہ سالہ ہانیہ نے اسکول سے واپس آ کر سب سے پہلے بڑی بہن سے حیران ہو کر یہی سوال کیا۔

''تمہیں کس نے بتایا؟'' سامیہ نے حیرت سے پوچھا۔ وہ میں اسکول سے واپسی پر امی کے پارلر چلی گئی تھی نا تو وہاں امی انیلہ آپی کو بتا رہی تھیں۔

''یہ امی بھی نا سارے زمانے میں ڈھنڈورا پیٹتی پھر رہی ہیں۔ اب یہ انیلہ جا کر سارے خاندان میں پھیلا دے گی۔ پتہ نہیں امی ابا کو اتنی جلدی کیا پڑی ہے۔ مجھے گھر سے نکالنے کی۔ میری ساری سہیلیاں میڈیکل کالج میں جائیں گی۔ اور میں...... اپنے باپ کی عمر کے بدصورت مرد کی بیوی بن جاؤں گی۔'' سامیہ نے دھواں دھار روتے ہوئے کہا۔

''نا رو سامیہ آپی، آپ نے امی سے کہنا تھا نا کہ ابھی آپ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتیں؟'' ہانیہ نے سامیہ کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میرے چاہنے یا نا چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اس گھر میں وہی ہوگا جو پاپا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے تو مجھ سے پوچھے بغیر ہی میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں والدین۔'' سامیہ نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپی میں پاپا سے بات کروں، آپ تو جانتی ہیں نا کہ پاپا میری ہر بات مانتے ہیں۔ کیونکہ میں اُن کی لاڈلی بیٹی ہوں نا۔'' ہانیہ نے قدرے اِترا کر کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں پاپا کے لاڈ پیار بس یونہی سے ہیں مجھے کیسے بچپن ہی سے ڈاکٹر بیٹی ڈاکٹر بیٹی کہتے آرہے ہیں۔''

''کیسے کیسے خواب مجھے دکھائے تھے کہ مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ بھیجیں گے۔ یہ کریں گے وہ کریں گے اور اب ابھی میں امتحان سے فارغ ہی ہوئی ہوں کہ میری شادی کی تیاریاں شروع کردی ہیں۔ مجھے تو چولہا تک جلانا نہیں آتا میں خاک گھرداری کروں گی اور پھر ساتھ ساتھ پڑھائی بھی، پتہ نہیں میں یہ سب کیسے کرپاؤں گی۔

''میری سہیلیاں میرا مذاق اڑائیں گی کہ میں نے اتنی بڑی عمر کے بدشکل شخص سے شادی کرلی۔ جبکہ میں تو ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ پہلے میں خوب دل لگا کر پڑھوں گی اور پھر کسی انتہائی خوبصورت ڈاکٹر سے شادی کروں گی۔ مگر میرے نصیب میں تو ایک میٹرک پاس ڈرائی کلینر ہی لکھا تھا۔'' سامیہ بہت دکھی اور جذباتی ہورہی تھی۔ اُس کے ساتھ ہانیہ بھی دلگرفتہ تھی۔

☆......☆......☆

''عالی بیٹے سر پر تیل کا مساج کیا کرو۔ کس قدر خشک ہورہے ہیں تمہارے بال اور گرنے بھی لگے ہیں۔ اس طرح تو تم بہت جلد گنجے ہوجاؤ گے۔'' عفیرہ بیگم نے صحن میں چارپائی پر لیٹے ہوئے عالی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

''امی مجھے بہت اُلجھن ہوتی ہے۔ تیل لگانے سے، عجیب چپ چپے سے بال ہوجاتے ہیں۔'' عالی نے منہ بنا کر کہا۔

''بیٹا بالوں کو شیمپو کرنے سے پہلے تیل لگایا کرونا۔ دھونے کے بعد تیل نکل جاتا ہے۔''

''امی میں بالوں کو جیل لگالیتا ہوں۔ وہ کافی ہے، مقصد تو بالوں کو سیٹ کرنا ہی نا ہے۔ آئے ہائے دفع کرو ان فضول جیل ویل کو، یہ سب بازاری چیزیں بالوں کو اُلٹا نقصان پہنچاتی ہیں۔ مگر تم لوگ سمجھتے کب ہو، موئے فیشن کے پیچھے اپنے بالوں کو تباہ کرلیتے ہو۔ میں اس اتوار کو خود تمہارے بالوں کو تیل لگاؤں گی۔''

''او کے پیاری امی جو آپ کی مرضی ہو، کیجیے۔ ہاں البتہ سامان باندھنا شروع کردیں۔ ہم اگلے ماہ یہاں سے شفٹ ہورہے ہیں۔'' عالی نے اُٹھ کر چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہائیں شفٹ ہورہے ہیں۔ مگر کہاں؟'' عفیرہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''کینٹ میں، مگر وہاں کیوں؟ اس گھر میں کیا برائی ہے؟''

''برائی......؟'' عالی نے چھوٹے سے ڈھائی مرلے کے مکان پر حقارت بھری نگاہ ڈالی اور طنزیہ طور پر ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں...... برائی تو کوئی نہیں ہے۔ یہ تو مغل بادشاہ شاہجہاں کا تعمیر کردہ عظیم الشان محل ہے۔''

''بری بات ہے، عالی بیٹے ایسے نہیں کہتے۔ اسی گھر میں تم پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ہو، یہیں رہ کر تم نے تعلیم حاصل کی اور آج اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنا بڑا عہدہ عطا فرمایا ہے۔ انسان کو ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔'' عفیرہ بیگم نے سخت برا مان کر کہا۔

''میں ناشکری کب کر رہا ہوں جب تک ہمارے حالات بہتر نہیں ہوئے تھے۔ اس گھر نے ہمیں پناہ دی۔ اب جب ہم اس قابل کہ اچھی جگہ جا کر رہ سکیں تو اس میں کیا حرج ہے؟''

''حرج تو کچھ نہیں...... مگر ہم برسوں سے یہاں رہ رہے۔ سارے عزیز واقارب بھی یہی ہیں۔ ہر چیز قریب دستیاب ہے۔ خوشی غمی میں سارا خاندان اور پاس پڑوس والے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور نئی آبادیوں میں تو کوئی کسی کو پوچھتا ہی نہیں۔ پڑوسی کو پڑوسی کی خبر نہیں ہوتی۔ ہم اب بھلا اس عمر میں کیسے نئی جگہ جا کر رہ سکتے ہیں۔ تم ایسا کرنا کہ شادی کے بعد جہاں مرضی چلے جانا۔ مگر ہمیں تو اپنی جڑوں سے نہ اکھاڑو۔'' عفیرہ بیگم بے حد جذباتی ہو رہی تھیں۔

''امی پیاری امی میرا مقصد آپ کو دکھی کرنا نہیں تھا۔ دیکھیے نا ان چھوٹی چھوٹی تنگ و تاریک گلیوں میں دن کے وقت بھی اندھیرا ہوتا ہے۔ کل کو میں گاڑی لے لوں گا تو اُسے کہاں کھڑی کروں گا۔ پھر میرے دوست احباب میرے گھر آنا چاہیں گے تو میں انہیں یہاں کیسے لے کر آؤں گا۔ اچھے علاقے میں جائیں گے تو صباحت کا بھی کسی اچھی جگہ رشتہ طے ہو جائے گا۔ اُسے اعلیٰ تعلیم دلائیں گے اور میں آپ سے یہ کب کہہ رہا ہوں کہ آپ اس مکان کو بیچ دیں اور سارے رشتے داروں سے ناطہ ختم کر دیں۔ آپ ان سے ملنے آتی رہا کریں۔ اس مکان میں ابا کی رشتے کی بہن سکینہ پھوپو کو رکھ لیں گے۔ وہ بے چاری جو ایک کمرے کے کرائے کے گھر میں رہ رہی ہیں اس طرح اُن کی مدد بھی ہو جائے گی۔'' عالی نے پیار سے ماں کے گلے میں اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بیٹا مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تم اپنے ابا سے بات کر لو۔ وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ کیونکہ یہاں اُن کے دوست احباب ہیں۔ وہ کبھی یہ گھر نہیں چھوڑیں گے۔'' عفیرہ بیگم نے متفکر لہجے میں کہا۔

''آپ اُن کی فکر نہ کریں۔ انہیں میں منالوں گا۔ آپ بس راضی ہو جائیں۔''

''میں تو اپنے بیٹے کی خوشی میں خوش ہوں۔ جہاں تم ہمیں رکھو گے وہیں رہ لیں گے۔ اگر کل کو تمہاری بیوی نے ہمیں برداشت نہ کیا۔ تو واپس اپنے اسی گھر میں آ جائیں گے۔'' عفیرہ بیگم نے اپنے قدیم مکان کو پیار بھری نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے کہا۔

''بیوی کون ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کو برداشت نہ کرنے والی۔ میں اُن نوجوانوں میں سے نہیں ہوں۔ جو کچھ بن کر سمجھتے ہیں کہ اُن کی ہر چیز کے صرف اُن کے بیوی بچے ہی حق دار ہوتے ہیں اور والدین کو اُن کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے والدین اور بھائی بہنوں کا میری ہر چیز پر اولین حق ہے۔ پہلے وہ پھر کوئی اور......'' عالی نے حتمی لہجے میں کہا۔

''خیر میں تو ایسے ہی عام سی بات کر رہی تھی۔ ورنہ انیلہ بیٹی ایسی نہیں ہے۔ وہ تو بالکل میری صباحت جیسی ہی ہے۔ معصوم سی پیار کرنے والی، خدمت گزار بچی۔'' عفیرہ نے محبتوں سے چور چور لہجے میں کہا۔

''انیلہ کا یہاں کیا ذکر۔'' عالی نے بھنویں

''کیوں اُس کا ذکر کیوں نہیں۔ وہ تمہاری بچپن کی منگیتر ہے۔ خیر سے اُس نے میٹرک کا امتحان بھی دے دیا ہے۔ آج کل میں اُس کا رزلٹ بھی آ جائے گا۔ پھر وہ کالج میں داخلہ لے

لے گی۔ جب تک تم ٹریننگ مکمل کر کے سیٹ نہیں ہو جاتے تب تک وہ بی اے کر لے گی۔ پھر ہم تمہاری شادی کر دیں گے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی...... میں کسی انیلہ وئیلہ سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کہاں میں ایک انجینئر سی ایس پی آفیسر کہاں وہ بیوقوف سی لڑکی...... پورے دس سال چھوٹی ہے وہ مجھ سے۔''

''عالی میرے چندا...... میں نے تو انیلہ کی پیدائش ہی پہ اُس کی ماں سے اُسے مانگ لیا تھا۔ سارا خاندان جانتا ہے کہ انیلہ تمہاری ٹھیکرے کی مانگ ہے۔ شریف گھرانوں میں تو زبان ہی کافی ہوتی ہے۔ جہاں تک عمروں میں دس سال کا تعلق ہے تو یہ کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ لڑکے لڑکی میں اتنا ہی عمر کا فرق ہونا چاہیے۔ تبھی بیوی اپنے خاوند کی عزت کرتی ہے۔ پھر انیلہ میری خالہ زاد بہن کی بیٹی ہے۔ اس قدر خوبصورت ہے شریف ہے دیکھی بھالی بچی ہے اور ہمیں کیا چاہیے۔''

''امی آپ نہیں جانتیں میں جس عہدے پر فائز ہونے جا رہا ہوں۔ وہاں مزید ترقی اور کامیابی کے لیے اونچے اور اعلیٰ عہدوں والوں سے تعلقات اور رشتہ داری ہونا لازمی ہے۔ ورنہ بندہ کہیں کا نہیں رہتا۔ آپ میری شادی کی فکر نہ کریں میں اپنی حیثیت مضبوط کر کے کسی ایسے گھرانے کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدے پر فائز لڑکی سے شادی کروں گا جو میرے ساتھ سوسائٹی میں چل سکے۔ جس کے باپ اور بھائیوں کی سپورٹ سے میں اپنی پوزیشن کو اور بھی زیادہ بہتر کر سکوں۔ انیلہ جیسی لڑکی سے شادی کر کے مجھے کیا ملے گا۔'' عالی نے مضبوط لہجے میں کہا اور پھر اس سے قبل کہ عفیرہ بیگم اُسے کچھ کہتیں۔ وہ کوئی

غزل

دبے ہیں ابھی راکھ میں کچھ شرارے
کوئی تو مقدر ہمارا سنوارے

تمہیں یاد ہے یہ تم ہی نے کہا تھا
بنائیں گے گھر ہم سمندر کنارے

پھولوں کی خوشبو سے مہکا کرے گا
سجائیں گے اُس میں چاند اور تارے

کیا کیا نہ باتیں بنائی تھیں تم نے
محبت کے کیا کیا کیے نہ اشارے

عجب لیکن تم نے کیا یہ تماشا
بھر ڈالے آنکھوں میں آنسو ہمارے

بدلے میں تیری اداؤں کے ہم بھی
بھلا بیٹھے اب قول و اقرار سارے

وہ ہنس ہنس کے تیرا زمانے سے ملنا
ہمیں بھول پاتے نہیں سب نظارے

جو دیتے تھے اُلفت کا جھانسہ سبھی کو
سنا ہے وہ جیتی ہوئی بازی ہارے

جو روٹھ جائیں گے سب دنیا والے
تب کام آئیں گے آنسو ہمارے

ارماں ہے دل میں ملے کوئی ایسا
شگفتہ جو اُلفت سے ہم کو پکارے

(شاعرہ: شگفتہ شفیق)

بہانہ کر کے گھر سے باہر چلا گیا۔

اور پھر وہی ہوا جو عالی چاہتا تھا۔ اگلے مہینے ہی وہ لوگ کینٹ میں شیر پاؤ برج کے پاس خوبصورت سے تین بیڈ روم کے فلیٹ میں شفٹ ہوگئے۔ اگرچہ والدین نے بہت مخالفت کی تھی۔ خاص کر ابا نے تو یہاں تک دھمکی دی تھی کہ وہ اکیلے ہی پرانے والے گھر میں رہ جائیں گے۔ مگر جب عالی نے گھر چھوڑ کر چلے جانے کی دھمکی دی تو پھر ابا کو ماننا ہی پڑا کہ جس بیٹے کو اتنی مشکلوں سے اس مقام تک پہنچایا تھا اُس کو کیسے چھوڑا جاسکتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ عالی سعادت مند تھا۔

یوں بھی کہاں وہ پسماندہ علاقے میں چھوٹا سا بوسیدہ مکان اور کہاں اس قدر خوبصورت صاف ستھرے علاقے میں اس قدر کشادہ فلیٹ۔

عالی نے تو باپ کی ملازمت بھی چھڑوالی تھی۔ اُس کے دو بھائی اور بہن اس فلیٹ میں شفٹ ہوکر بہت خوش تھے۔ صباحت جو میٹرک میں فیل ہوکر کئی سالوں سے گھر میں بیٹھی تھی۔ عالی نے اُسے ایک اکیڈمی میں داخل کروادیا تھا تاکہ وہ میٹرک کی تیاری کرسکے۔ صباحت سے چھوٹا شہاب بی اے میں تھا۔ عالی نے یہ مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی بہن اور بھائی کو نا صرف اعلیٰ تعلیم دلائے گا بلکہ اُن کے بہتر مستقبل کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا۔

عفیرہ بیگم اور عالی کے والد کچھ عرصہ تک تو اپنے پرانے محلے اور گھر کو یاد کر کے پریشان رہے۔ مگر آہستہ آہستہ جدید آسائشوں کے عادی ہوتے چلے گئے۔ البتہ ہفتے عشرے میں اپنے عزیز واقارب سے ملنے پرانے محلے کا چکر لگا لیتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ یہ بھی چھوڑ دیا۔

اب انہیں بھی وہ لوگ اور علاقہ پسماندہ محسوس ہوتا تھا۔ ویسے بھی انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ نئے ماحول اور نئی زندگی سے جلد ہی مانوس ہوجاتا ہے۔ شروع شروع میں اُن لوگوں کے رشتے داروں نے بھی اُن سے ملنے آنا شروع کردیا تھا۔ مگر اُن کے شاندار طرز رہائش کو دیکھ دیکھ کر رفتہ رفتہ وہ احساس کمتری' رشک اور حسد میں مبتلا ہونے لگے اس لیے اُن لوگوں نے آنا جانا تقریباً ترک ہی کردیا۔ البتہ غمی، خوشی میں شریک ہوجاتے اور بس......

عالی کے اصرار پر ابا نے اپنا پرانا مکان بھی بیچ دیا تھا اور اُس رقم کو قومی بچت میں جمع کروادیا تھا جس سے اُن کے ماہانہ اخراجات کافی حد تک پورے ہوجاتے تھے۔ اس طرح عالی پر بھی زیادہ بوجھ نہیں پڑا تھا۔ جیسے ہی شہاب نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ عالی نے اپنے ایک دوست کی مدد سے اس کو سعودی عرب بھجوادیا اور یوں ان کے مالی حالات اور بھی بہتر ہوگئے۔ اس دوران عالی مراد کی ٹریننگ جو وہ سول سروسز اکیڈمی میں کررہا تھا۔ وہ مکمل ہوگئی پھر محکمانہ ٹریننگ کے لیے وہ ایک سال کے لیے کراچی چلا گیا۔ صباحت نے میٹرک پاس کرلیا تھا۔ اور اب وہ کالج میں زیر تعلیم تھی۔

عفیرہ بیگم کو گھر کے کام کاج میں کافی سہولت ہوگئی تھی کیونکہ اوپر کے کام کاج کے لیے عالی نے اُسے ملازمہ رکھوادی تھی۔ اب عفیرہ بیگم کو صرف کھانا ہی بنانا پڑتا تھا۔ گھر کا سودا سلف ابا لے آتے تھے۔ باقی وقت وہ اپنے کمرے میں ٹی وی وغیرہ دیکھ کر اپنا دل بہلا لیتے تھے۔ شام کو گھر سے کچھ فاصلے پر واقع پارک میں چہل قدمی کے لیے چلے جاتے تھے۔ یوں اُن کا وقت بھی اچھی طرح

گزر جاتا تھا۔ اب وہ اپنی گزشتہ غریب و افلاس سے بھری اور محنت مشقت والی زندگی کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔

☆......☆......☆

''سعدیہ آنٹی آپ نے سامیہ آپی کی اتنی جلدی شادی کر دی۔ دلہن بنی تو وہ بالکل ننھی منی سی گڑیا ہی لگ رہی تھی۔ انیلہ نے نہایت مہارت سے ایک خاتون کے بالوں کو 'بوب' شیپ میں تراشتے ہوئے سعدیہ بیگم سے استفسار کیا جو کاؤنٹر کے پیچھے اپنی مخصوص چیئر پر بیٹھی ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔ انیلہ کی بات سُن کر انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

''وہ بس وہاب کو جلدی تھی شادی کی۔ مگر اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُسے میڈیکل کالج میں داخلہ ضرور دلوائے گا۔ ماشاء اللہ بہت خوش ہے میری بیٹی اپنے گھر میں، وہاب اُسے بے حد چاہتا ہے اور بہت خیال رکھتا ہے اُس کا۔'' سعدیہ بیگم نے داماد کی تعریف کرتے ہوئے تنقیدی نظروں سے کلائنٹ خاتون کے بالوں کا جائزہ لیا۔

''واہ بھئی انیلہ تم تو اب بہت ایکسپرٹ ہو گئی ہو اپنے کام میں۔''

''تھینک یو آنٹی جی...... یہ سب آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے مجھے پارلر کا ہر کام نہایت توجہ سے سکھایا ہے۔'' انیلہ نے انکساری سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم جلد ہی مجھے چھوڑ دو گی۔'' سعدیہ بیگم نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

''وہ کیوں بھلا آنٹی۔''

''اس لیے کہ تم نے ہر کام اتنی اچھی طرح سیکھ لیا ہے کہ آرام سے اپنا پارلر کھول سکتی ہو۔''

''ایسی اپنی استطاعت کہاں؟ یوں بھی ابا کو تو میرا یہ پارلر کا کام سرے سے پسند ہی نہیں ہے وہ تو چاہتے ہیں کہ میں کہیں جاب کر لوں۔ تاکہ چار پیسے گھر آئیں۔'' انیلہ نے ایک سرد آہ بھری۔

''ارے ہاں انیلہ بیٹی تمہیں تو میٹرک کیے بھی چھ سات ماہ ہو گئے ہیں تم نے کالج میں داخلہ کیوں نہیں لیا ہے۔ کم از کم بی اے تو تمہیں کرنا چاہیے۔ میٹرک پاس لڑکی کو کہاں اچھی جاب مل سکتی ہے۔'' سعدیہ آنٹی نے معصوم صورت پیاری سی انیلہ کو محبت سے تکتے ہوئے کہا۔

''آنٹی مجھے کون کالج میں داخلہ دلواتا؟ میں نے سوچا تھا کہ کہیں ملازمت کر کے پرائیویٹ ایف اے کا امتحان پاس کر لوں گی۔ مگر اتنے دنوں سے کوشش کر رہی ہوں کہ نوکری مل جائے۔ مگر کہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ محلے میں دو تین پرائیویٹ اسکولوں میں بھی گئی ہوں۔ مگر ہزار پندرہ سو روپوں سے زیادہ تنخواہ نہیں دیتے۔ انیلہ نے واش بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''مگر انیلہ سُنا ہے کہ تمہارے منگیتر عالی نے سی ایس ایس کر لیا ہے۔ کچھ عرصے بعد تمہاری اُس سے شادی ہو جائے گی۔ تمہیں پھر ملازمت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' سعدیہ بیگم نے پوچھا۔

''کہاں کا منگیتر اور کیسی شادی۔ ہم جیسی غریب اور معمولی لڑکیوں کے ایسے نصیب کہاں؟ عالی نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔''

''اوہو یہ تو بہت برا ہوا۔ عفیرہ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم تو عالی کی ٹھیکرے کی مانگ تھیں۔ اتنا پرانا رشتہ بھلا کوئی یوں بھی ختم کرتا ہے۔'' سعدیہ بیگم نے تاسف سے کہا۔

''انیلہ تمہیں کس قسم کی جاب چاہیے؟'' اُس

خاتون نے پوچھا جس کے انیلہ بال سیٹ کر رہی تھی۔

''ارے ہاں منزہ حارث کے تو بہت تعلقات ہیں تمہیں اُسے کہو کہ انیلہ کو کسی دفتر میں اچھی سی جاب دلوا دے۔'' سعدیہ بیگم نے اُس خاتون سے کہا جو دراصل سعدیہ بیگم کے داماد وہاب کے چھوٹے بھائی حارث کی بیوی منزہ تھی۔

''خیر حارث تو کیا جاب دلوائے گا اسے، وہ اصل میں میری ایک دوست کے شوہر کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے۔ شاید وہاں کوئی مناسب جاب ہو۔ میں ابھی فون کرتی ہوں اُسے۔''

یہ کہہ کر منزہ نے اپنے ہینڈ بیگ سے موبائل نکالا اور اپنی دوست کو کال کی۔

''ہیلو فائزہ کیسی ہو؟ ہاں ہاں میں ٹھیک ہوں۔ اللہ کا شکر ہے تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے، اس وقت میں سعدیہ آپا کے پارلر میں ہوں۔ اُن کی کزن کی ایک بیٹی ہے انیلہ...... اُس نے میٹرک کیا ہے۔ اور وہ کوئی مناسب ملازمت کرنا چاہتی ہے۔ اگر سمیر بھائی کی ایجنسی میں کوئی ویکینسی ہو اس کی کوالیفکیشن کے مطابق تو پلیز مجھے ضرور بتانا۔ او کے، خدا حافظ پھر بات کریں گے۔'' یہ کہہ کر منزہ نے کال منقطع کر دی۔

''شکریہ منزہ آپی آپ نے میرے لیے اتنی زحمت کی۔'' انیلہ نے منزہ سے کہا۔

''ارے بھئی اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے۔ ابھی تو میں نے فائزہ سے بات ہی کی ہے۔ اللہ کرے کہ تمہارا کام ہو جائے تو مجھے بہت خوشی ہو گی کیونکہ تم اتنی اچھی اور پیاری سی بچی ہو تمہاری مدد کر کے مجھے اچھا لگے گا۔'' منزہ نے اخلاق سے کہا اور پھر سعدیہ بیگم سے مخاطب ہوئی۔

''اچھا آپا میں چلتی ہوں۔ انشاء اللہ اگلے ہفتے فیشل کے لیے آؤں گی۔ ہو سکتا ہے تب تک انیلہ کی ملازمت کا بدوبست بھی ہو جائے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں تم اتنے خلوص سے کوشش کروں گی تو ضرور ہو گا یہ کام۔'' سعدیہ بیگم نے کہا۔

''سامیہ...... سامیہ ارے میری پیاری سی بیگم صاحبہ کہاں ہیں آپ؟'' وہاب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے کیوں اتنا شور مچا رہے ہیں۔'' سامیہ نے باتھ روم سے باہر آتے ہوئے وہاب کو دیکھ کر ناگواری سے کہا۔

''ارے جان میں کبھی اپنے اس قدر چاہنے والے دیوانے شوہر سے ہنس کر بھی بات کر لیا کرو۔ یہ کیا ہر وقت تیوریاں ہی چڑھائے رکھتی ہو۔'' وہاب نے چونچال لہجے میں کہا۔ مگر سامیہ اُسے نظر انداز کرتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کی جانب بڑھ گئی۔ اور ہیئر برش اُٹھا کر اپنے تراشیدہ بالوں کو سلجھانے لگی۔

''تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں اس قدر خوش کیوں ہوں۔'' وہاب نے سامیہ کے بیزار بیزار سے رویے کے باوجود اُس کے قریب جا کر اُس کے حسین نو عمر سراپے کو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں وارفتگی سے دیکھتے ہوئے والہانہ انداز میں کہا۔

''وہ دراصل میں اپنی فرینڈز کے ساتھ ہائی ٹی پہ جا رہی ہوں۔ آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ آپ آج جلدی آ جائیں گے۔ ورنہ میں پروگرام کینسل کر دیتی۔ خیر اب تو وہ آ رہی ہیں مجھے پک کرنے کے لیے۔ آپ سلیمہ سے کہیے گا۔ وہ آپ کو کھانا دے دے گی۔'' سامیہ نے اپنے

چہرے کو فائنل ٹچ دیتے ہوئے کہا۔

''مگر تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں آج جلدی کیوں آیا ہوں۔'' وہاب نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ اس پر سامیہ نے کچھ کہنے کی بجائے سوالیہ نگاہوں سے وہاب کی طرف دیکھا۔ تو وہ جلدی سے بولا۔

''میں آج فاطمہ جناح میڈیکل کالج گیا تھا۔ وہاں آج منتخب طالبات کی لسٹ لگ گئی ہے اور اُس میں تمہارا نام بھی ہے۔''

''سچ؟'' سامیہ نے خوشی سے مغلوب ہو کر پوچھا۔

''ارے میں تو بھول ہی گئی تھی کہ آج داخلہ لینے والوں کی لسٹ لگنی ہے۔ تھینک یو وہاب آپ نے مجھے بہت بڑی خوشخبری سنائی ہے۔ رات کو ڈنر پر جائیں گے اور اس خوشی کو سیلبریٹ کریں گے۔ ابھی میں جا رہی ہوں۔ او کے گڈ بائے۔ شہلا کی گاڑی کا ہارن بج رہا ہے۔'' یہ کہہ کر سامیہ نے دوپٹہ کندھے پہ پھیلایا اور بیگ اُٹھا کر بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور وہاب تھکے تھکے قدموں سے باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

''واؤ یار آج تو تم غضب ڈھا رہی ہو۔ وہاب بھائی کیا گھر پر نہیں تھے۔ ورنہ تمہیں دیکھتے ہی بے ہوش ہو جاتے۔'' جیسے ہی سامیہ شہلا کی ہنڈا سوک کا دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر اُس کے ساتھ بیٹھی تو صدف نے ستائشی انداز میں کہا۔

''ارے چھوڑو کس کا ذکر کر رہی ہو۔ یہ بتاؤ باقی لوگ کہاں ہیں؟'' سامیہ نے صرف شہلا اور صدف کو دیکھ کر پوچھا۔

''بری بات ہے۔ سامیہ وہاب بھائی تمہارے شوہر ہیں۔ تمہیں اُن کا ذکر اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔'' صدف نے بڑی بوڑھیوں والے انداز میں کہا۔

''ہوں شوہر...... میں اس زبردستی کے رشتے کو نہیں مانتی۔'' سامیہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''تو پھر اُس کے گھر میں کیوں رہ رہی ہو؟'' شہلا نے پوچھا۔

''مجبوری ہے ڈیئر ماں باپ نے زبردستی بے زبان گائے کی طرح اُس کے کھونٹے سے باندھ دیا ہے۔ مگر میں نے اُن کی عزت کی خاطر شادی کا کڑوا گھونٹ تو بھر لیا ہے۔ مگر وہاب کو چاہنا یا پسند کرنا نا میرے بس میں ہے اور نہ ہی میں اس کے لیے کسی کی پابند ہوں۔'' سامیہ نے بے حد تلخ لہجے میں کہا تو صدف اور شہلا حیرت سے اُسے دیکھنے لگیں۔ وہ پہلی والی معصوم سی بات بات پر قہقہے لگانے والی سامیہ تو رہی ہی نا تھی۔ اب تو وہ بے حد بد دماغ اور تلخ ہو چکی تھی اور نئی نویلی دلہن کی طرح اپنے شوہر کے ذکر پر شرمانے کی بجائے اُس کا ذکر ایسے کرتی تھی جیسے کہ کسی انتہائی ناگوار شے کے بارے میں بات کر رہی ہو۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہائی ٹی کے لیے اپنے پسندیدہ ریستوران پہنچ گئیں۔ جیسے ہی ڈرائیور نے گاڑی پارکنگ میں روکی تو اُسی لمحے زویا، حرا اور سفینہ کی گاڑی بھی آ گئی اور یہ چھ سہیلیوں کا ٹولا ہنستا کھلکھلاتا ریستوران میں داخل ہو گیا۔

''ڈیئر فرینڈز خوشخبری......؟'' جب وہ اپنی اپنی پسندیدہ چیزیں اپنی پلیٹوں میں بھر کر ہال میں ٹیبل پر آ کر بیٹھیں تو حرا نے اونچی آواز میں کہا۔ اس پر قریب کی ٹیبلوں پر بیٹھے ہوئے لوگ چونک کر اُن لوگوں کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''آہستہ بولو...... کیا اپنی پھٹے ہوئے ڈھول جیسی آواز میں چلا رہی ہو۔'' شہلا نے حرا کو

ڈانٹا۔

''یار اُسے خوشخبری تو سنانے دو۔'' صدف نے شہلا سے کہا۔

''ارے بھئی میرے پاس بھی ایک خوشخبری ہے۔'' سامیہ نے بھی پُر جوش لہجے میں کہا۔

''تمہارے پاس اب شادی اور شوہر کی باتوں کے علاوہ کیا خوشخبری ہوگی۔'' سفینہ نے منہ بنا کر کہا۔

''شادی اور شوہر کا ذکر اِس کے لیے خوشخبری کا باعث نہیں ہوتا بلکہ ناگوار ہوتا ہے۔ کوئی اور ہی بات ہے۔'' سامیہ کی مزاج آشنا زویا نے کہا۔

''بھئی تم لوگ آپس ہی میں اُلجھتی رہو گی۔ میری بات تو سنو۔'' حرا نے جھنجلا کر کہا۔

''یار یہ چڑیا چوں چوں کیوں کرتی ہیں؟'' اُن کی ٹیبل کے قریب کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے چار پانچ لڑکوں کے گروپ میں سے ایک انتہائی سیاہ فام نوجوان نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے فقرہ کسا۔

''وہ اس لیے کہ کوئے کائیں کائیں کرتے ہیں۔'' سفینہ نے کہا۔ تو وہ لڑکا کھسیا کر چپ ہو گیا۔

''مت منہ لگاؤ ان لوگوں کو۔'' سامیہ نے آہستہ سے حرا سے کہا۔ اور پھر وہ اپنی پلیٹس اُٹھا کر دور کونے والی ٹیبل پر چلی گئیں۔

''چلو بھئی اب تم دونوں اپنی اپنی خوشخبریوں کی پٹاریاں کھولو۔ ایمان سے مارے تجسس کے میں مرنے والی ہوں۔'' سفینہ نے نوڈلز کو اپنے کانٹے میں سمیٹ کر منہ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

''کم کھاؤ پہلے ہی موٹی بھینس ہو رہی ہو۔'' سفینہ کی کزن زویا نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتی ہو۔ مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی ہو۔'' حرا نے اُکتا کر کہا۔

''اچھا...... اچھا لکھو اب۔'' شہلا نے چمچ پلیٹ میں رکھ کر ہمہ تن حرا کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔

''ہاں تو سنو خوشخبری یہ ہے کہ مابدولت کے منگیتر فرہاج اگلے ہفتے اپنا ایم بی اے مکمل کر کے اسٹیٹس سے واپس آ رہے ہیں۔ اور...... اور۔'' اپنی حرا بھی سامیہ کی طرح جلد ہی پیا دیس سدھار جائے گی۔''

''ہیں نا؟'' صدف نے حرا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اور حرا نے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہرے...... واہ بھئی یہ تو زبردست نیوز ہے۔ تو پھر آج کا بل حرا کی طرف سے ہوگا۔'' شہلا نے زور سے نعرہ لگانے والے انداز میں کہا۔ تو سامیہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ شکر ہے کہ آس پاس کی میزیں خالی تھیں۔ اُن کی شرارتی لڑکوں کا ٹولہ بھی جا چکا تھا۔

''نہیں نہیں بھئی...... ابھی میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں پھر کبھی سہی۔'' حرا نے گھبرا کر کہا۔ تو سب نے زوردار قہقہہ بلند کیا۔

''ہاں تو ڈیئر سامیہ جی آپ کی خوشخبری کی اب باری ہے۔ تم نے تو ابھی اپنی شادی کی ٹریٹ بھی نہیں دی۔'' زویا نے خاموش خاموش کھوئی کھوئی سی سامیہ کو مخاطب کیا۔ تو وہ پژمردہ لہجے میں گویا ہوئی۔

''نا...... نا بھئی شادی کی ٹریٹ تو میں ہرگز نا دوں گی۔ کیونکہ اس شادی میں نا میری خوشی شامل ہے۔ نا ہی مرضی، البتہ اب جو نیوز میں تم لوگوں کو سنانے والی ہوں۔ اُس کے لیے جو مرضی اور جیسی

ٹریٹ چاہو گی میں دینے کو تیار ہوں۔''

''اوہو تو یہ بات ہے جلدی سے اپنی گڈ نیوز اگلو تا کہ ہم آئندہ ٹریٹ کے لیے وینیو کو ڈسکس کر سکیں۔'' شہلا نے مصنوعی بے تابی سے کہا۔

''توبہ یہ لڑکی کتنی پیٹو ہے۔ ہر وقت کھانے کے چکر ہی میں رہتی ہے۔'' صدف نے شہلا کو چھیڑا تو جواب میں شہلا نے اُسے مکہ دکھایا۔

''تم لوگ پھر ٹاپک چینج کر رہی ہو سامیہ کو تو بولنے کا موقع دو۔ وہ پہلے ہی آج بہت چپ چپ ہے۔'' زویا نے شہلا اور صدف کو گھورتے ہوئے کہا۔

''سامیہ تم بولو...... یہ لوگ تو لڑاکا بلیوں کی مانند یونہی آپس میں الجھتی رہیں گی۔'' حرا نے سامیہ کو مخاطب کیا۔ اس پر سامیہ نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ اپنے اُداس چہرے پر سجا کر کہا۔

''وہ ...... وہ دراصل میرا میڈیکل میں ایڈمیشن ہو گیا ہے۔''

''او...... زبردست...... اتنی بڑی خوشی کی خبر تم نے اتنی دیر چھپائے رکھی۔ یار اپنی پیاری سی سامیہ ڈاکٹر بننے جا رہی ہے۔ میں تو بس آج ہی سے تمہیں ڈاکٹر کہنا شروع کر رہی ہوں۔'' زویا نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''مگر...... مگر سامیہ کیا وہاب بھائی تمہیں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دیں گے۔'' سفینہ نے متفکر لہجے میں استفسار کیا۔

''ہاں وہ تو شادی سے پہلے ہی بات ہو گئی تھی، اس سلسلے میں......'' سامیہ نے آہستگی سے کہا۔

''چلو بھئی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔ بس اب تم محنت سے تعلیم حاصل کرنا اور اس طرح تمہارا ایک خواب تو پورا ہو جائے گا۔ کیا ہوا جو شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ اللہ نے تمہیں ڈاکٹر بننے کا موقع تو فراہم کر ہی دیا۔

کچھ دیر تک کھانے پینے سے انصاف کرنے اور دل کھول کر اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کے بعد وہ لوگ حرا اور سامیہ سے اگلی ٹریٹ کا وعدہ لے کر ریستوران سے باہر آ گئیں۔ آج وہ سبھی بہت خوش تھیں۔ کیونکہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد اتنے عرصے کے بعد انہیں مل بیٹھنے مزے مزے کے کھانے کھانے اور دل کھول کر باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور وہ ان خوشگوار یادوں کو دلوں میں بسائے اگلی ملاقات تک ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہو گئیں۔

☆......☆......☆

''عالی میرے بچے اب ماشاء اللہ سے تم برسرِ روزگار ہو۔ ٹریننگ کا کیا ہے وہ تو ساتھ ساتھ چلتی رہے گی۔ اب تم شادی کے بارے میں سوچو کیونکہ پہلے ہی تمہاری پڑھائی اور مقابلے کے امتحان کی وجہ سے بہت دیر ہو چکی ہے۔'' عفیرہ بیگم نے لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز عالی کے پاس بیٹھ کر کہا۔

ماں کو دیکھ کر عالی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''نہیں امی فی الحال میرا دو تین سال تک شادی کا کوئی ارادہ نہیں، ابھی تو مجھے اپنے کیریئر کی فکر ہے۔ آپ صباحت کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر اُس کی شادی کر دیں۔'' عالی نے لاپرواہی سے کہا۔

''مگر بیٹا صباحت تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ پھر وہ ایم اے کر کے لیکچرار بننا چاہتی ہے۔'' عفیرہ نے کہا۔

''امی لڑکیوں کے لیے شادی کی یہی عمر

مناسب ہوتی ہے۔ وہ دیکھیے نا آپ کی کزن سعدیہ آنٹی نے سامیہ کی شادی کر بھی دی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ پڑھ بھی رہی ہے۔ صباحت بھی شادی کے بعد اپنی تعلیم مکمل کرے گی۔'' عالی نے ٹی وی آن کرتے ہوئے کہا۔

عفیرہ بیگم سوچوں کے تانے بانے بنتیں کچن میں داخل ہوگئیں شام کے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے......

انیلہ پرانی سی استری کو خوب اچھی طرح گرم کر کے اپنے کپڑے بڑی احتیاط سے استری کر رہی تھی۔ اس کے صبیح چہرے پر خوشی کے تاثرات نمایاں تھے اور وہ ہلکے ہلکے سروں میں کسی پاپولر گیت کو گنگنا رہی تھی۔

''کیا بات ہے انیلہ آپی آج بڑی خوش نظر آ رہی ہیں۔ راحیلہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے جاب مل گئی ہے۔''

''سچ؟ کہاں......؟ کیسے؟'' راحیلہ خوشی سے اچھل پڑی اور انیلہ مسکرا کر اس اسے تفصیل بتانے لگی۔

کئی دنوں بعد اپنی پیاری سی بہن کو مسکراتے دیکھ کر راحیلہ کو بے انتہا خوشی ہوئی۔

راحیلہ نے اُس کی جاب کی خبر سارے گھر میں پھیلا دی تھی۔ ماں اور بھائی بہن تو خوش تھے ہی دادا ابو اور دادی اماں نے بھی مسرت کا اظہار کیا تھا اور اُس کی کامیابی کے لیے دعائیں کی تھیں۔ ابا کو پتہ چلا تو اس نے کہا تھا۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے اچھی طرح کام کرنا اور ساری تنخواہ لا کر مجھے دیا کرنا تاکہ میں تمہاری شادی کے لیے جمع کر سکوں۔''

''صبح مجھے جلدی جگا دینا۔ میں خود تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ وہاں کا ماحول اور لوگوں کو دیکھوں گا تو پھر تمہیں ملازمت کرنے کی اجازت دوں گا۔'' یہ سن کر انیلہ خاموش ہو رہی۔

وہ جانتی تھی کہ ابا اُس سے تنخواہ کے پیسے بھی چھین لیا کرے گا۔ اور اُسے پرائیویٹ طور پر پڑھنے کا موقع بھی نہیں دے گا۔ مگر اُس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ہر صورت میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش کو پورا کرے گی۔ کسی طرح اس جہنم جیسے گھر سے تو کچھ دیر کے لیے ہی سہی نکلنے کا موقع ملے۔

ابا صبح صبح اپنے کسی دوست سے اسکوٹر مانگ کر لے آیا تھا۔ چنانچہ انیلہ نے پارلر سے ملنے والے پیسوں سے خریدا ہوا میرون کلر کا ہلکے ہلکے کام والا سوٹ پہنا۔ سعدیہ آنٹی نے کچھ دن پہلے اُسے ایک خوبصورت سا سیاہ رنگ کا بیگ دیا تھا۔ وہ اُس نے کندھے پر لٹکا لیا۔ سیاہ ہیل والی نازک سی سینڈل اور ہلکے ہلکے میک اپ نے اُس کی معصوم سی شکل کو اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔ وہ دوپٹہ گلے میں ڈال کر کمرے سے باہر نکلی تو ابا ڈیوڑھی میں اسکوٹر اسٹارٹ کر رہا تھا۔

ابا نے اُس کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا اور پھر غصے سے دھاڑا۔

''یہ بن ٹھن کر کس خصم کو دکھانے جا رہی ہے۔ جا کر چادر اوڑھ کر آ...... اور یہ سرخی صاف کر۔'' انیلہ گھبرا کر کمرے میں واپس آ گئی۔ اُس نے غصے میں آ کر منہ دھو ڈالا اور ایک پرانی سی کالے رنگ کی چادر اوڑھ لی۔

''اب ٹھیک ہے نا ابا......'' اُس نے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ہاں ٹھیک ہے، جلدی سے بیٹھ،

مجھے اور بھی کام ہیں۔" صدیق نے کرخت لہجے میں کہا۔

ایجنسی کا دفتر جیل روڈ پر ایک نئے بننے والے پلازہ میں تھا۔ بڑی مشکل سے پتہ لوگوں سے پوچھ پوچھ کر صدیق وہاں پہنچ سکا۔ ریسپشن ہال میں داخل ہوئے تو وہاں سے کسی نے انہیں اوپر کی منزل پر جانے کے لیے کہا۔ نشہ کرنے کی وجہ سے صدیق چالیس سال ہی میں ساٹھ سال کا بوڑھا نظر آتا تھا گہرے خاکی رنگ کے سلوٹوں والے میلے میلے سے شلوار سوٹ میں ملبوس اُلجھے ہوئے کھچڑی بال اور گہرے سانولے کرخت چہرے والا صدیق دیکھنے ہی میں ایک بدمزاج اور غیر مہذب شخص نظر آتا تھا۔ چنانچہ جب وہ من موہنی سی انیلہ کے ساتھ باس کے کمرے میں داخل ہونے لگا۔ تو باہر بیٹھے چپڑاسی نے کہا۔

"پلیز میڈم آپ اکیلی اندر جائیں اپنے ملازم سے کہیے کہ وہ یہاں بیٹھ کر انتظار کرے۔"

یہ سن کر صدیق کا تو دماغ ہی گھوم گیا اور وہ بھنا کر بولا۔

"اُلو کے پٹھے میں تمہیں اس کا ملازم نظر آتا ہوں۔ یہ بیٹی ہے میری اور میں اپنی بیٹی کو کسی غیر شخص کے پاس اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ ہٹو سامنے سے۔" یہ کہہ کر صدیق نے چپڑاسی کو دھکا دے کر ایک طرف ہٹایا اور بدتمیزی سے آفس میں داخل ہو گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ڈری سہمی انیلہ بھی اندر آ گئی۔

وہ ایک شاندار سا دفتر تھا۔ فرش پر گہرے براؤن رنگ کا قالین بچھا تھا۔ کھڑکیوں پر بلائنڈرز تھے۔ کمرے میں ہیٹر کی خوشگوار نرم نرم سی حدت تھی۔ بڑی سی سیاہ آبنوسی ٹیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر ایک باوقار سا ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔

وہ حیرت سے صدیق کو دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو صاحب جی یہ میری بیٹی انیلہ ہے۔ یہاں نوکری کے لیے آئی ہے۔ اسے آپ کی بیگم صاحبہ کی سہیلی نے بھیجا ہے۔ میں اندر آنے لگا تو آپ کے اس بدتمیز چپڑاسی نے مجھے کہا کہ میں اندر نہیں آ سکتا کیونکہ میں اس بچی کا ملازم ہوں۔ کیسے بدتمیز ملازم آپ نے رکھے ہیں یہاں۔ جو باپ کو بیٹی کا ملازم سمجھتے ہیں۔" صدیق نے اپنے ساتھ ہی اندر آنے والے چپڑاسی کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے آبنوسی میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کیا۔

"آئی ایم سوری دراصل یہ نیا بندہ ہے نا اسے ابھی زیادہ اس دفتر کے معاملات کا علم نہیں ہے۔ آپ تشریف رکھیے۔ بیٹا آپ بھی بیٹھیے۔" پھر انہوں نے چپڑاسی سے کہا۔

"شریف جاؤ تم باہر اور اچھی سی چائے اور بسکٹ بھجوا دو۔"

دل ہی دل میں وہ انتہائی خوف زدہ تھی۔ جو سین صدیق نے کیریٹ کیا تھا۔ اُس کے بعد اُسے قطعی امید نہیں تھی کہ اُسے یہاں ملازمت مل سکے گی۔ البتہ وہ منزہ آپی کی دوست کے شوہر میر عابد صاحب کے اس قدر مہذب رویے پر حیران تھی۔ ورنہ تو وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اُن لوگوں کو دھکے دے کر اپنے آفس سے نکال باہر کریں گے۔ مگر اس کے برعکس انہوں نے نا صرف انہیں بڑے تپاک سے بیٹھنے کو کہا تھا بلکہ چائے بسکٹ بھی منگوائے تھے۔ شاید منزہ آپی کی وجہ سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ انیلہ نے سوچا۔

"ہاں تو بیٹا آپ کی کوالیفیکیشن؟" عابد صاحب نے شفیق لہجے میں انیلہ کو مخاطب کیا تو وہ

چونک پڑی۔

''جی...... جی وہ میں نے پچھلے سال میٹرک کا امتحان سائنس سبجیکٹس کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔'' انیلہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''گڈ...... پہلے کہیں جاب کی ہے؟''

''نہیں سر...... ویسے میں تقریباً ایک سال سے اپنی ایک آنٹی کے پارلر میں کام سیکھ رہی ہوں اور وہ مجھے کچھ سیلری بھی دے دیتی ہیں۔''

''ہوں...... ٹھیک، یہاں پر آپ کو بحیثیت ٹیلی فون آپریٹر کے رکھا جائے گا۔ دو ماہ کی ٹریننگ ہے اگر آپ نے کام اچھی طرح سیکھ لیا تو آپ کی باقاعدہ اپائنمنٹ کردی جائے گی۔''

''ٹریننگ تنخواہ کے بغیر ہوگی کیا؟'' انیلہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بھئی...... آپ کو تین ہزار روپے تنخواہ دی جائے گی اور ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد پانچ ہزار روپے سیلری ہوگی۔ اگر آپ کو منظور ہے تو باہر ریسپشن سے اپائنمنٹ فارم لے کر فل کردیں اور کل سے کام شروع کردیں۔''

''جی بہت بہت شکریہ سر۔'' انیلہ نے خوشی سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ اسی دوران چپڑاسی چائے لے کر آ گیا۔ صدیق نے فاتحانہ انداز میں چپڑاسی کی طرف دیکھا اور وہ نظریں چراتا ہوا باہر چلا گیا۔ اور صدیق پرچ میں چائے ڈال کر اس میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھانے لگا اور ساتھ ہی انتہائی بدتہذیبی کے ساتھ سڑک سڑک کر چائے پینے لگا اور انیلہ باپ کے اس غیر مہذب انداز پر دل ہی دل میں شرم سے پانی پانی ہورہی تھی۔ اُس نے کن انکھیوں سے عابد صاحب کی طرف دیکھا مگر وہ لاپرواہی سے ایک فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔

چائے سے بھرپور طریقے سے انصاف کر کے اور بسکٹوں کی ساری پلیٹ ہڑپ کر کے صدیق نے کھڑے ہو کر اپنا سیاہ کھردرا ہاتھ عابد صاحب کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے اپنی چیئر سے تھوڑا سا اُٹھ کر گرمجوشی سے صدیق سے ہاتھ ملایا۔ تو انیلہ نے قدرے سکون محسوس کیا۔ وہ عابد صاحب کے اس قدر اچھے رویے پر حیران سی تھی۔ وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر آفس سے باہر آ گئی اور نیچے آ کر ریسپشن سے فارم لیا۔ تھوڑے فاصلے پر پڑے صوفے پر بیٹھ کر فارم پُر کیا۔

اور اُس کے ساتھ اپنی میٹرک کی سند کی فوٹو کاپی لگا کر ریسپشن پر دے دیا۔ اس دوران صدیق چپ چاپ صوفے کے ایک کونے پر بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہ باپ کے قدرے بہتر موڈ پر حیران ہورہی تھی۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اُس نے آج ابھی تک ایک بھی سگریٹ نہیں پی تھی ورنہ تو اتنی دیر میں وہ ڈھیروں سگریٹیں پھونک ڈالتا تھا اور یہ راز آفس سے باہر آ کر کھلا۔

جب اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے صدیق بڑبڑایا۔

''اسکوٹر میں پٹرول ڈلوالیا۔ تو پیسے بچے ہی نہیں، اُس اُلو کی پٹھی صغراں سے میں نے کتنا کہا تھا کہ پندرہ بیس روپے زیادہ دے دو۔ میرے سگریٹ ختم ہورہے ہیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی اور اتنی دیر سے سگریٹ نا پینے کی وجہ سے میرا دماغ گھوم رہا ہے۔ جلدی سے بیٹھو تا کہ میں تمہیں گھر چھوڑ کر سگریٹوں کے لیے پیسوں کا بندوبست کروں۔''

☆......☆......☆

سامیہ کی میڈیکل کالج میں کلاسز شروع ہوچکی تھیں۔ اُس کی فرینڈز میں سے کسی نے بھی اُس کے ساتھ داخلہ نہیں لیا تھا۔ نمبر ہی صرف حرا کے داخلے کے قابل آئے تھے۔ اُسے اُس کے منگیتر فرہاج نے داخلہ لینے سے منع کر دیا تھا۔ باقی دوستوں میں سے صدف اور شہلا نے بی بی اے میں ایڈمیشن لے لیا تھا جبکہ زویا اور سفینہ نیشنل کالج آف آرٹس میں چلی گئی تھیں اور اپنی برسوں کی سہیلیوں کے بغیر شروع شروع میں اُس کا کالج میں ذرا بھی دل نہیں لگا تھا۔ باقی زیادہ تر لڑکیاں آپس ہی میں ایک دوسرے کی دوست تھیں۔ اس لیے سامیہ کو کسی نے بھی کوئی خاص لفٹ نہیں کروائی۔ مگر پھر جلد ہی اُس کی طرح کی دو اور لڑکیاں آ گئیں۔

ایک ماہ رخ تھی وہ پنڈی سے آئی تھی جبکہ دوسری گلناز پشاور کی رہنے والی تھی۔ وہ دونوں بھی خود کو اکیلا اکیلا اور الگ تھلگ محسوس کر رہی تھیں۔

اس لیے جب انہوں نے سامیہ کو ہر جگہ اکیلی گھومتے پھرتے دیکھا تو وہ اُس کی طرف متوجہ ہوگئیں اور پھر جلد ہی ان تینوں کی گہری دوستی ہوگئی اور وہ ہر جگہ ساتھ ساتھ ہی نظر آنے لگیں۔ چونکہ تینوں ہی محنتی اور ذہین تھیں۔

اس لیے کلاس میں ان کی کارکردگی بھی بے حد نمایاں تھی۔ لیکچر کے دوران ٹیچرز سے سوال کرنا اُن کے سوالات کا جواب دینا۔ کوئی ٹیسٹ ہو یا اسائنمنٹ ہر ایک میں یہ تینوں ہی ٹاپ پہ ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے بہت جلد سب کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔

جلد ہی اُن کا گروپ بڑھ گیا اور جتنی بھی محنتی اور پڑھا کو ٹائپ لڑکیاں تھیں سبھی ان لوگوں کی دوست بن گئیں مگر دوستی کے باوجود پہلی پوزیشن کے لیے ہمیشہ ان کا آپس میں مقابلہ ہوتا رہتا تھا۔ سامیہ کالج آ کر بھول ہی جاتی تھی کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اور ناپسندیدہ ترین شخص کی بیوی ہے۔ جس سے سیدھی طرح بات کرنا بھی اُسے گوارا نہیں تھا۔ مگر مجبوراً وہ یہ کڑوا گھونٹ پینے پر مجبور تھی۔ اُس کی فرینڈز کو بھی جب علم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے تو وہ بے حد حیران ہوئی تھیں۔ مگر جب سامیہ نے انہیں اپنی مجبوری بتائی تو سبھی اُس کے لیے قدرے پریشان ہوگئی تھیں مگر سامیہ نے اس بات کو زندگی کی ایک تلخ حقیقت سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔

وہ گھر میں جتنی لیے دیے اور چپ چاپ رہتی تھی کالج آ کر اتنی ہی شوخ و چنچل اور خوش باش ہوتی تھی۔ وہ فرینڈز کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کرتی تھی۔ اور ہنستی بولتی بھی تھی۔ اکثر ہفتے میں ایک بار وہ سب آؤٹنگ کے لیے بھی چلی جاتی تھیں کبھی کہیں کھانا کھانے کے لیے یا پھر یونہی لانگ ڈرائیو پر، وہاب سے اُس کی ملاقات رات کے کھانے پر ہی ہوتی تھی۔

باقی گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔ کبھی کبھی وہاب کے والدین اور بہنیں کچھ دنوں کے لیے رہنے کے لیے آ جاتے تھے۔ وہ اُن کے ساتھ بڑے تپاک سے پیش آتی تھی۔

اُن کے آرام اور کھانے پینے کا خیال رکھنے کے لیے نوکروں کو خاص ہدایات دیتی تھی۔ تاکہ وہ کسی قسم کی کوفت اور اجنبیت محسوس نا کریں کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس میں وہاب کے گھر والوں کا تو کوئی قصور نہیں یہ تو اُس کے والدین نے زبردستی اُسے اس جہنم میں جھونکا تھا۔

(جاری ہے)

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

رسولؐ نے فرمایا

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:
''بہت سے پراگندہ، غبار آلود اشخاص جنہیں دروازوں سے دھکیل دیا جاتا ہے، اگر اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ اُن کی قسم پوری فرما دیتا ہے۔''

حضرت عیسیٰؑ کے اقوال

☆......دنیا کے مال و اسباب پر مغرور مت ہو۔

☆......جو اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کہا جائے گا اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کہا جائے گا۔

☆......مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے سبب ستائے گئے کیونکہ بالآخر آسمانوں کی بادشاہی انہی کی ہے۔

ناصرہ۔ناروے

خاموش پیغام

ایک دفعہ جنگل میں چیتے اور گدھے کی بحث ہوئی۔ چیتے نے کہا آسمان کا رنگ نیلا ہے اور گدھے نے کہا کالا۔ چیتے نے کہا چلو جنگل کے بادشاہ شیر کے پاس چلتے ہیں دونوں شیر کے پاس گئے اور واقعہ بیان کیا۔ شیر نے کہا چیتے کو جیل میں ڈال دو چیتے نے احتجاج کیا۔

''بادشاہ سلامت بات بھی میری ٹھیک ہے اور جیل بھی مجھے جانا پڑ رہا ہے۔'' بادشاہ نے کہا۔

''بات سچ اور جھوٹ کی نہیں تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے ایک گدھے سے بحث کیوں کی۔''

رازِ عدن۔بحرین

ملال بھی نہیں

تو میرا حوصلہ تو دیکھ
داد تو دے مجھے کہ اب
شوق کمال بھی نہیں
خوف زوال بھی نہیں
میں بھی بہت عجیب ہوں
اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا
اور ملال بھی نہیں

پروین شروانی۔کراچی

لاجواب

ایک بار ایک چینی تاجر سے ملاقات ہوئی اُس نے کہا۔ ''پاکستانی بھی بڑے عجیب لوگ ہیں پاکستانی تاجر میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خریدی جانے والی سستی اشیاء پر بڑی کمپنیوں اور برانڈ کے لیبل چسپاں کر دو۔ مگر جب میں انہیں کھانے پر بلاتا

ہوں تو معذرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کا کھانا حلال نہیں تو کیا دھوکے سے مال بیچنا اُن کے لیے حلال ہے؟'' اور میں اب تک خاموش ہوں۔

افشاں۔U.K

پیاری بیٹی

ایک باپ نے بیٹی سے پوچھا۔

''یہ بتاؤ تم کس کو زیادہ چاہتی ہو مجھے یا اپنے شوہر کو؟'' بیٹی نے جواب دیا۔

''پتہ نہیں مگر جب میں آپ کو دیکھتی ہوں تو اُس کو بھول جاتی ہوں اور جب اُس کو دیکھتی ہوں تب آپ بہت یاد آتے ہیں۔''

غزالہ رشید۔کراچی

دل

دل وہ مشین ہے جو برسا برس بنا رکے کام کرتی ہے بنا کسی آرام کے تو اُس کو خوش رکھنا چاہیے یہ آپ کا ہو یا کسی اور کا......

شگفتہ شفیق۔کراچی

ڈھانچہ

استاد نے بچے سے پوچھا۔''بتاؤ ڈھانچہ کسے کہتے ہیں؟''

بچہ......''جناب اس شخص کو جو Dieting تو شروع کرتا ہے مگر اُس کو چھوڑنا بھول جاتا ہے

شاہ زین۔اٹک

میں کیوں بھاگوں

ایک دفعہ دو پٹھان جنگل سے گزر رہے تھے اچانک سامنے سے شیر آ گیا اور لگا دھاڑنے، ایک خان صاحب نے تیزی سے جھک کر مٹھی اٹھائی اور شیر کی آنکھوں میں پھینک دی اور بھاگ کھڑا ہوا مگر دوسرا پٹھان ٹس سے مس بھی نہ ہوا۔ پہلے نے چیخ کر پوچھا۔

''تم کیوں نہیں بھاگ رہے؟'' خان صاحب بولے۔

''میں کیوں بھاگوں مٹی تو تم نے پھینکی ہے۔''

رمشا۔کوئٹہ

ایمان کیا ہے؟

کسی نے عالم سے پوچھا بتائیں ایمان کیا ہے؟

عالم نے فرمایا:''خوف اور ایمان کے توازن کو ایمان کہتے ہیں یعنی اللہ کے عذاب پر یقین اور رحمت سے مایوس نہ ہونا۔''

سارہ۔مردان

باتوں سے خوشبو آئے

علم جیسی کوئی دولت نہیں اور جہالت جیسی کوئی غربت نہیں۔

حالات انسان کو نہیں بلکہ انسان حالات کو بناتا ہے۔

اگر تم حالات سے خوف زدہ نہیں تو تم زندہ ہو اور اگر خوف زدہ ہو تو مردہ۔

جاہلوں کی صحبت سے دور رہو ورنہ وہ بھی تمہیں اپنے جیسا بنا لیں گے۔

آدمی آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ زنجیروں میں ہے۔

کنزا۔لاہور

سچ

ایک صاحب بہت دیر سے دکان پر کھڑے 'مبارک باد' کا کارڈ تلاش کر رہے تھے تاکہ شادی کی سالگرہ پر بیگم کو دے سکیں۔ لیکن جب وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکے تو سیلز مین کے پاس گئے اور بولے۔

''مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے مجھے کوئی ایسا کارڈ تلاش کر دیں جس کے مضمون پر میری بیگم اعتبار کر لیں۔''

رؤف علی۔کہروڑ پکا

کراچی کے نام

کشتی ہے مگر ہم میں کوئی نوح نہیں
آیا ہوا طوفان خدا جانے کدھر جائے
سر پر جو بدلیاں تھیں، ہواؤں میں اُڑ گئیں
اب سر پر آسماں تو ہے، شانوں پر سر کہاں

صالح رحیم۔ گجرات

قیمت

گاہک: ''اس ٹائی کی کیا قیمت ہے؟''
دکاندار: ''چالیس روپے۔''
گاہک: ''ارے بھائی اتنے میں تو جوتے کا جوڑا آجاتا ہے۔''
دکاندار: ''مگر جناب آپ جوتے گلے میں تو نہیں باندھ سکتے۔''

زمرد۔ کراچی

سوال

ایک ڈاکٹر اپنی مریضہ کا ذہن اس کے شروع ہونے والے آپریشن سے ہٹانے کے لیے مہنگائی پر گفتگو کر رہا تھا وہ بتا رہا تھا کہ اُس کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اور بیٹا میڈیکل کالج میں پڑھ رہا ہے۔ جس کی فیس بہت زیادہ ہے۔ آخر میں چلتے چلتے اُس نے مریضہ سے کہا۔

''آپ سے کل آپریشن تھیٹر میں ملاقات ہوگی۔ آپ کوئی سوال پوچھنا چاہتی ہیں؟''

''میں کس چیز کے پیسے دے رہی ہوں شادی کے یا ٹیوشن کے؟''

طاہر حسین۔ فیصل آباد

جاسوسی

بیوی نے چپکے سے شوہر کا سیل فون اٹھایا پاس ورڈ لگا کر فون بک چیک کرنا شروع کی تو دیکھا۔ لڑکیوں کے نمبر مختلف ناموں سے محفوظ ہیں۔ جیسے پڑوسن کی بچی، نئی بچی، پرانی بچی، سامنے والی بچی، کالج والی بچی، پاگل کی بچی اور اس کے آگے بیوی کا نمبر محفوظ تھا۔

فرزانہ فضل۔ شاہدرہ

غالب

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

سعدیہ سیٹھی۔ U.K

مہنگی ترین شے

کائنات کی سب سے مہنگی شے احساس ہے جو دنیا کے ہر انسان کے پاس نہیں ہوتی۔

زویا خان۔ کراچی

تلاش

مجھے زندگی پر قدم قدم پر، تیری رضا کی تلاش ہے
تیرے عشق میں اے میرے اللہ مجھے انتہا کی تلاش ہے
میں گناہوں میں ہوں ڈوبا ہوا، میں زمین پر ہوں گرا ہوا
جو مجھے گناہوں سے نجات دے مجھے اس دعا کی تلاش ہے
میں نے جو کیا وہ برا کیا، میں نے خود کو خود ہی تباہ کیا
جو تجھے پسند ہو اے میرے اللہ، مجھے اس ادا کی تلاش ہے
(آمین ثم آمین)

رضوانہ سعید۔ سمندری

لاجواب

زینب نے شبانہ سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا

کہ تم نے کیا سوچ کر ان صاحب سے شادی کا فیصلہ کیا ہے وہ تو تمہارے مقابلے میں بڑی عمر کے ہیں۔ ان کے منہ میں دانت تک نہیں اور وہ گنجے ہیں۔''

''یہ تو کوئی عیب کی بات نہیں۔'' شبانہ نے بے پروائی سے کہا۔

''وہ تو پیدائش کے وقت بھی ایسے ہی تھے۔''

فضا۔ کشمور

ایک شعر

قلم ہے ہاتھوں میں خنجر کی کیا ضرورت ہے
پڑھا لکھا ہوں سلیقے سے قتل کرتا ہوں

ثمرہ شاہد۔ بورے والا

دھوکا

طلاق کے مقدمے میں جج نے عورت کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''اپنے شوہر سے بے وفائی کرتے ہوئے شرم نہ آئی۔ بولو تم نے اپنے شوہر کو دھوکا کیوں دیا۔''

معصوم عورت بولی۔

''جج صاحب دھوکا میں نے نہیں انہوں نے مجھے دیا ہے۔ کہا تھا تین دن کے بعد آؤں گا اور یہ اسی رات واپس آگئے۔''

رضا خان۔ کراچی

ایک شعر

اس شہر نامراد پہ ٹوٹا یہ کیا وبال
اب آدمی کو دیکھ کر ڈرتا ہے آدمی

طاہرہ نفیس۔ چکوال

آپریشن

نئے نئے دولت مند ہونے والے صاحب کی بیگم ایک سرجن کے پاس پہنچی اور بولیں۔

''ڈاکٹر صاحب میرا آپریشن کر دیں۔'' سرجن نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مگر کس چیز کا آپریشن؟'' خاتون نے لاپرواہی سے کہا۔

''کسی بھی چیز کا دراصل میرا آپریشن نہیں ہوا اور بیگمات کے درمیان بیٹھ کر بات چیت کرنے میں مشکل پیش آتی ہے اور احساس کمتری سا ہونے لگتا ہے۔

رفعت۔ جہانیاں

خوش قسمت

ایک صاحب نے اپنی محبوبہ سے کہا۔

''تمہارا ایک لفظ مجھے دنیا کا خوش قسمت ترین انسان بنا سکتا ہے۔ بتاؤ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

محبوبہ: ''نہیں۔''

صاحب: ''یہی وہ لفظ تھا، تمہارا بہت شکریہ۔''

ظل ہما۔ لاہور

شروعات

بیوی شوہر سے: ''آپ بہت بھولے ہیں جی، کوئی بھی آپ کو بے وقوف بنا سکتا ہے۔''

شوہر: ''ٹھیک کہا تم نے اور شروعات تمہارے ابا نے کی۔''

شاہد زمان۔ کوہاٹ

علاج

ایک ڈاکٹر فخر سے دوسرے ڈاکٹر کو بتا رہے تھے۔

''آخر کار میں نے مسز کمال کے لڑکے کا علاج کر ہی دیا۔ تمام ڈاکٹروں نے تو جواب دے دیا تھا۔''

''کیا بیماری تھی اسے؟'' دوسرے ڈاکٹر نے پوچھا۔

''وہ دانتوں سے ناخن کترتا تھا۔ میں نے اسے ڈینٹسٹ کے پاس بھیج کر اس کے تمام دانت نکلوا دیئے۔''

شایان، ایشا۔ کراچی

نئے لہجے نئی آوازیں

سہمی سہمی محبت

امید دوستی تھی، یقین پاس تھا
خواہشوں کا جھولا لیے، اعتبار کے رنگ تھے
آنکھوں میں خوشی لیے
وہ منزل کی جانب رواں دواں تھی
ہواؤں کے سنگ تھی
اعتبار کے رنگ سے رنگوں کو بکھیرتی
امنگوں کے پھولوں سے ہواؤں کو معطر کرتی
اونچی اڑان اڑتی، شوقِ منزل لیے
ہواؤں کے دوش پر اعتماد کے پر لگائے
دور سے نظر آتی اونچی سی پہاڑی کو دیکھتی
خواہشوں کے جھولے کو تیزی سے اڑاتی
پہاڑی سے قریب تر تھی
اچانک ہواؤں نے شور اٹھایا
کالے پرندوں کی یلغار تھی
وہ خوف سے پریشان تھی
خواہشوں کے جھولے کو بچاتی وہ افسردہ سی
پرندوں کے دھکوں سے وہ پہاڑی سے گرتی
زمین پر آرکی، آنسوؤں کو پونچھتی
احباب کو افسردگی سے دیکھتی
غیروں کے سہارے پر اٹھتی
سیاہ پرندوں سے چھپتی چھپاتی
وہ سہمی سہمی سی بیٹھی خواہشوں کے جھولے میں

شاعرہ: فرح انیس۔ کراچی

الوداع ایدھی صاحب

آہ! عبدالستار ایدھی
الوداع......الوداع
سادگی کا پیکر
سنت رسول کا شیدائی
عالم انسانیت کا فرزند
بوڑھے، بچے، یتیم ضرورت مند
سب کا حامی ومددگار
بے سہاروں کا سہارا
عبدالستار ایدھی الوداع......الوداع
آج اَن گنت گھر ہوئے بے سہارا
آج ہزاروں افراد ہوئے یتیم
ملک وقوم کی شان ہم سب کا مان
الوداع، الوداع عبدالستار......الوداع
ایک روشن ستارہ ڈوب گیا
اللہ کے دربار میں آپ کو
اعلیٰ مقام کا اعزاز ملے
رسول پاک کی زیارت نصیب ہو
جن اعزازات کے ساتھ
آپ کو آخری سفر پر رخصت کیا
ان ہی اعزازات کے ساتھ
آپ کو اللہ کے حضور حاضری نصیب ہو، آمین

شاعرہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

غزل

محبت زندگی کا استعارا ہے
زندگی کی جانب اشارا ہے
بجھی لکڑیوں کے اندر بھی
انگڑائی لیتا اِک شرارا ہے
اتنی طاقت کہاں ہر جان میں

ہم سہہ گئے یہ حوصلہ ہمارا ہے
تیرا سرد لہجہ اور نشتر نگاہیں
سو جاناں! یہ وار بہت کارا ہے
چھوڑو تم بھلے، ہم برے سہی
ہم جانتے ہیں بہت ہمیں گوارا ہے
عجب سے سلسلے ہیں مات کے
جو عشق میں جیتا، وہی ہارا ہے
چاہتے ہیں ہم بس خوش رہے تُو
یہ خسارے کا سودا سراسر ہمارا ہے
شاعرہ: فصیحہ آصف خان۔ ملتان

مصیبت، تکلف، الم، درد، غم
کبھی وقت ایسا گزارا نہ تھا
پلٹ کر کسے دیکھتے راہ میں
کہیں سے کسی نے پکارا نہ تھا
عجب جنگ عامر تھی احباب میں
کسی نے بھی میدان مارا نہ تھا
شاعر: عامر ثانی۔ کراچی

وہ

کسی تنہائی نے اُس میں مجھے بویا ہوگا
بچھڑ کے مجھ سے بھی کوئی کہیں رویا ہوگا
سپنے آنکھوں کے بھی اُس کے کئی ٹوٹے ہوں گے
وہ میری یاد میں بھی مدتوں کھویا ہوگا
توڑ کر دل، خفا ہو کے جو گئی ہوں گی
شاید کچھ وہ کسی سے بھی نہ گویا ہوگا!
بارہا اُس نے تصور میں اپنی سوچوں کو
میری چاہت کے رنگوں میں بھی بھگویا ہوگا!
نیند تو بھول چلی رستہ میری آنکھوں کا
فراق میں کہیں وہ بھی نہیں سویا ہوگا!
جو میری ذات کا ادراک دے گیا ہے یقین
وہ درد اس کے بھی سینے میں سمویا ہوگا
شاعرہ: خولہ عرفان۔ کراچی

تم ہو مرے

خیال و خواب وفاؤں کے جگنو ہو گئے ہیں
تمہاری یاد میں جتنے تھے رہبر سو گئے ہیں
مری امید کے تم آخری ستارے تھے
تمہیں تو بھول گئیں پیار کی سبھی باتیں
مری نگاہ کے سارے گلاب رو گئے ہیں
مرے حضور! کچھ ایسا تو اہتمام کرو
وفا میں پھر سے مہکنے لگیں، سویرے ہوں
میں سب سے ہنس کے کہوں، تم ہو مرے، تم ہو مرے
خیال و خواب کے سب جگنو مرے ہو جائیں
محبتوں کے سارے خواب امر ہو جائیں
شاعرہ: شازلی سعید مغل۔ کراچی

محبت

محبت کو جاننے والے، جانتے ہیں
محبت سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں
محبت کرنے والے سے بڑا
کوئی گنہ گار نہیں
محبت جیت ہے، محبت مات ہے
محبت ہر دل کے لیے سوغات ہے
محبت کے ہرے پرچم کو لیے
محبت کرنے والا فاتح ٹھہرا
سب جانتے ہیں، محبت کو سب مانتے ہیں
شاعر: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

غزل

نظارے کے قابل نظارا نہ تھا
رُتوں نے لبادہ اُتارا نہ تھا
کسی نے کہاں گھر بنانے دیا
چمن پر بھی کیا حق ہمارا نہ تھا

مِنی اسکرین

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

ناظرین اور قارئین گرامی ہم آپ کے مشکور ہیں کہ آپ نے ARY ڈیجیٹل نیٹ ورک پر آن ایئر ہونے والے ڈرامے سیریل سوپ دیکھنے کے بعد ہمیشہ ہماری حوصلہ افزائی کی ہے اور یہ آپ کے دیے ہوئے حوصلے ہیں کہ ہمارے کام میں دن بہ دن خوبصورتی کا عنصر شامل ہوتا جارہا ہے اور ناظرین اور قارئین یہ آپ کی دی ہوئی محبتیں ہیں جن سے ہمارے حوصلے اور امنگ اُجاگر ہوتی ہے۔ ARY ڈیجیٹل نیٹ ورک کا کوئی بھی حصہ ہو ہمیں حوصلہ افزائی کے جملے سننے کو ضرور ملتے ہیں۔ رمضان کے پروگراموں میں شان رمضان' کیوٹی وی کی لائیو تراویح' بچوں کے چینل نک' دی میوزک اور HBO کے پروگراموں کو ناظرین نے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جس کے لیے ہم اپنے ناظرین اور قارئین کے مشکور ہیں آپ سلامت رہیں۔ قارئین گرامی اب چلتے ہیں ARY ڈیجیٹل کے خوبصورت پروگراموں کی طرف سیریل 'نعمت' کی کہانی ایک لڑکی سارا کی طرف گھومتی ہے جو اس سیریل کا مرکزی کردار ادا کر رہی ہے۔ سارا اپنی والدہ کے انتقال کے بعد اپنی خالہ کے گھر رہتی ہے وہ بہت زیادہ حساس طبیعت کی لڑکی ہے۔ خالہ کا لڑکا بابر اُسے پسند کرتا ہے اور سارا بھی اُس کی محبت میں گرفتار ہے۔ سارا کی خالہ اس بات کو محسوس کر لیتی ہیں اور وہ خود بھی چاہتی ہیں کہ سارا اُن کی بہو بن جائے اور یوں سارا کی شادی بابر سے ہو جاتی ہے۔ بابر بہت اچھا شوہر ثابت ہوتا ہے۔ وہ ہر ایونٹ کو

ARY ڈیجیٹل کی سیریل
'تیری چاہ میں' ماریہ واسطی اور فرحان

ARY ڈیجیٹل کی سیریل
'نعمت' میں سنیتا مارشل اور زاہد احمد

بہت انجوائے کرتے ہیں۔ بابر سارا کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ پھران دونوں کی خوشیوں کو زمانے کی نظر لگ جاتی ہے۔ جب سارا کے ہاں بلال کی پیدائش ہوتی ہے جب بابر اور سارا کو پتہ لگتا ہے کہ ان کے بچے بلال کے دل میں سوراخ ہے جس کا علاج فی الوقت نہیں ہوسکتا اور اس کے علاج کے لیے انہیں دس سال انتظار کرنا پڑے گا۔اس خبر کے بعد سارا کی ساری توجہ محبت بلال تک محدود ہوکر رہ جاتی ہے۔اور وہ بلال کی وجہ سے بابر کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتی ہے۔یہیں سے سیریل 'نعمت' ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ سارا کے بابر کو

ARY ڈیجیٹل کی
سیریل 'تم ملے' میں سحرا فضل

ARY ڈیجیٹل کی سیریل
'آپ کے لیے' میں ثمینہ پیرزادہ

نظر انداز کرنے کی وجہ سے بابر کی زندگی میں زارا داخل ہوتی ہے۔ سارا کے بیٹے بلال کا ڈاکٹر اسد علاج کررہا ہے۔ زارا بضد ہے کہ بابر اُس سے شادی کرلے اب بابر کے لیے ایک امتحان ہے زارا چاہتی ہے کہ بابر اُس سے شادی کر کے باہر شفٹ ہوجائے۔ مگر وہ بلال کی وجہ سے باہر نہیں جانا چاہتا زارا اصرار کرتی ہے بابر سے کہ وہ سارا کو طلاق دے پھر وہ اس سے شادی کرے گی۔ اِدھر ڈاکٹر اسد سارا میں دلچسپی لینے لگتا ہے کیونکہ سارا کا بیٹا بلال ڈاکٹر اسد کے دلی طور پر بہت قریب ہوجاتا ہے۔ مگر سارا کے بیٹے کے بلال کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر اسد سارا سے شادی کرنا چاہتا ہے کیا زارا سارا کو طلاق دلوانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر اسد سارا سے شادی کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے کیا سارا کا بیٹا بلال زندہ رہتا ہے ان سب سوالوں کا جواب تو سیریل 'نعمت' دیکھنے کے بعد ہی مل سکتا ہے۔ سیریل کے ہدایت کار عبداللہ باوانی جبکہ اسے تحریر کیا ہے نائلہ انصاری نے اس سیریل کے فنکاروں میں سنیتا مارشل، زاہد احمد' ثمینہ احمد' کرن حق' سیمی پاشا اور شہود علوی قابل ذکر ہیں۔ سیریل 'نعمت' ہر پیر کی رات 8 بجے ARY ڈیجیٹل سے دیکھائی جارہی ہے۔ سیریل 'تیری چاہ میں' یہ کہانی ہے ایک نہایت حساس اور نا قابلِ تسلیم رشتے کی جو محبت رنگ و نسل اور عمر اور رشتوں کی سرحدوں سے بالاتر جن میں آپ ہر قسط کو نئے زاویے سے دیکھ

پائیں گے اس سیریل میں رشتوں رنگ و نسل پر خوبصورتی سے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سیریل کے نمایاں فنکاروں میں شامل ہیں۔ ماریہ واسطی، فرحان سعید، سلمان شاہد، صبور علی، فریال محمد، عصمت اقبال، عاصم اظہر اور شکیل قابل ذکر ہیں۔ سیریل 'تیری چاہ میں' کو تحریر کیا ہے ثمینہ اعجاز نے جبکہ ہدایت عابس رضا کی ہیں۔ سیریل 'تیری چاہ میں' ARY ڈیجیٹل سے ہر بدھ کی رات 8 بجے دکھائی جارہی ہے۔ نئی کہانیوں کی برسات میں شامل ہونے

معاشرے کا مطالعہ بہت خوبصورتی سے کرتی ہے اور ہر قسم کی خوشیاں اور حالات سے نمٹنا جانتی ہے۔ یہ سیریل اپنی مثال آپ ہے اس سیریل کو تحریر کیا ہے عظمیٰ افتخار نے جبکہ ہدایت احمد بھٹی کی ہیں۔ اس سیریل کے فنکاروں میں افعان وحید، سحر افضل، وسیم عباس، ماہ میر، علی عباس، شیم ہلالی، ہما نواب، بدر خلیل، عثمان پیرزادہ اور یسمیٰ پاشا قابل ذکر ہیں۔ یہ سیریل ARY ڈیجیٹل سے ہر پیر کی رات 9 بجے دیکھائی جائے گی۔ آیئے قارئین اب چلتے ہیں سیریل

ARY ڈیجیٹل کی سیریل 'گھائل' میں سنبل اقبال اور اسد صدیقی

جارہی ہے۔ ایک اور دل کو چھو لینے والی کہانی یعنی کے سیریل 'آپ کے لیے' یہ کہانی ہے محبت سے ہارے دو ایسے لوگوں کی جن کے ساتھ دوبارہ جینے کی امید پیدا ہوگی لیکن کیا پرانی محبت کو بھلانا اتنا آسان ہوگا۔ جتنا لوگ سمجھتے ہیں اس سیریل کی ہدایت بدر محمود، جبکہ تحریر فائزہ افتخار کی ہے۔ اس سیریل میں جن فنکاروں نے کام کیا۔ اُن میں ثمینہ پیرزادہ، فضل قریشی، اریج فاطمہ، وسیم عباس، سلمہ حسن، غنا علی، سیفی حسن اور اسد صدیقی قابل ذکر ہیں۔ سیریل 'آپ کے لیے' ہر منگل کی رات 9 بجے ARY ڈیجیٹل سے دیکھائی جارہی ہے۔ سیریل 'تم ملے' یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو معاشرے میں رہ کر

گھائل، کی جس کے ہدایت کار فرقان ٹی صدیقی جبکہ اسے تحریر کیا ہے شگفتہ بھٹی اس سیریل میں دو سینئر فنکاروں نے لاجواب اداکاری کر کے ناظرین اور قارئین کو سوچ میں ڈال دیا ہے کہ انہوں نے سیریل میں کمال کی اداکاری کر کے ثابت کر دیا کہ طلعت حسین اور عابد علی واقعی بڑے فنکار ہیں جبکہ اس کے نمایاں فنکاروں میں سنبل اقبال، گوہر ممتاز، اسد صدیقی، کرن تعبیر، فرح شاہ اور حمیرا اظہر قابل ذکر ہیں اس سیریل میں حمیرا اظہر نے بھی اپنے سینئر ہونے کا احساس دلا دیا ہے۔ سیریل 'گھائل' ہر جمعرات کی رات 8 بجے ARY ڈیجیٹل سے دیکھائی جارہی ہے۔

☆☆......☆☆

”چٹ پٹی خبریں“

ڈی ما خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

قندیل بلوچ

صرف پچیس سال میں اس لڑکی نے بے پناہ شہرت حاصل کی قطع نظر کہ شہرت اچھی تھی یا بری......

سلمان خان نے بگ باس کے لیے قندیل کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ قندیل شہرت کی بھوکی تھی وہ شہرت حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی لہٰذا موت کو بھی وہ شہرت ملی کہ لوگ برسوں یاد رکھیں گے۔

امجد صابری

امجد صابری ایک جاگتی آواز جو ہمیشہ کے لیے سلا دی گئی۔ صرف پاکستان میں ہی نہیں دنیا بھر میں

ان کے چاہنے والے آج بھی اُن کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ یقیناً یہ ہمارا بہت بڑا نقصان ہے اس دکھ دینے والی خبر کے بعد ایک اچھی خبر یہ بھی ہے کہ صابری صاحب کا قاتل پکڑا گیا ہے اب ہماری پولیس قاتل کو قرار واقعی سزا دلوا دے تو یہ امجد صاحؒ کے چاہنے

والوں پر احسان ہوگا۔

فواد خان

فواد خان اور کترینہ کیف بہت جلد کرن جوہر کی فلم میں نظر آئیں گے۔ ذرائع بتاتے ہیں کہ یہ فلم

مکمل رومینٹک فلم ہوگی۔ فواد خان آج کل بالی وڈ کی تمام ہیروئنوں کے دل کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں۔ ہر نوخیز ہیروئن صرف فواد خان کے ساتھ ہی کام کرنا چاہتی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ فواد خان اس طرح کامیابی کی منزلیں طے کرتے رہیں۔

نعمان حبیب

ڈرامہ انڈسٹری کا ایک اور روشن ستارہ جس نے بہت کم وقت میں اپنی محنت سے پاکستانی ڈرامہ انڈسٹری میں منفرد مقام بنالیا ہے۔ پچھلے دنوں اپنی کزن کو منگنی کی انگوٹھی پہنا چکے ہیں۔ منگنی کی اس تقریب میں رشتے داروں اور قریبی دوستوں نے شرکت کی۔ نعمان نے اپنے کیریئر کی ابتدا 'یہ ہے زندگی' جو جیو سے نشر ہوا اس سے کی۔ ایک فلم 'میں ہوں شاہد آفریدی' بھی کی۔ ہم

نعمان کو نئی زندگی کی شروعات پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ایکٹران LAW

عیدالاضحیٰ پر پیش کی جائے گی پاکستانی فلم

ایکٹران لا جس کی کاسٹ میں شامل ہیں۔ فہد مصطفیٰ، مہوش حیات، اوم پوری، سلیم معراج، علی خان اور دیگر، یہ کامیڈی فلم ڈائریکٹ کی ہے سنبل قریشی نے اور تحریر کی ہے فضا علی مرزا نے۔ ہلکی پھلکی مزاحیہ فلم ایک وکیل کے گرد گھومتی ہے جیسا کا نام سے بھی ظاہر ہے اور وکالت کے دوران کیا کیا حربے آزمانے پڑتے ہیں، کہیں جیتنے کے لیے اس بارے میں ہلکے پھلکے انداز میں بتایا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ ایک اچھی کامیڈی فلم ہوگی۔

ثانیہ مرزا

پچھلے دنوں ٹینس اسٹار ثانیہ مرزا کی سوانح حیات کی لانچنگ کی تقریب ہوئی جس میں مہمان

خصوصی شاہ رخ خان تھے۔ Ace Against Odds ایک منفرد کتاب ہے جس میں بہت کچھ بتانا ابھی باقی ہے۔ جیسے ثانیہ ماں کب تک بن جائیں گی وہ دبئی میں رہیں گی یا کہیں اور...... بھارتی صحافی کے پوچھنے پر کہ ثانیہ کب تک اپنی زندگی میں سیٹل ہوں گی۔ ثانیہ نے بہت خوبصورت جواب دیا اور کہا عورت زندگی میں کتنی کامیاب ہوجائے کتنے ایوارڈز جیت لے اس کو آپ لوگ اس وقت تک سیٹل نہیں مانتے جب تک وہ گھر نہ بیٹھ جائے یہ سوال آپ مرد ایتھلیٹ سے کبھی نہیں کریں گے جس پر صحافی نے ثانیہ سے معافی مانگی۔

ریما خان

سنا ہے ریما خان اور ڈاکٹر طارق مہتاب میں طلاق ہوگئی ہے۔ ذرائع بتاتے ہیں کہ یہ بات
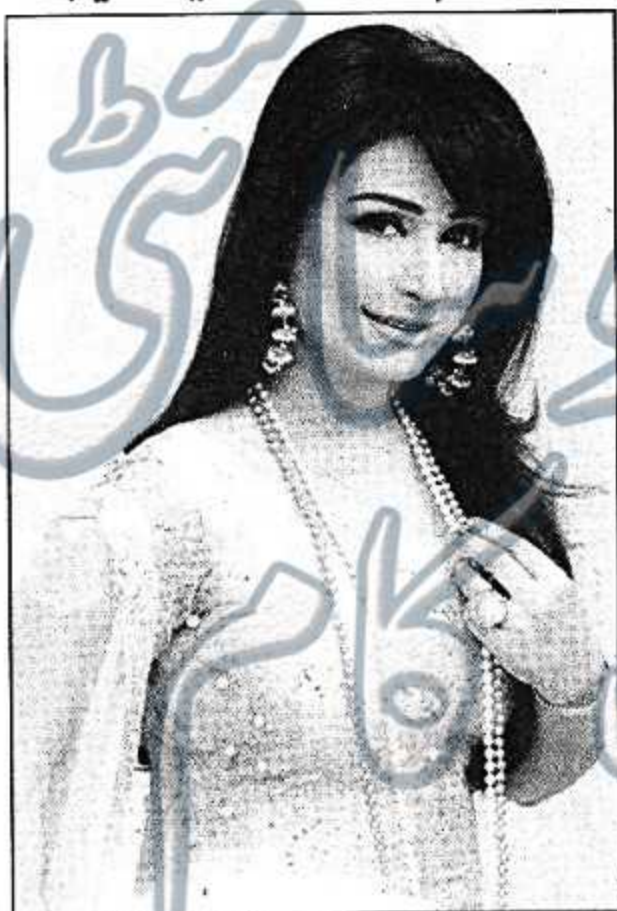
ڈاکٹر صاحب نے پہلے ہی واضح کردی تھی کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اس بندھن میں بندھیں گے۔ بدلے میں ریما خان نے بے حساب دولت اپنے نام لکھوالی ہے۔ اس لیے وہ اپنے شوہر کے گھر سے زیادہ اب پاکستانی مارننگ شوز 'رمضان شوز' عید شوز' اور ایوارڈز کی تقریبات میں نظر آتی ہیں۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

ثابت مونگ کی دال

اجزاء

ثابت مونگ کی دال	آدھا کپ
تیل	دو کھانے کے چمچ
تیز پتہ	ایک عدد
زیرہ	آدھا چائے کا چمچ
پیاز	ایک عدد (درمیانی سائز کا)
ٹماٹر	ایک عدد
ادرک لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
نمک	حسبِ ضرورت
ہری مرچ	دو عدد (چاپ کرلیں)
تیل (تڑکا لگانے کے لیے)	ایک کھانے کا چمچ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچ
ہینگ	ایک چٹکی
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ

ترکیب:
مونگ کی دال کو بھگودیں۔ پیاز، ٹماٹر اور دو عدد ہری مرچوں کو چاپ کرلیں۔ ایک دیگچی میں دو کھانے کے چمچ تیل ڈال کر اس میں تیز پتہ اور زیرہ ڈال دیں۔ جب فرائی ہونے لگے تو چاپ کیا ہوا پیاز ڈال دیں۔ جب پیاز گلابی ہونے لگے تو اس میں ادرک لہسن پیسٹ اور چاپ ہری مرچیں شامل کردیں۔ جب اچھی طرح فرائی ہوجائے تو اس میں کٹے ہوئے ٹماٹر، ہلدی، سرخ مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر اور گرم مسالا پاؤڈر شامل کردیں۔ جب ٹماٹر گل جائیں تو اس میں مونگ کی دال شامل کردیں۔ ساتھ ہی ڈھائی سے تین کپ پانی ڈال دیں۔ حسب ذائقہ نمک بھی شامل کردیں اور ہلکی آنچ میں ڈھکن ڈھک کر پکائیں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو دال بھی گل جائے تو تھوڑا سا پانی اور شامل کردیں اور چمچ سے کچھ دال کے دانوں کو میش کرلیں، اس طرح دال گاڑھی سی محسوس ہوگی۔ تڑکا لگانے کے لیے ایک کھانے کا چمچ تیل فرائنگ پیل میں ڈالیں۔ اب اس میں زیرہ ڈالیں، پھر آنچ بند کرکے ہینگ اور سرخ مرچ پاؤڈر ڈالیں اور اسے تیار کی ہوئی دال پر ڈال دیں، آخر میں چاہیں تو ہرا دھنیے سے گارنش کریں۔

مکس ویجی ٹیبل سوپ

اجزاء

گاجر (درمیانی سائز کی)	دو عدد (کاٹ لیں)

بند گوبھی	ایک عدد
بٹن مشرومز	آدھا کپ
ہری پیاز	دو عدد (چاپ کرلیں)
تیل	حسبِ ضرورت
پیاز	ایک چوتھائی کپ (چاپ کی ہوئی)
لہسن	ایک چائے کا چمچ
پانی	تین کپ
سویا سوس	دو چائے کا چمچ
نمک	حسبِ ضرورت
کالی مرچ پاؤڈر	حسبِ ضرورت

ترکیب:

ایک دیگچی میں ایک کھانے کا چمچ تیل ڈال کر اس میں پیاز اور لہسن شامل کردیں۔ جب پیاز گلابی ہونے لگے تو اس میں مکس ویجی ٹیبل ڈال دیں۔ پانچ سے چھ منٹ تک فرائی کریں۔ جب سبزیاں فرائی ہوجائیں تو اس میں پانی شامل کردیں، ساتھ ہی سویا سوس ڈالیں۔ نمک اور کالی مرچ بھی حسبِ ذائقہ شامل کرلیں اور اسے ہلکی آنچ میں دس سے بارہ منٹ تک پکائیں۔ اس کے بعد ڈھکن ہٹا کر پہلے نمک، مرچ چیک کرلیں۔ اگر کم لگ رہا ہو تو دوبارہ ڈال دیں۔ سردیوں میں گرما گرم سوپ نوش فرمائیں۔

بٹر پنیر مسالہ

اجزاء

پنیر	250 گرام
پیاز	2 عدد
ادرک لہسن کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچ
کشمیری مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ
ٹماٹر	3 عدد
کاجو کا پیسٹ	3 کھانے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
قصوری میتھی	ایک چائے کا چمچ
گرم مسالہ اور نمک	حسبِ ضرورت
مکھن	3 کھانے کے چمچ
فریش کریم	2 کھانے کے چمچ

ترکیب:

فرائنگ پین میں 2 کھانے کے چمچ مکھن ڈال کر اس میں پیاز کا پیسٹ ڈال دیں، جب وہ گولڈن ہوجائے تو اس میں لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال دیں، 3 منٹ تک پکائیں، سرخ مرچ پاؤڈر ڈال کر مکس کریں، پھر ساتھ ہی کاجو کا پیسٹ ڈال دیں۔ اس کے بعد ٹماٹر پیوری ملائیں، قصوری میتھی، دھنیا پاؤڈر، ہلدی، گرم مسالہ اور نمک ڈال کر 5 منٹ تک پکائیں، پھر پنیر شامل کردیں اور 5 منٹ تک مزید پکائیں۔ پانی کا ایک چھوٹا کپ ڈال دیں اور 10 منٹ تک پکنے دیں، چولہے سے ہٹا کر اس میں بچا ہوا مکھن اور کریم ڈالیں۔ ہرا دھنیا سے گارنش کریں، بٹر پنیر مسالہ تیار ہے۔

ملکی بیسن برفی

اجزاء

بیسن	ایک کپ
کھوپرا (پسا ہوا)	ایک کپ
دودھ	ایک کپ
گھی	ایک کپ
چینی	دو کھانے کے چمچے
الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ

ترکیب:

ایک ٹرے کو گھی یا تیل سے گریس کرلیں۔ اس کے اوپر فوائل یا بٹر پیپر بھی لگا سکتے ہیں۔ گریس کی

ہوئی ٹرے کو الگ رکھ دیں۔ ایک کڑاہی میں گھی ڈالیں اور اسے گرم ہونے دیں، پھر اسے ایک باؤل میں نکال لیں۔ اب اس کڑاہی میں بیسن ڈالیں اور اسے بھونیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو اس میں کھوپرا ڈال دیں۔ کھوپرا ڈالنے کے بعد اسے 2 سے 3 منٹ تک بھونیں۔ یاد رہے کہ بھوننے کے دوران آنچ ہلکی ہونی چاہیے۔ اب اس میں چینی، دودھ اور تھوڑا سا گھی اور ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اس دوران آنچ درمیانی ہونی چاہیے۔ اب اس میں بلبلے سے اٹھنے لگیں تو الائچی پاؤڈر ڈال دیں اور مکسچر میں چمچ چلاتی رہیں، اب دوبارہ باؤل میں موجود گھی کو اس مکسچر میں ڈالیں اور مکس کر لیں۔ یوں ایک کپ گھی آہستہ آہستہ کر کے اس مکسچر میں ڈالنا ہے۔ جب مکسچر گاڑھا ہو جائے تو اسے گریس کی ہوئی ٹرے میں نکال لیں اور اسے پھیلا دیں۔ پھر چھری کو گریس کر کے اس کے چھوٹے پیس کاٹ لیں۔ اگر چاہیں تو اوپر کھوپرا، بادام اور پستے چھڑک دیں۔

فرنچ ٹوسٹ

اجزاء

انڈا	ایک عدد
بریڈ سلائسز	3 عدد
دودھ	تین کھانے کے چمچے
نمک	ایک چٹکی
دار چینی پاؤڈر	2 چٹکی یا آدھا چائے کا چمچہ
چینی	دو چائے کے چمچے
مکھن	حسب ضرورت

ترکیب:

سب سے پہلے ایک فرائنگ پین میں بریڈ سلائسز کو گرم کر لیں۔ ایک پیالے میں ایک عدد انڈا، چینی، نمک اور دودھ اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب اس میں دار چینی پاؤڈر ڈالیں اور پھر اچھی طرح بیٹ کریں، یہاں تک کہ ساری چیزیں یکجان ہو جائیں۔ اب فرائی پین میں مکھن ڈالیں۔ بریڈ سلائس کو ایک ایک کر کے پیالے میں تیار مکسچر میں ڈپ کریں۔ دونوں طرف سے اچھی طرح ڈپ کریں اور پھر فرائی پین میں ڈال کر تل لیں۔ جب ایک طرف سے براؤن ہو جائے تو پلٹ دیں۔ اسی طرح تینوں سلائسز تیار کر لیں۔ سرو کرتے وقت پسی ہوئی چینی چھڑک دیں۔

لیمن چکن

اجزاء	میرینیٹ کرنے کے لیے
چکن	آدھا کلو (بغیر ہڈی)
تیل	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	ڈیڑھ سے دو کھانے کے چمچے
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

میرینیٹ کرنے کے لیے بنائے جانے والے اجزا کو چکن پر لگا کر ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ اگر آپ رات بھر میرینیٹ کرنا چاہتی ہیں تو پھر اسے فریج میں رکھیں۔ ایک فرائی پین کو تیل ڈال کر گرم کریں۔ اب اس میں چاپ کیے ہوئے ادرک لہسن کو ڈالیں۔ جب لہسن براؤن ہونے لگے تو چاپ کی ہوئی پیاز ڈالیں۔ ساتھ ہی میرینیٹ کی ہوئی چکن، ہری مرچ، سویا سوس، گرم مسالا، لیموں، چینی اور نمک بھی ڈال دیں۔ ان تمام چیزوں کو پیاز کے گلابی ہونے تک فرائی کریں۔ چکن گل جائے تو پودینہ کے پتے چاپ کر کے ڈال دیں۔ تیار ہونے پر فرائڈ رائس یا نوڈلز کے ساتھ سرو کریں۔

☆☆......☆☆